U32620

Title - MURAQQA SUKHAN; HYDERABAD KE PACHCHEES MUMTAZ SHORAY URDU ASIFIYA KA BA TASVEER TAZKIRA.

Creator - Sayyed Mohi uddin Qadri Zor.

Publisher - Azam Steam Press (Hyderabad).

Date - 1935

Pages - 392

Subject - Tazkira Shora - Hyderabad; Hyderabad - Tazkira Shora.

مرقعِ سخن

حیدرآباد دکن کے پچیس ۲۵ شعرائے دورِ آصفیہ

یعنی

سراج

درگاہ ـ شیدا

تجلی ـ ایمان ـ چندا

قیس ـ شاداں ـ فیض ـ تمیز

باقی ـ عصر ـ فیاض ـ ناجی ـ مائل

توفیق ـ کیفی ـ شاد ـ عزیز

رسا ـ مسرور ـ صغیر

امجد ـ سعید

صفی

کے

سوانحِ زندگی ـ نمونۂ کلام ـ اور تصاویر

اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

کے پچیس سالہ عہد فرمانروائی کے جشن سیمیں

کی تقریب میں "سلسلۂ ادبیات اردو" کی ناچیز نذر عقیدت

مرقع سخن

حیدرآباد کے پچیس ممتاز شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ

مدیر عمومی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس۔ چارمینار حیدرآباد دکن

۱۹۳۵ء

سلسلۂ ادبیاتِ اردو

مؤسسین

مولوی محمد عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی	استاذ تاریخ جامعہ عثمانیہ
مولوی محمد عبد القادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی	استاذ اردو " "
مولوی محمد عبد القادر صاحب صدیقی ایم۔ اے	استاذ شعبۂ دینیات " "
مولوی محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل	مددگار دفتر دیوانی ومال وملکی وغیرہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے، پی ایچ ڈی (لندن)	مدیر عمومی سلسلہ

مطبوعات

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری	از	مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے سابق صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ
یوسف ہندی قید فرنگ میں	"	مولوی محسن بن شبیر صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)
ہوش کے ناخن	"	مولوی میر حسن صاحب ومولوی مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے
ٹیگور اور ان کی شاعری	"	مولوی مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے سابق معتمد بزم اردو

زیر طبع یا زیر ترتیب کتابیں

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	از	مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے ومولوی میر زاہد علی صاحب کامل بی۔ اے
عربی ادب کی مختصر تاریخ	"	مولوی سید ابو الفضل صاحب بی۔ اے
دکن میں مرثیہ نگاری	"	مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔ اے۔ سابق صدر بزم اردو
شمس الامراء کی اردو خدمات	"	نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی۔ اے سابق صدر بزم اردو
فن سوانح نگاری	"	مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے سابق صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ
سروجنی نائیڈو کی شاعری	"	مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی۔ اے صدر بزم اردو
شاخ نبات (اردو کی طربیہ شاعری)	"	مولوی مرزا سرفراز علی صاحب سابق مدیر المؤسی ومجلہ عثمانیہ
ولی اورنگ آبادی	"	مولوی میر عابد علی خاں صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

فہرست مندرجات

تقریب

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن)
مدیر عمومی سلسلۂ ادبیات اردو

پہلا دور (۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک)

صفحات ۱ تا ۵۶

تمہید

دوسرا دور (۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک)

صفحات ۵۵ تا ۱۳۰

تمہید

تیسرا دور (۱۲۲۵ھ سے ۱۳۰۰ھ تک)

صفحات ۱۳۱ تا ۲۲۸

تمہید

چوتھا دور (۱۳۰۰ھ سے ۱۳۳۰ھ تک)

پانچواں دور (۱۳۳۰ھ سے ۱۳۵۴ھ تک)

تمہید

تصاویرِ شعرائے معاصرین دورِ پنجم

آصفی، معین، عالی، صفی، ذہین، آزاد، شہید، لمعہ، عابد، راشد، جذب، اصغر

اشاریہ

فہرست تصاویر مرقع سخن

اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ



سلطان العلوم اعلحضرت نواب سر میر عثمان علی خان بهادر

تقریب

اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے عہدِ میمنت مہد میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں حیدرآباد میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اردو زبان اور علم و ادب کی جو قابل قدر خدمتیں انجام دی گئی ہیں ان میں اپنی محدود وسائل کے مطابق "سلسلۂ ادبیات اردو" نے بھی حصہ لیا ہے۔ اسکو قائم ہوئے یہ چوتھا سال ہے۔ اس اثنا میں وہ چار کتابیں شائع کرچکا ہے اور متعدد کتابوں کے مسودات بغرض طباعت تیار ہیں۔ اس نے نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اہل ذوق اسکے مساعی سے بخوبی واقف ہیں اور ملک و بیرون ملک کے رسائل و اخبارات اسکے مطبوعات پر ہمت افزا تبصرے لکھتے رہے ہیں۔

چونکہ یہ "سلسلہ" محض دورِ عثمانی کے برکات کا ایک ادنے مظہر ہے اسلئے اعلیحضرت سلطان العلوم کے جشن سیمیں کے بہجت افزا موقع پر ضروری تھا کہ یہ بھی نذر عقیدت پیش کرے۔ اعلیحضرت بندگان عالی کا ذوق ادب اور شعر و سخن سے شغف محتاج بیان نہیں ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس آپ کی علم نوازی کی ایک لازوال مثال ہے۔ مہمات مملکت کے ساتھ ساتھ آپ بہ نفس نفیس سخنوروں کی اور علم پروری میں بھی شایان شان دلچسپی لیتے ہیں۔ آپکا فارسی اور اردو کلام صحیح معنوں میں ملک الکلام ہے۔ اردو شعر و سخن کی تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ زریں حروف میں چمکتا رہیگا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر "سلسلۂ ادبیات اردو" حیدرآباد کے ممتاز شعرائے آصفیہ کا باتصویر تذکرہ "مرقع سخن" مرتب کرکے اعلیحضرت کے پچیس سالہ دور حکمرانی و سخن پروری کے جشن سیمیں میں حصہ لے رہا ہے۔

اس باتصویر تذکرہ "مرقع سخن" میں اعلیحضرت سلطان العلوم کی پچیس سالہ جوبلی کی مناسبت سے حیدرآباد کے پچیس ہی اردو شاعروں کے حالات معہ نمونہ کلام مندرج ہیں۔ سلاطین آصفیہ کے زیر سایہ گذشتہ سوا دو سو سال کی مدت میں سیکڑوں بلند پایہ شعرا

حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور سینکڑوں ہی بیرون ملک سے ان علم پرور فرمانرواؤں اور انکے سخن دوست امرا کی سرپرستی شعر و سخن سے مستفید ہونے کی خاطر حیدرآباد آئے۔ ان سب کے حالات اور کلام پر ایک ہی جگہ تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے اس موقع پر صرف پچیس شاعروں سے متعلق یہ پہلی قسط پیش کی جارہی ہے۔ اگر اسکی کماحقہٗ قدر کی گئی تو منقاقب اسکے دوسرے حصص بھی منظر عام پر آسکیں گے جن میں حیدرآبادی شعرا کے علاوہ شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام بھی درج ہوگا جنہیں قدردانی کی شہرت حیدرآباد لے آئی اور جو یہیں کے ہورہے۔ اس طرح دکن کی اردو شاعری کی ایک مکمل تاریخ اور یہاں کے باکمال شاعروں کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہوجائیگا۔

حیدرآباد کی اردو شاعری فطرتی طور پر دو جداجدا حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ پہلا حصہ عہد قطب شاہیہ کی شعری پیداوار پر مشتمل ہے اور دوسرے میں عہد آصف جاہیہ کے گنجینہ ہائے شعر و سخن شامل ہیں۔ پہلے حصہ کی نسبت اس وقت تک متعدد کتابوں (مثلاً اردوئے قدیم، اردو شہ پارے، محبوب الزمن، دکن میں اردو، یورپ میں دکنی مخطوطات، اور جواہر سخن وغیرہ) میں تفصیلی معلومات مدرج ہیں۔ ان میں اول الذکر دو کتابیں تو قطب شاہی اردو شعر و شاعری کی ایک حد تک مکمل تاریخیں ہیں لیکن صرف عہد آصفیہ سے متعلق کوئی ایسی مبسوط کتاب موجود نہیں ہے جو محض اس عہد کی اردو شعر و شاعری کی مکمل و مبسوط تاریخ سمجھی جاسکے۔ اگرچہ متذکرہ کتابوں اور متفرق رسائل میں اس زمانہ کے اکثر شاعروں کے حالات اور کلام کے چند نمونے شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی عہد آصفیہ کے شعر و سخن کی مکمل تاریخ نہیں۔

عہد آصفیہ کی اردو شاعری گوناگوں خصوصیات اور زبان و خیال کے مختلف رجحانات کے اعتبار سے پانچ جداگانہ ادوار پر منقسم ہوتی ہے۔ پہلا دور سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک قرار پاتا ہے۔ اس دور کے پچاس سے زیادہ اردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جن میں اکثر اورنگ آبادی ہیں لیکن جب ۱۱۸۲ھ میں حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالحکومت قرار پایا علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہوگئیں۔ اس دور کے متعدد شعرا اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثروں کے اردو دواوین، مثنویوں، مرثیوں اور قصیدوں وغیرہ کے مجموعے اسوقت بھی موجود ہیں۔ ان سب پر اجمالی طور پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کیلئے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے اس لئے اس حصہ میں اس دور کے چار شاعروں کے حالات اور انکے

کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

عہد آصفیہ میں اُردو شاعری کا **دوسرا دور** سنہ ۱۲ھ سے ۱۲۲۵ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی (۱۲۱۸ھ) اور نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث (۱۲۴۴ھ) کے علاوہ وزرائے سلطنت ارسطو جاہ (۱۲۱۹ھ) اور میر عالم (۱۲۳۳ھ) نے حیدرآباد میں شعر و سخن کی خاص سرپرستی کی ہے جس کا شہرہ سُن کر اس دور میں اقصائے ہندوستان سے اردو شاعروں کی دکن میں آمد شروع ہوئی۔ خود حیدرآباد میں اس وقت متعدد باکمال شعرائے اُردو موجود تھے جن میں سے چار کا تفصیلی ذکر اس مرقع میں موجود ہے۔

تیسرے دور (۱۲۲۵ھ سے سنہ ۱۳ھ تک) میں نواب سکندر جاہ کے علاوہ نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع (۱۲۷۳ھ) اور نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس (۱۲۸۵ھ) اور ان کے وزرا و امراء مثلاً مہاراجہ چندو لال شاداں (۱۲۶۱ھ) اور نواب فخر الدین خاں شمس الامراء (۱۲۷۹ھ) اور ان کے فرزندوں کی بے نظیر سرپرستیوں نے حیدرآباد کو اُردو ادب کا مرکز بنا دیا۔ یہ دراصل فیض (۱۲۸۳ھ) اور اُن کے تلامذہ کا عہد تھا۔ اس دور سے متعلق اس مرقع میں چھ شاعروں کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہیں۔

اس وقت حیدرآباد میں متعدد ایسے باکمال شعرا موجود تھے جو یہاں کی قدردانی سخن سے مستفید ہونے کیلئے دور دراز مقامات سے آتے رہے اور جن میں سے بعض تو یہیں رہ گئے اور حیدرآباد ہی کو اپنا وطن قرار دے لیا۔ یہ پچھتر سال اُردو شاعری کے عہد زرین سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ اسی زمانہ میں دکن کے علاوہ شمالی ہند میں بھی متعدد اعلیٰ پایہ اساتذہ سخن موجود تھے۔

چوتھا دور سنہ ۱۳ھ سے سنہ ۱۳۳ھ تک قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ دور بھی عہد ماضی کے مانند نہایت درخشاں رہا۔ نواب محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (۱۳۲۹ھ) ادب نواز اور شعر و سخن کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر تھے۔ یوں تو شمالی ہند کے شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہوچکا تھا اس دور میں اور بھی اُس میں اضافہ ہوا۔ اس باہمی میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر پڑا۔ سب کا رجحان صحیح شاعری کی طرف تھا۔ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا اور متفقہ طور پر

اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ رہی۔ رفتہ رفتہ متروکات کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی اور اسلوب بیان بھی بدل گیا۔ اس مرقع میں اس دور کے چھ شاعروں پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے علاوہ متعدد معاصر شعراء کی تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں۔

پانچواں دور (۱۳۲۰ھ سے ۱۳۵۴ھ تک) درحقیقت دکن کی اردو سرپرستی کا تابناک عہد ہے حضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خود بلند پایہ شاعر اور قدر دان سخن ہیں ولیعہد سلطنت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر اعظم اور شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر شجیع کے علاوہ دوسرے شہزادگان والاتبار کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی ہے۔ امرائے عظام میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت شاد، نواب حسام الملک خانخاناں آصفی، نواب معین الدولہ معین اور نواب لطف الدولہ لطف کو بھی شعر و شاعری کا خاص ذوق رہا ہے۔ اس وقت حیدرآباد میں سیکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن اس مرقع میں پانچ شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام درج ہے نیز ان شاعروں کے نام اور تصویریں بھی شریک ہیں جنھوں نے اپنی عمر کے چالیس سال ختم کرکے دنیائے شاعری میں شہرت حاصل کرلی ہے۔

متذکرہ پانچ ادوار کو ملحوظ رکھ کر اس مرقع کو مرتب کیا گیا ہے۔ ہر دور ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے جس میں اسی زمانہ کے قدر دانان سخن کے نام، شاعری کی خصوصیات، اور مشہور شاعروں کی فہرست درج ہے۔ حیدرآبادی شعراء کے علاوہ ان شاعروں کے نام بھی لکھے گئے ہیں جو اس زمانہ میں باہر سے حیدرآباد آئے اور ہر تمہید کے آخر میں شمالی ہند کے ان مشہور اساتذہ سخن کے نام بھی بتلا دئے گئے ہیں جو اس دور کے شعرائے حیدرآباد کے معاصر تھے۔ اس صراحت سے اس مرقع کے مطالعہ کرنے والوں کو اردو کے ان تمام شاعروں کے متعلق تاریخ وار علم حاصل ہوگا جنہوں نے گذشتہ سوا دو سو سال میں اپنے مسلسل خدمات اور گراں بہا کارناموں کی وجہ سے زبان اردو کو دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بنا دیا۔

اس مرقع میں ان شاعروں کی تصویروں کے علاوہ جن کا تذکرہ درج کیا گیا ہے۔ ہر دور کے قدردانان شعر و سخن یعنی سلاطین آصفیہ اور وزرا و امراء کی تصاویر بھی شریک ہیں۔ نیز ہر دور کے ان جملہ معاصر شعراء کی تصاویر کو بھی

شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے نام تمہیدوں میں درج ہیں۔ تصاویر کی فراہمی اور طباعت کے انتظامات میں خاص زحمت اٹھانی پڑی ہے۔ سلسلہ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب اور مولوی سراج الدین صاحب طالب کا شکر گذار ہے کہ انہوں نے اس بارے میں سلسلہ کی مدد کی۔ اس خصوص میں مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب کی امداد بھی قابل تحسین ہے۔

مرقع کے جملہ مضمون نگار جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ یا متعلم ہیں اور سلسلہ ادبیات اردو کے ممدومعاون۔ مضامین میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شاعر کے سوانح زندگی کے ساتھ اس کا تھوڑا بہت کلام بھی پیش کیا جائے تاکہ دکن کے گذشتہ دوسو سال کے اردو شاعروں کا ہر رنگ کا کلام پیش نظر ہوجائے۔ اس مرقع کا مطالعہ کرنے والے جہاں سراج، شیدا اور ایمان جیسے بلند پایہ مثنوی نگاروں کی مثنویوں کے نمونوں سے لطف اندوز ہوں گے، تجلی، ایمان اور قیس کے قصائد کے منتخب اشعار سے بھی محظوظ ہوں گے۔ اس میں جہاں باقی، عصر اور امجد کی پر تاثیر رباعیوں کے نمونے شامل ہیں۔ درگاہ، ناجی اور مسرور کے رقت آمیز مرثیوں اور نوحوں کے انتخابات بھی درج ہیں۔ اسی طرح جہاں فیض، عصر، اور ناجی جیسے باکمال تاریخ گو شعرا کی بعض تاریخیں نظر سے گذرتی ہیں قیس کی دلچسپ ریختی بھی اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ تغزل کے دلدادگاں کے لئے سراج، چندا، فیض، فیاض، مائل، عزیز، توفیق اور صفی کے کلام کے نمونے بہترین سوغات کا کام دیں گے۔ تصوف و عرفان اور اعلیٰ تخیلات و احساسات سے ذوق رکھنے والے سراج، فیض، توفیق، شاد، صغیر اور امجد کے کلام سے خاص کیف حاصل کریں گے۔ اسی طرح بندش محاورہ اور لطف زبان کا چسکا ہو تو تمیز، عصر، عزیز، کیفی اور صفی کے کلام کے نمونے بھی موجود ہیں۔ غرض ہر رنگ کے شاعروں کے حالات اور ہر طرز کی شاعری کے نمونے اس مرقع میں یکجا جمع ہوگئے ہیں۔

اس سلسلہ میں اس واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شاعروں کے حالات اور کلام کی فراہمی میں ہر ممکنہ ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اور مضامین کو تحقیقی طرز سے زیادہ ادبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انہی شاعروں سے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کے ذریعہ سے اور زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں اور ان کے کلام کے ایسے مجموعے بھی مل سکیں جو اس وقت دستیاب نہ ہوسکے۔ یہ بعد میں کام کرنے اور دکن کی اردو شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان ابتدائی تعارفی مساعی کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں اور ان میں سے ہر شاعر پر ایک جداگانہ کتاب مرتب کریں۔

آخر میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ اہم کام سرانجام نہ پاسکتا اگر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ مولوی سید خورشید علی صاحب، پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب، مولوی سید محمد صاحب، اور مولوی میر سعادت علی رضوی صاحب اس کام میں سلسلہ کا ہاتھ نہ بٹاتے۔ ان کے مشوروں اور امداد کا "سلسلۂ ادبیات اردو" خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

۴؍ ڈسمبر ۱۹۳۵ء
مطابق ۷؍ رمضان ۱۳۵۴ھ

سید محی الدین قادری زورؔ
مدیر عمومی

پہلا دور

سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک

اس دور کے پچاس سے زیادہ اردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جن میں سے اکثر اورنگ آبادی ہیں، لیکن بعد میں جب سنہ ۱۱۸۳ھ میں حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالحکومت قرار پایا علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہو گئیں۔ اس دور کے متعدد شعرا اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثروں کے اردو دواوین، مثنویوں، مرثیوں اور قصیدوں وغیرہ کے مجموعے بھی اس وقت موجود ہیں۔ مگر ان سب پر اجمالی طور پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کے لئے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے اسلئے یہاں اس دور کے صرف چار شاعر سراج، درگاہ، شیدا اور تجلی کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں محمد باہ محرم (متوفی ۱۱۶۶ھ) مرزا داؤد (۱۱۶۸ھ) نورالدین علی خاں رنگین (۱۱۷۰ھ) نجفی میر عاشق علیخاں ایما (۱۱۷۲ھ) مرتضی مہدی (۱۱۷۴ھ) کنہیالال مہاسنگہ حقیر (۱۱۷۷ھ) مہر علی مہر (۱۱۷۸ھ) مرزا مغل کمتر (۱۱۸۳ھ) مرزا عطا ضیا (۱۱۸۳ھ) شاہ فضل اللہ فضلی (۱۱۸۴ھ) منور الدولہ یار (۱۱۸۵ھ) خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت (۱۱۸۷ھ) معتبر خاں عمر (۱۱۸۷ھ) میر حفیظ اللہ واحد (۱۱۸۸ھ) میر فخرالدین فخر (۱۱۹۰ھ) میر عبدالحی خاں صمصام الملک صارم (۱۱۹۲ھ) شیخ احمد مضطر (۱۱۹۴ھ) مرزا جمال اللہ عشق (۱۱۹۵ھ) لالہ چیند رنگین (۱۱۹۵ھ) سمروچی رائے لالہ (۱۲۰۰ھ) الفت خاں مبتلا (۱۲۰۰ھ) مرزا محمدی بیگ مرزا (۱۲۰۱ھ) شیخ ظہور الدین نادر (۱۲۰۱ھ) موہن لال مہتا (۱۲۰۲ھ)

کے علاوہ لچھمی نارائن شفیق، شاہ عنایت اللہ فتوت، اسد علی خاں تمنا، لالہ جے کشن بے جان، اور محمد بیگ رضا وغیرہ کے اردو کلام کے نمونے مختلف تاریخوں اور تذکروں مثلاً گلزار آصفیہ، چمنستان شعرا، محبوب الزمن، دکن میں اردو، تذکرہ شعرائے اورنگ آباد اور مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس دور میں جو شاعر باہر سے دکن میں آئے ان میں میر غلام علی آزاد، غلام علی ارشد، ملا باقر شہید، نور العین واقف عبد الحکیم حاکم، اور عبد القادر رسامی وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں جو نواب ناصر جنگ شہید (۱۱۶۴ھ) اور بعد میں نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۲۱۸ھ) کی سرپرستی شعر و سخن سے مستفید ہوئے۔

اس زمانہ میں شمالی ہند میں شیخ شرف الدین مضمون (۱۱۵۸ھ) نجم الدین علی خاں آبرو (۱۱۶۱ھ) انعام اللہ خاں یقین (قبل ۱۱۷۰) اشرف علی خاں فغاں (۱۱۸۶ھ) مرزا جان جاناں مظہر (۱۱۹۴ھ) محمد رفیع سودا (۱۱۹۵ھ) خواجہ میر درد (۱۱۹۹ھ) میر حسن (۱۲۰۱ھ) شیخ ظہور الدین حاتم (۱۲۰۷ھ) اور ان کے معاصرین تاجی، یکرنگ، احسن، اور بیدار وغیرہ اردو کے مشہور شعرا تھے۔

(۱)

شاہ سراج اورنگ آبادیؒ

از

غفور احمد صاحب مجددی



آصفجاہ اولیٰ

نواب میر قمر الدین علیخان فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مغفرت مآب ۱۱۲ھ – ۱۱۶۱ھ

شاہ سراج اورنگ آبادی

بیجاپور اور گولکنڈہ کی تباہی کے بعد دکن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز اورنگ آباد قرار پایا۔ یہیں کی خاک سے ولی جیسا نامور پیدا ہوا جسے اردو شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے یہیں کی سرزمین سے ایک اور خوش فکر اور عالی خیال اٹھا لیکن بدقسمتی سے اسے آج ولی کی سی شہرت حاصل نہیں اور اس قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کا وہ مستحق ہے۔ اسکی وجہ حالات اور دونوں شاعروں کے طبائع کا اختلاف ہے۔ ولی نے ایک شہرت پسند طبیعت پائی تھی۔ سیاحت کا شوق اسے شہروں شہروں لیے پھرتا تھا جہاں جاتا اس کے تغزل سے در و دیوار گونج اٹھتے۔ بخلاف اسکے دوسرا شاعر، گو جس کا تعارف اسوقت مقصود ہے یعنی سراج اورنگ آبادی عزلت پسند اور خلوت گزیں تھا اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ حلقۂ احباب تک محدود۔ شاہ سراج دکن ہی میں پیدا ہوئے، دکن ہی میں رہے اور یہیں مر گئے۔ ولی کے برابر مشہور نہ سہی لیکن ریختہ گوئی میں ولی کے ہم پلہ ضرور ہیں۔ انکا کلام ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جو ایک عالی خیال شاعر کی خصوصیات سے ہیں۔ خود آن کی رائے اپنے متعلق یہ ہے ؎

تجھ مثل اے سراج بعد ولی ۔۔۔ کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

پھر اسکے ساتھ یہ بھی اعتراف ہے کہ جیسی چاہیے انھیں شہرت حاصل نہیں اور اپنی قابلیت کے جوہر کے سبب یہ توقع بھی کہ کبھی نہ کبھی ضرور قدر ہوگی کہتے ہیں۔

شاید کہ بعد مرگ کریں یاد خاص و عام ۔۔۔ مشہور نہیں سراج کا شیریں سخن ہنوز

سراج کا پورا نام سراج الدین ہے نسباً حسینی سیّد۔ خاندان نہایت معزز و مقتدر۔ آبا و اجداد میں اکثر مشائخ و صوفیا گزرے ہیں۔ سراج کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اورنگ آباد میں رہتے تھے اور عزت کی زندگی بسر کرتے تھے سراج کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کسی تذکرہ میں نہیں ملا البتہ اردو دیوان کے آخر میں خود لکھتے ہیں۔

جب کیا جزوِ پریشانِ سخن شیرازہ بند ۔۔۔ تھے برس چوبیس میری عمر بے بنیاد کے

سال ہجری تھے ہزار و یک صد و پنجاہ و دو   واقف علم لدنی صاحبِ ارشاد کے

اس لحاظ سے سنہ ولادت ۱۲۲۵ھ ہوتا ہے۔

سراج کی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہاں نہ صرف مذہب و دینداری کی روح کام کر رہی تھی بلکہ تصوف کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس ماحول کے اثرات عموماً کسی شخص کو عزلت گزینی اور دنیا سے کنارہ کشی کی طرف مائل کر دینے کے لئے کافی ہوتے ہیں سراج پر اس کا اثر اتنا گہرا پڑا کہ بچپن ہی میں نہ صرف ترک دنیا کیا بلکہ بیاباں نوردی اختیار کر لی۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مجذوب اور مخبوط الحواس ہو کر جنگل کی راہ لی اور سات سال اسی عالم میں گزار دئے۔

تعلیم بارہ سال کی عمر تک جو ہوئی سو ہوئی اس کے بعد ان پر دوسرا ہی رنگ چھا یا رہا۔ تاہم اشعار کے استادانہ انداز فارسی کی پختگی، حسن مذاق اور ان معلومات کا خیال کرتے ہوئے جو شاعر کی تصانیف سے ظاہر ہیں کہا جا سکتا ہے کہ اتنی ہی عمر میں کافی علمیت پیدا ہو چکی تھی۔ میر نے نکات الشعراء میں، اور قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعراء میں سراج کو سید حمزہ کا شاگرد لکھا ہے ضرور ہے کہ یہ شاگردی درسی کتب تک محدود ہو کیونکہ شعر و سخن میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان کے حالات زندگی اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انھیں شعر و سخن میں کسی کا شاگرد تسلیم کیا جائے بلکہ خود ان کے کلام سے اس چیز کے ثبوت میں کوئی حوالہ نہیں ملتا حالانکہ ان کا کلام ذاتی آراء و افکار، حالات و سوانح کے اثرات سے مملو ہے۔ وہ اپنی فکر موزوں اور ذوق شعر گوئی کو حضرت عبد الرحمن کے باطنی فیض کا مرہون بتاتے ہیں۔ یہ بھی شاعر کی خوش اعتقادی سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ ان کی شعر گوئی کی ابتدا شاہ عبد الرحمن سے بیعت کرنے سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ سوائے شاہ صاحب کے کسی دوسرے کا نام اس سلسلہ میں موجود نہیں۔ کہتے ہیں ؎

مشعل سوز جگر ہے ہر غزل میری سراج   شمع دل روشن ہے فیض شاہ رحماں کے طفیل

بارہ سال کی عمر تھی کہ مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی۔ وحشت کا درجہ جنون تک پہنچا۔ دل میں تڑپ تھی، مزاج کی وارفتگی حد سے بڑھ گئی انجام کار برہنہ تن اور برہنہ پا جنگل کو نکل گئے۔ اکثر اوقات شاہ برہان الدین غریب کے مزار کے گرد طواف کرتے تھے۔ اسی حالت درد میں کبھی چیخ اٹھتے، کلام موزوں بے ساختہ جاری ہو جاتا یہ کلام اکثر ضائع ہو چکا کہ وہاں لکھنے کا ہوش کسے تھا۔ جو باقی ہے وہ دکھے ہوئے دل کا آئینہ دار ہے اگرچہ اس کی تعداد چند فارسی اشعار سے زیادہ نہیں۔ سراج نے خود لکھا ہے کہ اس دور کے

اشعار فارسی میں تھے۔ ریختہ گوئی کا دور اس کے بعد شروع ہوا۔

سات برس اسی حالت جذب و دیوانگی میں گزرے۔ مجبور ہو کر والدین نے پا بہ زنجیر گھر میں بٹھا رکھا لیکن اسکے بعد ہی وحشت میں اضافہ ہو گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد ہوش آ گیا اس وقت ۱۱۴۷ھ میں شاہ عبدالرحمٰن صاحب چشتی سے بیعت کر لی۔ اور اسکے بعد ہی ریختہ گوئی کا دور شروع ہوا۔ "منتخب دیوانہا" کے دیباچہ میں سراج نے اپنے حالات لکھے ہیں جس کو لچھمی نرائن شفیق نے تذکرۂ رعنا میں نقل کیا ہے۔

"این فقیر از سن دوازدہ سالگی بغلبۂ شوق ہفت سال جامۂ عریانی در بر داشت و بتکلیف نشۂ بیخودی اکثر در سواد روضۂ متبرکہ حضرت برہان الدین غریب شبہا بروز می آورد و از جوش ہمان مستی اشعار شور انگیز و ابیات درد آمیز بزبان فارسی از کمنہ جان بعرصۂ زبان می آمد و باقتضائے احوال خامہ بتحریر آن آشنائی ساخت احیاناً اگر شوق مندے حاضر الوقت می بود بجہت حلاوت ذائقۂ طبع خود کاغذ را سیاہ می نمود و اگر آن اشعار تمام بتحریر می آمد دیوانے ضخیم ترتیب می یافت۔ چون تقاضائے عمر قابل آن ہمہ سخن سنجیہا نبود باستماع آن موزونات حالی عالمے در ورطۂ تعجب افتادہ از جملۂ الہامات تصور می آورد۔ بعد انقضائے مدت مسطورہ تلاش لذت تحقیق محرک رگ جان گردید تا بآن وساطت بجناب جامع شریعت غرّہ سالک طریقت الاخفی......

حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کہ وصال مقدس در سنہ احدی وستین ومایہ والف اتفاق افتاد مستعد ارادت گشتہ فیض یاب ارشاد گردید و جرعۂ از بزم عنایت آن ساقی شراب بذات موافق حوصلۂ خود چشید۔ دران ایام برائے پاس خاطر عزیز عبدالرسول خانصاحب کہ برادر طریق این فقیر اند اکثر اشعار آبدار در زبان ریختہ بسلک مسطور منسلک گشت ایشان آن جواہر متفرق را کہ قریب پنج ہزار بیت بود بہ ترتیب دیوان مروف نمودہ حصۂ مشتاقان خاص گردانیدہ رفتہ رفتہ شہرۂ تمام یافت کہ بعام ہم رسید و فقیر بعد چندے بلباس فاخرہ الفقر فخری ممتاز گردید و از ہمان روز موافق امر مرشد برحق تا حالت تحریر کہ سال ہفدہم است دست زبان از دامن سخن کشید"۔

اس عہد کے بزرگوں اور فقراء میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا۔ اگرچہ خود شاہ عبدالرحمٰن کے متعلق تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان مشاغل سے آزاد تھے کیونکہ بعد میں انہوں نے سراج کو بھی شعر و سخن سے باز رکھا لیکن ان کے مریدین اور سراج کے برادران طریقت اکثر اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے چنانچہ سراج کی محفل میں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوا۔ مریدی کے ساتھ ان کی شاعری کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور یہی دور ان کی زندگی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی وقت سراج کے اصلی جوہر کھلے! اہمیت کے لحاظ سے یہ زمانہ قابل لحاظ ہے اگرچہ اسکی مدت اتنی قلیل ہے کہ پانچ سال سے زیادہ نہیں۔ سراج کا اردو دیوان ۱۱۵۲ھ میں ترتیب دیا گیا۔ اس دیوان کی ترتیب کے بعد ہی فقیری کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا کہ شعر و سخن سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اس پر مستزاد یہ کہ مرشد نے شعر گوئی کی ممانعت کر دی۔ سراج اگرچہ فطری شاعر تھے لیکن ان حالات و خیالات کے تحت انہوں نے یک لخت شعر گوئی سے کنارہ کشی کی اور ستر برس تک ایک شعر بھی نہ کہا۔

۱۱۶۱ھ میں شاہ عبدالرحمٰن کا انتقال ہو گیا۔ مرشد کے انتقال کے بعد سراج کے فطری جوہر پھر ظاہر ہونے لگے۔ شعر کہنے کی تو جرأت نہیں ہوئی لیکن جذبہ بے اختیار تھا، اس کو اس طرح نکالا کہ فارسی شعراء کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ یہ مجموعہ ۱۱۶۹ھ میں مکمل ہوا۔ اس کا تاریخی نام منتخب دیوانہا ہے۔ اسکے دیباچہ میں سراج نے اپنے حالات مختصر طور پر تحریر کیئے ہیں۔ اس مجموعہ کے دیکھنے سے انتخاب کرنے والے کے حسن مذاق اور ذوق سخن کا اچھا ثبوت مل سکتا تھا لیکن افسوس کہ یہ کتاب اب نہیں ملتی۔

سراج کی فطری قابلیتیں جو ممانعت کے دباؤ سے دبی ہوئی تھیں اس مجموعہ کے بعد اپنی اصلی شان سے پھر بیدار ہوئیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دور میں غزل گوئی کا مرتبہ کیا رہا۔ سراج نے غزلیں کہیں بھی یا نہیں تاہم ایک کارنامہ جو ان کے ذوق شعر گوئی کے احیا کا کھلا ثبوت ہے اُن کی مثنوی بوستان خیال ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں لکھی گئی۔ لچھمی نرائن شفیق نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد گیارہ سو ساٹھ لکھی ہے لیکن میرے مطالعہ میں جو کتاب آئی وہ سات سو اکیس ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مثنوی کے سال تصنیف کے بائیس برس بعد ۱۱۹۵ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ سراج کا یہ آخری کارنامہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔

مثنوی کے بعد سراج کا وقت زیادہ تر عزلت نشینی اور یاد الٰہی میں گزرا۔ اس کے چار سال بعد ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی۔ چوتھی شوال اور جمعہ کا دن تھا۔ جنازہ کو عظمت و شان کے ساتھ چوک کی مسجد میں لایا گیا۔ نماز میں دو ڈھائی ہزار آدمی تھے۔

معاصرین واحباب نے تاریخیں کہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی کی تاریخ "ہے ہے مصباح ہند خاموش" اولاد محمد ذکا بلگرامی کی تاریخ "سراج بزم ادب کرد نورانی" اور لچھمی نرائن شفیق کی "روبرحمان نمود شاہ سراج" تذکروں میں موجود ہیں۔

سراج کی سیرت میں، اور سیرت کے زیر اثر اشعار میں، جو چیز نمایاں اور اہم نظر آتی ہے، ایک تڑپ اور ذوق ہے۔ یہ چیز بچپن میں ان کے قلب پر نقش ہوئی بہت جلد شعلہ کی طرح بھڑک اٹھی۔ مبداء اصلی سے ملنے کا شوق اور وصل الٰہی کی کشش ان کو جنگل لے گئی سوز و گداز قلب پر چھا گیا اور یہ اثرات اشعار کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ خود ہی کہتے ہیں۔

جل گیا شوق کے شعلہ میں سراج اپنی دانست میں بیجا نہ کیا

شوق و تجسس کی زندگی اور خلوص و صداقت کو وہ بادشاہت سمجھتے ہیں۔

بیٹھا ہے تخت شوق پہ جو بیکھے ریا وہ بادشاہ بارگہ کبریا ہوا

اسی جذبہ نے سراج کی سیرت میں بے نیازی اور قناعت پیدا کر دی تھی۔ عمر بھر خانہ نشینی میں گزری کسی کی ملازمت نہیں کی کسی کی تعریف میں رطب اللسان نہیں ہوئے۔ ایک بے پرواہ اور آزادانہ زندگی تھی۔ اُن کا خیال یہ تھا:

بس ہے غبار راہ لباس شہنشہی سلطان بے خودی کو تجمل سیں کیا غرض

بے خبر ہے محفل کونین سے مثل سراج جو ہوا ہے بیخودی کے جام سے سرشار عشق

باوجود گوشہ نشینی و بے تعلقی وہ زاہد خشک نہیں تھے۔ ایک زندہ دل اپنے پہلو میں رکھتے تھے۔ احباب کی مجلس میں یار شاطر تھے مشاعروں اور محفل سماع میں صدر مجلس۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ اُن کے یہاں محفل سماع منعقد ہوتی اصحاب حال و قال صاحبان ذوق اور مشائخ بلکہ امراء تک شریک ہوتے۔ درد و سوز میں ڈوبی ہوئی غزلیں سنائی جاتیں اور ایک عالم سرور و کیف طاری رہتا۔ اسی گرم جوشی اور زندہ دلی کا نتیجہ ہے کہ سراج کا کلام شوخی و ظرافت کے اچھے ذخیرہ سے مملو ہے۔ علاوہ ازیں سخاوت، تواضع، وسعت مشرب اور انصاف پرستی بھی اُن کے اخلاق کے اہم اجزا ہیں۔ معاصرین سخن گو کسی طرح سراج کے شاکی نہیں۔ عموماً ایک فن کے متعدد ماہرین میں کشیدگی اور تعصب ہوتا ہے لیکن سراج کے معاصرین اُن کے مداح ہیں۔ ان میں بڑے بڑے نامور مثلاً (۱) میر غلام علی آزاد بلگرامی (۲) عبدالوہاب افتخار دولت آبادی (۳) ظفر بیگ حضرا و رنگ آبادی

(۴) عبدالقادر سامی اورنگ آبادی (۵) عارف الدین خاں عاجز (۶) موسوی خاں فطرت (۷) محمد فقیہ دردمند اودگیری (۸) مرزا محمد باقر شہید (۹) جان مرزا رسا (۱۰) موسوی خاں جرأت (۱۱) خافی خاں (۱۲) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (۱۳) میر اولاد محمد ذکا بلگرامی موجود تھے۔ ان لوگوں میں سے لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں: —

"سراج، شمع چرب زبان بزم روشن بیانی وسراج منیر محفل آتش زبانی است بازار ریختہ در دکن بعد ولی از او گرم گردیدہ ...... شعر پر سوزش دل فروز و سخن ریختہ اش گلوسوز"۔

افضل اورنگ آبادی تحفۃ الشعراء میں لکھتے ہیں: — سراج ...... طبع موزوں داشت . در فکر ریختہ ہندی صاحب قدرت ...... فکر اشعار فارسی ہم می نماید"۔

عبدالوہاب افتخار تذکرہ بے نظیر میں لکھتے ہیں: — "سید سراج الدین در مبادی نشو و نما رنگ گل خرقۂ درویشی دربر کرد و از تماشای صبح شعور بسان بلبل مشق زمزمہ سخن سنجی پیش گرفت و شعر ریختہ یعنی ہندی و فارسی آمیز را مرتبہ کمال رسانیدہ و شہرتے تمام پیدا کرد گاہے زبان قلم را باشعر فارسی ہم آشنا می گرداند"

—— (۲) ——

تصانیف

(۱) کلام فارسی (۲) دیوان اُردو (۳) منتخب دیوانہا (فارسی) (۴) مثنوی بوستان خیال (اُردو)

(۱) کلام فارسی: — سراج کے جو ہر ابتدا میں فارسی اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یہ اشعار قلبی واردات اور حال کے آئینہ دار ہیں۔ حالت جذب میں ایک دم زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ سراج نے ان کو کبھی لکھ کر نہ رکھا ورنہ جیسا وہ خود لکھتے ہیں دیوان ضخیم تیار ہو جاتا۔ تحفۃ الشعرا اور تذکرہ بے نظیر میں چند فارسی شعر لکھے ہیں جو معنی آفرینی، ندرت مضمون، حسن ادا، سوز و گداز اور واردات قلبی کا مجموعہ ہیں۔ چند منتخب شعر نقل کئے جاتے ہیں: —

مضمون آفرینی :—	تا خرامان بت من عزم تماشائی کرد	نقش پا آئینہ دار ید بیضائی کرد
واردات قلبی :—	باز از سر نو داغ جنون در جگر افتاد	در خرمن عقلم ز محبت شرر افتاد
درد و اثر :—	دامان من امروز کہ گلچین مراد است	خون جگرم آب شد از چشم تر افتاد
بے ساختگی، واردات قلبی :—	گم کردہ دلم مایہ ایمان نگاہے	آیا بت جادو نظرے در نظر افتاد
مضمون آفرینی :—	قطرہ افشانی مژگان مرا دیدہ بزم	شمع را اشک گل از دیدہ گل گیر چکید
برجستگی و واردات قلبی :—	کے نگاہم بر ہلال عید افتد بے حجاب	می زند ناخن بدل شمشیر ابروئے کسے
درد و اثر :—	جان شیرین تلخی نزع است بے لعل لبے	ساغر مئے کاسہ زہر است بے روئے کسے
حسن ادا :—	در شب تارم چراغان می تواند شد سراج	روغن گل گر بدست آید ز گیسوئے کسے
واردات قلبی :—	طرفہ باشد در خزان شور نوا مشب خیر باد	دیدہ ور خواب اے بلبل گل روئے کسے
〃 〃 :—	چون چراغ سحر از جان شدہ ام سیر سراج	دامن افشاندن او عین کرم می دانم

(۲) دیوان اردو: یہ دیوان سنہ ۱۱۴۷ھ سے سنہ ۱۱۵۲ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ سراج نے اشعار کی تعداد پانچ ہزار لکھی ہے۔ میرے مطالعہ میں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کا مملوکہ نسخہ رہا جو تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۱۲۵۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں تین نسخے ہیں جن میں کلیات سراج تو مجھے دیکھنے کو نہ مل سکا دوسرے دو نسخے دیکھے ان میں جامعہ عثمانیہ والے نسخہ سے بعض غزلیات زیادہ ہیں لیکن پھر بھی ان کی تعداد پانچ ہزار نہیں ہوتی۔

پانچ سال کی مدت میں پانچ ہزار اشعار کا دیوان مرتب کر لینا سراج کی پرگوئی کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم پرگوئی اتنی قابل تعریف نہیں جتنی ندرت اور حسن شعر، تغزل اور شعریت کا جو مجموعہ، درد اور حالات قلبی کا جو مرقع دیوان سراج کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے وہ انہی لوگوں سے ممکن ہے جن کو یہ جوہر فطرت کے عطیہ کے طور پر ملا ہو اور جن کا ذوق وہبی ہو اکتسابی نہ ہو۔ فطری رجحان ہی اتنی قلیل مدت میں ایسے نادر مجموعہ کی تیاری کا باعث ہو سکتا ہے اسکے سوا دوسری توجیہ ممکن نہیں۔

(۳) منتخب دیوانہا:— سنہ ۱۱۵۲ھ سے سراج نے شعر گوئی ترک کی۔ سنہ ۱۱۶۱ھ میں شاہ عبدالرحمن کا انتقال ہوا۔

ان کے انتقال کے بعد سراج کے لئے کوئی مشغلہ نہ رہا تو طبیعت پھر پرانے شغل یعنی شعر و سخن کی طرف لوٹ آئی۔ خود تو شعر نہیں کہا لیکن اساتذہ کا کلام مطالعہ میں رہا۔ ذوقِ سخن نے اشعار کا انتخاب کرایا اور اس طرح ایک مجموعہ اشعار ۱۱۶۹ھ میں منتخب دیوانہا کے نام سے وجود میں آگیا۔ یہ انتخاب سراج کے سات آٹھ سال کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ کتنا قابل دید اور قابل قدر ہوگا افسوس کہ فی الحال دستیاب نہیں ہوا۔

(۴) مثنوی بوستان خیال ۱۱۷۳ھ :۔ منتخب دیوانہا کے بعد سراج کے دبے ہوئے جذبات ایک مثنوی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یہ ایک قابل قدر ادبی شاہکار ہے۔ مثنوی کی بحر متقارب محذوف (فعولن فعولن فعولن فعل) ہے روانی برجستگی، سادگی اور اثر اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ مثنوی کی ما بہ الامتیاز چیز یہ ہے کہ اس میں شاعر نے اپنے ہی دردِ دل کا اظہار کیا ہے، ایک آپ بیتی ہے جس میں تکلف و تصنع، خیال آرائی اور داستان نگاری کے پرشکوہ انداز مفقود ہیں۔ الفاظ اور قصہ کی سادگی نے رومان پیدا نہیں ہونے دیا تاہم چونکہ شاعر اپنی ہی سرگزشت بیان کر رہا ہے اس لئے موثر اور دلچسپ ضرور ہے۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

اَرے ہم نشینو مرا دکھ سنو	مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
مرے پر عجب طرح کے درد ہیں	کہ سب درد اس درد کے گرد ہیں
فلک ہو تو اس چوٹ میں جائے لوٹ	جگر کے جگر کے جگر میں ہے چوٹ
کہوں کیا کلیجہ میں سوراخ ہے	مری داستاں شاخ در شاخ ہے

شاعر اپنے پہلو میں ایک حسن پرست دل تو ہمیشہ سے رکھتا تھا لیکن کسی خاص محبوب سے لگاؤ نہ تھا۔ اسکی علمیت اور قابلیت کا شہر میں شہرہ تھا اس وجہ سے شہر کے خوبرو اسے جھک جھک کر سلام لگانے طرح طرح کے ناز و انداز اختیار کرنے کہ کسی طرح اسکے دل کو اپنی طرف مائل کریں۔ ایک روز چند دوستوں کے ساتھ چوک کی سیر کر رہے تھے کہ ایک ہندو پسر سامنے آگیا اس نے جھک کر سلام کیا۔ یہ سلام ایک برق خرمن سوز تھا جو شاعر کے متاع عقل و ہوش کو لے اڑا:۔

نپٹ مجکوں پیارا لگا وہ سلام	مگر رخصتِ ہوش کا تھا پیام

نہ تھا وہ سلامِ آفتِ ہوش تھا　　　جو کچھ تھا سو طوفانِ پُر جوش تھا

خوش قسمتی سے یہ محبوب، محبوبِ دلنواز ثابت ہوا اور بہت جلد محبت کے تعلقات مستحکم ہوگئے۔ کیسے مزے لے کر سراج اس قصہ کو بیان کرتے ہیں :-

نہایت ہوا مجھ سیں یارِ ندیم　　　ہوئی دوستی کی گرہ مستقیم
محبت کے دریا ابلنے لگے　　　رقیب آتشِ غم میں جلنے لگے
ہوا شہر میں سارے یکبار شور　　　فلانے فلانے کی الفت ہے زور
پڑی سب قبیلہ ستے اسکی دھوم　　　نہایت کیے سب نے اس پر ہجوم

اسکے گھر والوں کو اعتراض تھا کہ مسلمان اور ہندو کی ایسی دوستی مناسب نہیں

کہ رہنا اُسی پاس ہر صبح و شام　　　کبھی گھر کو آوے تو آنے کا نام
تجھے قوم سیں سب نکالینگے ہم　　　کہ یہ نئیں ہے آئینِ ہندو دھرم

لیکن اسنے کچھ پرواہ نہیں کی۔ صاف کہدیا :-

تمھارے سیں ہرگز نہیں مجکو کام　　　بہوت یہ کہ جاویگا ننگ و نام
سلامت رہے وہ مرے سر کا تاج　　　جسے نام روشن ہے سید سراج

گر بدقسمتی سے آخر میں اُسنے بے وفائی کی۔ اور سراج کو بے قرار و مضطر چھوڑ کر چلا گیا۔ سخت ناامیدی و یاس کا عالم تھا کہ ایک غمخوار دوست مل گیا جو نہایت حسین، متواضع، ملنسار اور دولتمند تھا۔ یہ شخص بادشاہ ہندوستان کی فوج میں ملازم تھا جو بال کنڈا کی تسخیر کے سلسلہ میں دکن آیا ہوا تھا۔ سراج سے گہری دوستی ہوگئی۔ اگرچہ دل اچاٹ رہتا تھا مگر سراج بھی اسکی صحبت میں سکون و راحت پاتے۔ یہ شخص برسات کے موسم میں سراج کو اپنے وطن لے گیا۔ اسوقت تک اسے ان کا رازِ دل معلوم نہیں تھا ایک دن سیرِ چمن کے دوران میں سراج کو محبوب کی یاد نے ستایا اور یہ بے ہوش ہوگئے۔ اسوقت رازِ پنہاں ظاہر ہوگیا۔ اس دوست نے تمام ماجرا سن کر نہایت ہمدردی کا اظہار کیا اور نعم البدل کے طور پر اپنے کو خدمت کے لئے پیش کیا۔ سراج بھی

اب اُس سے مانوس ہو گئے تھے لہٰذا اس شخص کی صورت میں ان کو تسکینِ خاطر کا سامان مل گیا۔

مثنوی کا قصہ اتنا ہے، لیکن اسکو نہایت پرلطف اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ضمناً ایک راجہ کے وزیر کی حکایت لکھی ہے جو محل سرا کی ایک خواص کا ہاتھ دیکھ کر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ناامیدی و یاس نے اسکو ایسا گھیرا کہ شاہی توشہ خانہ سے منگا کر زہرِ ہلاہل کے تین شیشے پی لئے لیکن عشق کی گرمی ایسی تھی کہ کچھ اثر نہیں ہوا۔ بادشاہ نے ابتداءً تو سخت باز پرس کی لیکن جب اسکو اصل حال معلوم ہوا تو نہایت مہربانی سے پیش آیا۔ تمام خواصوں اور بیگمات کو بلا کر حکم دیا کہ پردہ سے ہاتھ نکال کر دکھائیں۔ وزیر سخت کرب و اضطراب کی حالت میں اپنے محبوب کا ہاتھ پہچاننے کی فکر میں کھڑا تھا۔ یکایک وہی ہاتھ نمودار ہوا وزیر کے قلب سے ایک آہ نکلی اور وہیں گر کر مر گیا۔ اس جان نثاری کا فوری اثر محبوبہ کے دل پر ہوا اور وہ بھی اُسی وقت رخصت ہو گئی۔

یہ قصہ بہت غیر معمولی ڈرامائی کیفیت رکھتا ہے۔ اصل قصہ، یعنی خود مصنف کی سرگزشت اس سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی عموماً کسی تاریخی یا فرضی قصہ پر مشتمل ہوتی ہے، مثنوی نگار کی خوبی یہی ہے کہ صفائی، تسلسل، اور سادگی کے ساتھ قصہ کو بیان کر دے۔ نہ الفاظ کے طمطراق کی ضرورت ہے، نہ بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی۔ اس لحاظ سے سراج کی مثنوی خاص اہمیت رکھتی ہے واقعہ بالکل سیدھا سادھا ہے اور کسی حیثیت سے مافوق الفطرت نہیں جیسا کہ عموماً اردو مثنویوں میں ہوا کرتا ہے۔۔۔

ایک موقعہ پر دل کی بیقراری کو سادگی اور خوبی کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں: —

زبس سینۂ غم سے ہوں دردمند	نہیں قلقلِ شیشۂ مے پسند
ارے ہائے اے ہائے اے ہائے رے	کہیں یہ مرا جان بھی جائے رے
تلک بھی تسلی کہاں پاؤں میں	نپٹ بے کلی ہے کہاں جاؤں میں
کہ عالم میں یہ بات مشہور ہے	زمیں سخت اور آسماں دور ہے
کبھی رفع کرنے کو دل کا غبار	اگر عزم ہو سیرِ باغ و بہار
کروں جب خیابانِ گل پر نظر	مجھے یاد آتا ہے چاکِ جگر

خوبرویوں کے ناز و انداز، ان کا سراپا، ان کے دلربائی کے طریقے کس دلکشی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ ۲

ہر اک بات ان کی ہے جادوگری　　جسے دیکھ بے ہوش ہوئے پری
تغافل میں جن کے ہے افسوں تمام　　ہر اک بات جن کی ہے عاشق تمام
جنوں کا سدا کام ہے دلبری　　جنھے یاد ہے علم افسوں گری
کریں ناز و عشوہ جو ہر بات میں　　عناں خرد کب رہے ہات میں
جسے دیکھ جاتا رہے عقل و ہوش　　زباں بند ہو جائے اور لب خموش
جبیں جن کی روشن ہے جوں مشتری　　کہ بس مشتری کا ہے دل مشتری
جنوں کی سیہ چشم خونریز ہیں　　کمند دو گیسو دلآویز ہیں
کفِ پا ہے جن کا نزاکت سرشت　　گل مخمل سرخ ہشتم بہشت
زبس دل لبھانے کے تھکے گھات پر　　رکھیں ہات پر ہات ہر بات پر
کبھی سر کو لا دیں مرے منہ کے پاس　　کہ پہنچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں　　کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
جفا کر کبھی تو رلا دیں مجھے　　کبھی گدگدی کر ہنسا دیں مجھے
کبھی تو مجھے شاہ صاحب کہیں　　کبھی تو اجی واہ صاحب کہیں
کبھی تو پکاریں ارے میاں سراج　　کبھی تو کہیں تم تو ہو سر کے تاج

اس طرح کی دلچسپ اور دلکش تصویر سادے طریقہ سے کھینچنے میں جو لطف ہے وہ استعارات و تشبیہات، تکلف و تصنع میں کہاں۔ سراج کی پوری مثنوی ان خوبیوں سے مملو ہے مشکل یہ ہے کہ۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

(۳)

کلام پر تبصرہ

سراج کے کلام کی اہم اور قابل لحاظ خوبیاں جو اُنکے رجحان طبیعت کی آئینہ دار ہیں، جو مثنوی اور غزلوں میں یکساں موجود ہیں، اور جن کی وجہ سے سراج کا پایہ بحیثیت شاعر کے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ کلام کی سادگی اور بے تکلفی، فطرت کی طرف رجحان حقیقت اور اصلیت کا اظہار اور اثر، ہیں۔ شاعر کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے اصلی رنگ میں بغیر تصنع و تکلف، ذاتی مشاہدات و تاثرات کے ساتھ ہمارے سامنے آجائے۔ جو کہے وہ اسکی آپ بیتی ہو۔ جو بیان کرے وہ حالات و واقعات پر مبنی بلکہ انسانی نفسیات کا تجزیہ ہو۔ سادگی فطرت سے قریب کرتی ہے اور فطرت سے قربت کیف و اثر پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سراج کا پورا کلام اور اُنکا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اتر جاتا ہے اگر ایسا ہوتا تو محسنان اردو میں اُن کو سب سے اول جگہ دیجاتی کیونکہ ہماری شاعری میں اس چیز کی نہایت کمی ہے۔ تاہم اُن کے کلام کا بیشتر حصّہ اس کسوٹی پر ٹھیک اتر جاتا ہے اسی حصہ میں قوت ہے، انہی شعروں میں جان ہے اور وہی کلام زندہ رہنے کے قابل ہے جو اس حیثیت سے زر کامل عیار ثابت ہوا ہے۔

سب سے پہلے سادگی اور بے تکلفی کو لیجیئے۔ قدما کا کلام عموماً تصنع سے خالی ہوتا ہے لیکن سراج جس عہد کے شاعر تھے اُس وقت اردو شاعری فارسی کے نقش قدم پر گامزن ہو رہی تھی۔ سراج، شاہ مبارک آبرو اور مظہر جان جاناں کے ہمعصر ہیں اور یہی وہ دور ہے جس میں بکثرت ہندی الفاظ نکالے گئے اور اُردو کو فارسی کے جامہ میں جلوہ گر کیا گیا۔ فارسی شاعری کا روپ بھرنا ہی تکلف و تصنع، دور از کار تشبیہات و استعارات اور خیالات کی غیر معمولی بلند پروازی کا پہلا زینہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فارسی شاعری خود ان جکڑ بندھنوں میں بندھ چکی تھی اردو نے اسکی تقلید کی اور نتیجہ کے طور پر اصلیت سے ہٹ گئی۔ سراج کے کلام میں اس کے اثرات خال خال نظر آتے ہیں ورنہ عموماً اُن کا کلام فارسی اثر سے آزاد اور ملکی ہندوستانی اثرات لئیے ہوئے ہے۔ فارسی سے علیحدگی ہی اسکی سادگی و بے تکلفی کو برقرار رکھتی ہے اور یہ چیز باوجود سادگی خیال اور سادگی بندش کے ہمارے کانوں میں عجیب موسیقیت پیدا کرتی ہے۔

کہاں ہے گلبدن موہن پیارا　　　کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا

تغافل ترک کر اے شوخ بے باک | تلطف کر، نوازش کر، مدارا
ہر رات سراج آتش غم میں نہ جلے کیوں | پروانۂ جاں سوز ہے بلہار کسی کا

الفاظ کی سادگی :—

مہر کر مہر موم دل ہو کر | کر عطا دل کا مدعا سارا
ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا | نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا
ہمارا دلبر گلفام آیا | قرارِ جان بے آرام آیا
ہمارے پاس جاناں آن پہنچا | دل بے جان کو اب جان پہنچا
مے و جام و گل و مطرب ہے موجود | بہار وصل کا سامان پہنچا
ہے کمندِ حلقۂ گیسو بلا | دیکھ کر جس کو ہوئے یکسو بلا

خیالات کی سادگی :—

جاناں پہ جی نثار ہوا کیا بجا ہوا | اس راہ میں غبار ہوا کیا بجا ہوا
فصل گل کا غم دلِ ناشاد پر باقی رہا | حشر تک یہ مظلمہ صیاد پر باقی رہا
جو دیکھے اُس کے کاکل کا تماشا | نہ دیکھے پھر وہ سنبل کا تماشا
اگرچہ ہر سرو راست قامت چمن میں مغرور سرکشی ہے | مقابل اُس قد خوش ادا کے مری نظر میں غلام ہوگا
سراپا سحر ہے موہن کہ جس تصویر لکھنے میں | نہ لا دیدار کی طاقت مصور نے قلم بھولا

عاشق جب محبوب کے سامنے جاتا ہے تو نفسیاتی طور پر اُسکو چپ لگ جاتی ہے اور منہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں پڑتی یہ مضمون شعراء نے مختلف طریقوں سے ادا کیا لیکن سیدھے سادے لفظوں میں اصل کیفیت دیکھنا ہو تو سراج کا یہ شعر پڑھیے —

اگرچہ یار ہے میرے سلام ہونے کا | کہاں ہے تاب مجھے ہم کلام ہونے کا

معشوق جدا ہوتے وقت کل آنے کا وعدہ کر جاتا ہے شعراء اس کل کو قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مضمون کو مختلف طریقوں سے

ادا کیا گیا ہے۔ عجیب عجیب موثر کا فیاں ہوئی ہیں بیسیوں شعر اس مضمون کے مل جائیں گے لیکن یہاں ایک شعر ملاحظہ کیجئے کہ یہ مضمون یہیں ختم ہو جاتا ہے اور کتنے سادہ طریقے سے ؎

اے جانِ سراجؔ آج دکھا جلوۂ دیدار　　　ہے وعدۂ فردا مجھے فردائے قیامت

زندگی کا فلسفہ چھوٹی بحر کے دو سادہ اور سلیس مصرعوں میں اس طرح ملاحظہ کیجئے کہ ؎

زندگی اے سراجؔ ماتم ہے　　　مجھ کو شمعِ مزار کی سوگند

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں اگرچہ ان معنوں سے ہمیں سروکار نہیں لیکن غزل کے اندر جتنے برجستگی اور مکالمہ و محاورہ کے انداز پائے جاتے ہیں اتنا ہی اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ سراجؔ کے یہ شعر ملاحظہ ہوں جیسے کوئی آپس میں باتیں کر رہا ہے ؎

کون کہتا ہے جفا کرتے ہو تم　　　شرطِ معشوقی وفا کرتے ہو تم
ہم شہیدوں پر ستم کرتے رہو　　　خوب کرتے ہو، بجا کرتے ہو تم
ہر اک کی آنکھ میں محبوب ہو تم　　　عجب ہو، اور کچھ ہو، خوب ہو تم

سادہ ترین الفاظ میں جذبات کی سچی تصویر ملاحظہ ہو ؎

یار کو بے حجاب دیکھتا ہوں　　　میں سمجھتا ہوں خواب دیکھتا ہوں

مثنوی کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے کتنے سادہ الفاظ میں شاعر اپنے عیشِ رفتہ کی تصویر کھینچ رہا ہے ؎

کہ بارے کسی وقت جیتے تھے ہم　　　ترے ہاتھ سے جام پیتے تھے ہم
ہم آغوش ہوتے تھے ہم بات بات　　　ہمارے پہ ہر رات تھی چاند رات
نہ تھا درمیاں فرقِ ناز و نیاز　　　میں اپنے نصیبوں پہ کرتا تھا ناز
خموشی میں ہوتا تھا مطلب ادا　　　نگاہاں نگاہاں سیں تھی آشنا
سدا نوبتِ عیش سنتے تھے ہم　　　سدا پھول مقصد کے چنتے تھے ہم

ادھر عشق اودھر حسن ہمراز تھا　　مجھے بخت بیدار سیں ساز تھا
عجب شوق تھا اور عجائب بہار　　کہ رہتا تھا دونوں گلے ایک ہار
بیان اس کا شیریں ہے اور دل پسند　　ولیکن مرے ہونٹ ہوتے ہیں بند
کہوں کیا کہا مجھ سیں جاتا نہیں　　لکھوں کیا کہ لکھنے میں آتا نہیں

مضمون آفرینی: ــ سراج کی سادگی بیان وسادگی مضمون ابتذال کی طرف مائل نہیں۔ سادگی کے ساتھ کوئی اعلیٰ مضمون باندھ دیا جائے تو شعر کا حسن معنوی نکھر جاتا ہے۔ سادگی اور مضمون آفرینی میں کوئی تضاد نہیں البتہ جو چیز ان دونوں کو الگ کردیتی ہے وہ طرز ادا ہے۔ کبھی خیال کو اتنے سطحیات پر لایا جاتا ہے کہ مضمون کی پستی ابتذال کی حد کو پہنچ جاتی ہے کبھی مضمون کو اتنا بلند کردیا جاتا ہے اور خیال وہ رفعت پیمائی کرتا ہے کہ شعر مجسم معمّہ اور چیستاں بن جاتا ہے اس ہی افراط وتفریط کو اعتدال پر لایا جائے تو سادگی اور مضمون آفرینی باہم ہو کر ایک عجیب کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ سراج کے یہاں مضمون آفرینی بھی بدرجہ احسن جلوہ گر ہے ؎

دل ہوا زلف سنے چھوٹ بھنسا ابرو میں　　کفر کوں ترک کیا مائل محراب ہوا
رہ گئے ذوق تبسم میں تغافل کے شہید　　بسملوں کا خوں بہا جلاد پر باقی رہا
بسکہ دل محو خیال حلقۂ کاکل ہوا　　پیچ وتابِ آہ دل سیں دستۂ سنبل ہوا
صبح دم سیر چمن کا جب کیا گلرو نے عزم　　ہر صدائے خندۂ گل نالۂ بلبل ہوا
ارے غم صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی　　قیامت کل کوں آئی ہے عمل کرلے تو آج اپنا
رشتہ سیں موج گل کی ہوائے بہار میں　　سب بلبلوں کا چاک گریباں رفو ہوا
ہمارا خون ناحق کب ہوا ضائع ارے قاتل　　زمیں سیں گل ہو نکلا آسماں پر ہو شفق پھولا
اے سراج آفتاب رو آیا　　ہے مرے گھر میں آج مہماں صبح

کبھی مضمون آفرینی کے ذوق میں شاعر کسی شئے کی ایسی توجیہہ لطیف پیرایہ میں کرتا ہے جو حقیقت تو نہیں ہوتی لیکن سراپا اس پر کھپ جاتی ہے۔ مثلاً پھول پر قطرۂ شبنم کو دیکھ کر شاعر کو برجستہ سوجھتا ہے کہ ؎

قطرۂ شبنم نہیں شرمندگی کا ہے عرق　　دیکھ تجھ چہرے کی خوبی پھول گلشن میں لجا

یا مثلاً ہلال کو دیکھ کر کہتا ہے ؎

کیوں سرنگوں نہوئے تجھ ابرو کے سامنے　　شرمندگی کا بار ہے پشت ہلال پر

سراج کی مضمون آفرینی کبھی مبالغہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے ؎

پھر رہا ہے بسکہ دود آہ میرا اے سراج　　آسماں جوں پردۂ فانوس کالا ہوگیا

شعر میں مبالغہ کے ساتھ لطیف ادعائے شاعرانہ بھی ہے۔ اگرچہ کسی قدر دوراز کار ہوگیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا شاعر کی نظر میں غم والم کے سبب اندھیر ہے اس اندھیر کی مناسبت سے وہ آسمان کو کالا سمجھنے کے بعد اسکی توجیہ یہ نکالتا ہے کہ میری دود آہ کا اثر ہے اتنے پیچ کے بعد پھر شعر کے سادہ معنے یہی نکلتے ہیں کہ غم کی وجہ سے دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے۔

چمن میں پھول اور پھول پر قطرۂ شبنم دیکھ کر شاعر کو ایک اچھوتا خیال سوجھتا ہے۔ خود اپنی حالت اُسکو یاد آجاتی ہے اور برجستگی سے وہ اپنی کیفیت کا موازنہ پھول سے اس طرح کرتا ہے ؎

خندۂ گل ہے گریۂ شبنم　　ہے ہنسی یار کی مرا رونا

ایک سادہ خیال ہے تاہم مبالغہ بھی ہے اور حسن تعلیل بھی ملاحظہ ہو ؎

نہ بوجھو آسماں پر تم ستارے　　ہماری آہ کی چنگاریاں ہیں

محبوب کے کان میں موتی ہے اسکو دیکھ کر شاعر کو ایک نیا خیال پیدا ہوتا ہے ؎

کان میں تیرے ہے موتی آبدار　　یا کسی عاشق کا آنسو بولتا

کسی قدر بلند پروازی ملاحظہ ہو ؎

داغ فراق لالۂ باغ خیال ہے　　یہ رہ گئیں جگر میں تمہاری نشانیاں

ایک بالکل اچھوتا خیال دیکھئے ؎

تری گلی کا جو نہیں عزم اے بت دلجو　　تو کیوں چلے ہیں مجھ آنکھوں سنے نکل آنسو

ان چند نمونوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سراج کی معنی آفرینی دور از کار خیالات، حد سے بڑھی ہوئی بلند پروازی اور مبالغوں سے کس قدر بچی ہوئی ہے۔

واردات قلبی و سوز و گداز:۔ فطرت سے قربت اور اصلیت کا لگاؤ یہی چیز ہے جو کلام کو درد انگیز بنا دیتی ہے شاعر وہی ہے جو آپ بیتی سنائے اور وہ چیز بیان کرے جو اُس پر گذر چکی ہو اور جو دوسروں پر گذرتی ہے ایسے شاعر کا کلام ہم پڑھتے ہیں اور اس میں ہمیں خود اپنے کیفیات و جذبات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ فطرت کی قربت سے مراد یہی ہے کہ شاعر ہو، متشاعر نہ ہو۔ اسکے عشقیہ کلام میں عشق ہو، تعشق نہ ہو۔ مولانا حالی فرماتے ہیں "جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بنکر مجلس میں آئے۔ اگر قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہو گا۔"

سراج کا قلب کیفیت سے مملو تھا۔ اُنکی وارفتگی شیفتگی اور از خود رفتگی کی کیفیات اُن کے حالات زندگی سے ظاہر ہیں۔ مثنوی میں اپنے دکھ اور درد کا جو قصہ لکھتے ہیں، ستم کشتی، بے وفائی، بے مہری، ہجر و فراق، درد و الم کی جو داستان وہ بوستان خیال میں پیش کرتے ہیں اگر اسے صحیح مانا جائے تو وہ جیسی کچھ درد آمیز اور رقت انگیز ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ اگر بالفرض اس قصہ کو مصنوعی اور محض تفنن طبع کی ایجاد مانا جائے تب بھی سراج کی اس شور انگیز زندگی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اتنی بات تو ثابت شدہ ہے کہ اُن کا دل عشق کی چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ ایک تڑپ جستجو اور تلاش کی برقی لہر اُن کی روح میں سرایت کر گئی تھی۔ اہل اللہ سے محبت کسی کی تلاش میں گھر سے نکل جانا، نوجوانی کا بہترین زمانہ صحرا نوردی اور بیاباں گردی میں گزار دینا اس امر کے لئے کافی ثبوت ہے کہ اُنکا دل کسی معشوق کی اداؤں کا شکار تھا اور کسی محبوب کیلئے بے قرار۔ اب وہ محبوب معشوق مجازی نہ سہی معشوق حقیقی سہی۔ اس جذب و تڑپ کا اثر ہے کہ ان کے شعر آپ بیتی ہیں اُنکے واردات قلبی ہیں اور جب ہم پڑھتے ہیں تو ایک لذت درد، ایک اثر اور روحانی کیف اپنے قلب پر طاری پاتے ہیں۔ انھیں خود اپنی اس کیفیت کا اندازہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

سراج اشعار تیرے کیا بلا ہیں
بھبھو کے ہیں مگر سوز جگر کے

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎ شعر پرسوز مرا نغمۂ داؤدی ہے۔

شوق کے شعلوں میں جل جانے کو مدعائے زندگی اور مقصدِ حیات خیال کرتے ہیں ؎

جل گیا شوق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بیجا نہ کیا

بے نیازی ملاحظہ ہو ؎ سب چھوڑ جان وہاں کو ہیں اُسکی جستجو میں ؛ ہے دشت اور بیاباں باغ و چمن ہمارا

قلبی کیفیات کی تصویر کتنے درد آمیز اور اثر خیز الفاظ میں کھینچی ہے ؎

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

یہ شعر واقعات زندگی سے کتنی مناسبت رکھتے ہیں ؎

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

ہی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

حسرت و یاس کا ذکر کتنے سادے اور پر اثر الفاظ میں کیا ہے ؎

ہائے رہ گئی دل میں دامن گیر لیلیٰ کی آرزو
سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

فنا ہونے کو ہی بقا سمجھتے ہیں ؎ ہے اُسے نور بقا صبح ابد لگ اے سراج ؛ شمع ساں جو کوئی کمر باندھا فنا کے واسطے

جو چڑھا دار پر ہوا منصور
یہ محبت کی پہلی منزل ہے

کیفیات جو ایک عاشق کو ہجر و وصل، انتظار اور یادِ محبوب میں پیش آتی ہیں ملاحظہ ہوں ؎

حالت فصل و جدائی کیا کہوں
ایک دم ہے حق میں میرے سو قرن

کونسی شب ہے کہ مہر دین سراج
درد کے آنسو سے دامن نم نہیں

وصل کے دن شب ہجراں کی حقیقت مت پوچھ
بھول جاتی ہے مجھے صبح کو ہر شام کی بات

عاشق نے محبوب کو خواب میں دیکھا ہے لیکن خواب تو ایک فانی چیز کاش کہ یہ قیامت تک یونہی رہتی! کس خوبصورتی سے کہتے ہیں

بس کہ پایا لذتِ دیدار ساقی خواب میں
صبح محشر لگ مجھے اب ذوق بیداری نہیں

قسمت کی خوبی سے وصل یار حاصل ہوتا ہے لیکن عاشق کو ہجر کا کھٹکا لگا ہوا ہے اور باوجود وصل اسکی بے قراری ویسی ہی ہے ؎

اگرچہ وصل میں ہوں نیم ہجر باقی ہے　　قرار خاطر بے صبر کو کہاں آیا

چمن میں بلبل کو بے تاب دیکھ کر عاشق کو خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہ بھی اسی محبوب کی عاشق ہے جب ہی تو اتنی بیتاب ہے فوراً اسے محبوب اور اسکی گلی کی یاد آجاتی ہے اس شعر کو دیکھئے کیسے چھپے ہوئے رشک کے جذبات جھلک رہے ہیں ؎

آتی ہے تجھے دیکھ کے گلرو کی گلی یاد　　اے بلبل بے تاب مجھے اپنا وطن بول

شاعر کا دل اتنا دکھی ہے کہ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ کتنا فطری جذبہ ہے ؎

بلبل گلشن غزل خواں ہے فراق گل ستے　　یا الٰہی گر ملیں یہ طالب و مطلوب خوب

حقائق و معارف:۔ جس کے دل میں درد ہوتا ہے اسکے اندر صداقت ہونا ضروری ہے۔ صداقت کی روشنی میں حقائق و معارف، نصیحت و موعظت کے دریا بہائے جاسکتے ہیں۔ اردو غزل بڑی حد تک اخلاق و موعظت کے مضامین سے خالی ہے۔ سراج کے یہاں تصوف اور اخلاق دونوں طرح کے مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ متصوفانہ اشعار میں کیف و سرمستی کے آثار ہویدا ہیں۔ اخلاقی کلام ایک خاص موثر پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ (وحدۃ الوجود) ؎

تصوف و موعظت:۔ دیکھا ہوں ہر طرف نگہ امتحان سے　　کوئی دوسرا نظر نہیں آیا جمال دوست

اے بت پرست دیدۂ بینا سیں دیکھ تو ں　　اک ذات میں ظہور ہوا کئی صفات کا

جو اٹھا مجلس ناسوتی سے ؛ محرم خلوت لاہوت ہوا ۔۔ میخانۂ وحدت کا جو کوئی جام پیا ہے ؛ آرام کے کوچہ سیں نکل بے خبر آیا

آنکہ خبر شد خبرش باز نیامد ؎　　پردۂ سری کھلا ہے جس اوپر ؛ عالم ظاہر کا وہ غافل ہوا

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ؎　　دل کا چراغ ہاتھ لے کر من عرف کی سیر تو ؛ ظلمات بیچ چشمۂ حیواں کو دیکھ توں

تصوف کو اخلاق سے چونکہ قریبی تعلق ہے اسلئے سراج کے اخلاقی اشعار بھی متصوفانہ خیالات سے متاثر ہو کر نکلے ہیں۔ وہ ایک بڑے صوفی تھے اور تصوف کی قوت پر وہ ایک مصلح اخلاق کی صورت میں اپنی صداقت اور اثر کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں جو ہماری اردو شاعری میں نادر ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں اس میں صداقت ہے اور سچے دل سے نکلی ہوئی بات ہے اسلئے پُر اثر اور کیفیت آمیز ہے ؎

حیف ہے اسکی تماشابینی پر چشم باطن کو جو کوئی وا نہ کیا　　　جو تری غم کی تمنا نہ کیا پر ابدی عیش کا سودا نہ کیا

اپنی آنکھوں سے جو پنہاں نہوا پر اسنے کچھ عمر میں پیدا نہ کیا ۔ جسکا دل شوق جیوں آئینہ حیراں نہوا پر سب سے لائق ہم چشمی جاناں نہ ہوا

بے خبر ہے محفل کونین سیں مثل سراج　　　جو ہوا ہے بے خودی کے جام سیں سرشار عشق

رنگ کدورت دل سے نکالکر وسعت مشرب اور خلوص پیدا کرنا سب سے بڑی عبادت ہے ـــ

مذہب زاہداں سے برتر ہے　　　عاشق پاکباز کا مشرب

کفر و ایمان کے جھگڑے کو کس خوبصورتی سے چکایا ہے ـــ　کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کو پر آخرش دونوں کا سنگم ہوئے گا

دل کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں ـــ　گرچہ اے زاہد ہوا خلوت میں یوں خلوت نشیں پر مجلس دلمیں تجھے پروانگی درکار ہے

صاف کر دلکو خاکساری سیں پر لازم اس آدمی کو صیقل ہے ۔ سینہ صافی کی جسے ہے عینک پر اسکو دیدار یار ہے بیشک

آئینہ سکندری دل اگر ملے　　　ہرگز تلاش جہینی ففغور مت کرو

ترک مدعا کو حصول مدعا کا ذریعہ سمجھتے ہیں ـــ

ترک مقصد عین مقصد ہے اسے پر جسکو دل کا مدعا درکار ہے　　　آرزو ہے جو منزل مقصود پر نیک مطلب ہے مدعائے تمام

اسکے ساتھ کوشش اور سعی کی تلقین بھی کرتے ہیں ـــ　طلب ہے عقدۂ مشکل کو کھولے پر جو کوشش کی کمر یکبار باندھے

زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں ـــ

آب رواں ہے حاصل عمر شتاب رو پر لوح فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا　　　آزمایا ہوں در دو سر فکر دنیوی پر سب سے بے پروا ہوا عالم مجذوب ہے خوب

تاہم ترک دنیا کو لازمۂ سلوک نہیں سمجھتے ـــ

منحصر نہیں ہے گوشہ گیری پہ دلسے کبھو ہوس نکال　　　تکیۂ مخمل سرہانے رکھ پر لیکن آنکھوں سے اپنے خواب نکال

شوخی و ظرافت : ـــ سراج ایک زندہ دل شاعر ہیں وہ حلقۂ احباب میں باعث نشاط مجالس سماع مشاعروں اور محفلوں میں صدر اور نفوس مصنف محبوب الزمن بوڑھوں میں بوڑھے اور بچوں میں بچے تھے ان کا کلام شوخی و ظرافت کی چاشنی سے مملو ہے کہیں کہیں شوخی نے نہایت لطیف شکل اختیار کرلی ہے اور ابتذال سے تو ہر جگہ محفوظ ہے۔

لطیف شوخی :- زلف کا فر سیں لگی چھپنے نسیم مشک بو ؛ زاہدو بادِ خزاں ہے گلشن ایمان کا

دور آیا ہے چشم ساقی کا ؛ وقراب کب ہے پارسائی کا
جو کوئی لیوے چل جائے اسکی زباں ؛ ترا نام اسم جلالی ہوا

نہیں ہے حرمت مے کی خبر تجھے زاہد ؛ کہ میکشوں کو ہے معلوم احترام شراب
غیر دیدار اور مطلب نہیں ؛ مجکو بوس وکنار کی سوگند

چبھتی ہوئی باتیں :- چاہئے زاہدوں کو حجرہ تنگ
باغ عاشق ہے وسعت مشرب

عشق نہیں زاہدوں کی قسمت میں
حرف تقدیر کو نہیں تبدیل

غیر کو بار نہ دو اپنی گلی میں ہرگز
گلشن خلد میں کچھ کام نہیں خاروں کو

محراب بیچ سجدہ ریائی ہے زاہدو
ان ابروؤں کو دیکھ کے قامت کو خم کرو

دلبری بوالہوس کی حد سیں افزوں مت کرو
مفلس بے قدر کو یک پل میں قاروں مت کرو

ہے ذوق بادہ کشی زاہد ریائی کو
بھرو شراب سے شکل کتاب کا شیشہ

زلف کو لام سے تشبیہ دینا عام ہے۔ سراج نے "اس لام اور اسلام" کے درمیان جو ایہام پیدا کیا ہے نہایت دلچسپ ہے ؎

خم کیوں نہووے زاہد خشک اسکی زلف دیکھ
کافر نہ ہووے تو کرے اسلام کو سلام

مزے کا شعر سنئے۔ ؎ عاشقوں کو نہیں ہے نام سے کام
عشق بازی ہے میرزائی نئیں

معانی کی مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی سراج کا کلام شعریت کے معیار پر پورا اترتا ہے جیسی بندش، برجستگی، سلاست، روزمرہ کا استعمال، محاورہ بندی اور تشبیہات کی ندرت انکے کلام کے اہم اجزا ہیں۔

سلاست وبرجستگی :- ہوش عاشق کو سلامت کیوں رہے
لب بلا بالا بلا ابرو بلا

خون دل، بادہ گلرنگ، غذا لخت جگر
غم کے گھر میں ہے مرے عیش کی مہمانی آج

چشم بسمل لذتِ دیدار سیں محروم ہے
ہے نگاہ واپسیں شمع مزار انتظار

گل ترے رشک سے وو نیم ہوا
بسمل خنجر نسیم ہوا

کیا اس سرو قد نے گل کا وعدہ
قیامت پر رہا دیدار موقوف

محاورہ بندی :- طوق گلوے دل ہے زلف صنم کا ہر خم — مشہور یہ مثل ہے یک سر ہزار سودا

دام زلف ستم گر صیاد — عاشقوں کے گلے کا ہار ہوا

گلبدن نے دل لیا یک رنگ ہو — پھر تو کئی کئی رنگ دکھلانے لگا

یک بیک اپنی جھلک بتلا کے پنہاں ہوگیا — ٹک جھلاوا سا دکھا کر پھر چھپا یا الغیاث

حسن تشبیہ :- استعارہ و تشبیہ کی خوبی، باوجود اس سادگی کے، قابل داد ہے۔ حسن تشبیہ بعض جگہ ندرت کی حد کو پہنچا ہے۔

عیاں ہوتا ہے جیوں کہ سرو پانی کے کنارے پر — ہوا یوں جلوہ گر آنکھوں میں قد نو نہال اُس کا

اے آفتاب تری ظلمت جدائی میں — سراج آہ سحر کو چراغ شام کیا

رخسار پر صنم کے جو خال سیاہ ہے — وہ مردمک ہے حلقۂ گیسو کی چشم کا

مرے رونے پہ یار ہنستا ہے — اشک شبنم سنے ہے خنداں صبح

مستئ عشق اگر تجھے ہے سراج — شیشۂ چشم سیں شراب نکال

یا فلک کی آرسی میں ہے ہلال — یا کسی کا عکس ابرو لوناں

آخر میں چند فخریہ اشعار نقل کرکے اس دلچسپ تذکرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ خود سراج کی رائے اپنے متعلق یہ ہے۔

رام کرتا ہے ہر اک چشم غزالی کوں سراج — شعر پر سوز مرا نغمۂ داؤدی ہے

بوجھتا ہے وہ قدر شعر سراج — جو ادا فہم اور سخنداں ہے

اے سراج اب شعر تیرا یار کو آیا پسند — کیا ملا کچھ سحر ہے معنی نگاری میں تری

سراج اشعار تیرے کیا بلا ہیں — بھبوکے ہیں مگر سوز جگر کے

سراج از بس نزاکت ہے ہمارے شعر رنگیں میں — جو کوئی نازک طبیعت ہے اسے مرغوب ہوتا ہے

نواب درگاہ قلی خاں

سالار جنگ

اور

ان کی مرثیہ نگاری

از

میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔اے (عثمانیہ) سابق صدر بزم اردو



نواب درگاہ قلی خان سالار جنگ درگاہ

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ اور انکی مرثیہ نگاری

جس وقت شمالی ہند میں اُردو مرثیہ گوئی کا تخم بو یا جارہا تھا دکن میں یہ صنعت شاعری کافی ترقی کر چکی تھی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں نے مرثیہ گویوں کی صرف ہمت افزائی ہی نہیں کی بلکہ وہاں کے بادشاہوں نے بھی اعلیٰ درجہ کے مرثیے لکھے جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔

نواب درگاہ قلی خاں جن کے مرثیے ہم اس وقت اُردو ادب کے قدردانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں عہد آصف جاہ اول کے امرا میں سے ہیں۔ پیشہ ور شاعر نہیں تھے بلکہ ذوق سخن اور فطری رجحان نے انھیں شعر گوئی کی طرف راغب کیا تھا غزل قصیدہ اور رباعی وغیرہ کے ساتھ ساتھ مرثیے بھی لکھے جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے تک دکن میں مرثیہ گوئی جاری تھی اور دکنی سلطنتوں کے زوال سے یہاں مرثیوں کو زوال نہیں ہوا بلکہ اس زمانے میں دکن کا ہر پیشہ ور شاعر دوسرے اصناف سخن کے ساتھ مرثیہ گوئی یا اس سے متعلقہ مضامین میں بھی ضرور طبع آزمائی کرتا تھا چنانچہ اس عہد کے مرثیہ گویوں کے کلام اس وقت موجود ہیں اور ان کے حالات کے متعلق کچھ عرصہ سے اُردو زبان میں مضامین وغیرہ شائع ہوئے ہیں

(۲)

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں راقم کو ایک قلمی بیاض دستیاب ہوئی جس میں نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں کے مرثیے لکھے ہوئے ہیں۔ نواب موصوف کے رمصنفہ تذکرہ کے مقدمہ میں حکیم سید مظفر حسین صاحب نے اُن کے اُردو فارسی کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں جیسے غزل قصیدہ اور رباعی کے نمونے تو نقل کئے لیکن مرثیوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ اُنھیں مرحوم کا کوئی مکمل دیوان دستیاب نہ ہوسکا جو کچھ اشعار انہوں نے نقل کئے ہیں وہ مختلف تذکروں سے حاصل کردہ ہیں یا بیاض

جو خوش قسمتی سے مجھے دستیاب ہوئی نواب درگاہ قلی خاں کے مرثیوں کا مجموعہ ہے ان کی ترتیب تاریخ وار ہے یعنی جس زمانہ میں جو مرثیہ لکھا گیا اس کا سنہ تصنیف اس کے شروع میں لکھا ہوا ہے۔ اس طرح ۱۱۶۶ھ سے مصنف کے سنہ وفات یعنی ۱۱۸۰ھ تک چودہ سال کے مرثیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہت ممکن ہے ۱۱۶۶ھ سے پہلے بھی درگاہ قلی خاں نے مرثیے کہے ہوں اور جس طرح یہ بیاض دستیاب ہوئی ہے آگے چل کر ۱۱۶۶ھ سے پہلے کے مرثیوں کا مجموعہ بھی کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ بہر حال زیر نظر بیاض میں کل (۲۸) مرثیے ہیں جو (۷۴۸) اشعار پر مشتمل ہیں اور (۲۲) سلام ہیں جن میں (۴۳۶) اشعار ہیں۔ چونکہ یہ درگاہ قلی خاں کی ایک مستقل تصنیف ہاتھ آئی ہے جس میں اشعار کی کافی تعداد ہے اس لئے راقم نے خیال کیا کہ اس پر ایک مختصر سا مضمون لکھکر اس شاعر کا ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے اردو دنیا میں تعارف کرایا جائے۔

(۳)

نواب درگاہ قلی خاں کا تذکرہ "مرقع دہلی" حال ہی میں تاج پریس سے چھپ کر شائع ہوچکا ہے جس کے مقدمہ میں حکیم سید مظفر حسین صاحب نے مصنف کے تفصیلی حالات درج کئے ہیں اسلئے یہاں صرف تعارف کے طور پر ذیل کے مختصر حالات بیان کئے جاتے ہیں۔

نواب ذوالقدر ۲۹ رجب ۱۱۲۲ھ میں بہ مقام سنگمنیر پیدا ہوئے۔ ابتداءً گو اپنے والد خاندان قلی خاں کے زیر پرورش رہے مگر ان کی حقیقی تعلیم و تربیت حضرت مغفرت مآب نواب آصف جاہ بہادر کے زیر نگرانی ہوئی۔ قدرت کی طرف سے ایک خاص جوہر قابلیت عطا ہوا تھا نہایت ذہین اور ذکی الطبع تھے کچھ تو اس فطری اثر اور کچھ آصف جاہ بہادر کی تربیت کے فیضان سے سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے اکثر علوم و فنون سے بہرہ یاب ہوکر اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت کی چاشنی بھی تھی چنانچہ وہ جس بزم میں شریک ہوتے اسکو اپنا گرویدہ کرلیتے تھے۔ اس عہد کے دستور کے موافق فن موسیقی میں بھی درجہ مہارت و کمال حاصل تھا۔

۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی گئے۔ نادر شاہی سیلاب کے زمانہ میں آصف جاہ بہادر کے تحفظ کی خاطر جس سرفروشی اور جانبازی کا ثبوت دیا اسکے متعلق تمام تذکرہ نویس متفق اللفظ ہیں کہ وہ "قوت بشری سے باہر تھی" اس سے

انکی شجاعت وبہادری کی شہادت ملتی ہے۔ چار سال دہلی میں رہ کر ۱۱۵۵ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دکن کو مراجعت کی اور گھر پہنچنے کے بعد اس سفر کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ ایک تذکرہ کی شکل میں قلم بند کئے جو بارہویں صدی کی دہلی کے معاشرتی تمدنی۔ تاریخی اور ادبی معلومات سے مالامال ہے۔ یہ تذکرہ نہ صرف ادبی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ اہم تاریخی انکشافات کی بنا پر بھی

نواب درگاہ قلی خاں کو دیگر علوم وفنون کی طرح شاعری میں بھی کافی دخل تھا۔ نہ صرف اردو فارسی بلکہ عربی میں بھی نہایت اچھے شعر کہتے تھے۔ باوجود کثرت مشاغل کے مہینے میں دو تین مرتبہ اپنے باغ دلکشا واقع اورنگ آباد میں ایک علمی محفل منعقد کرتے جس میں شعراء اور علماء کو مدعو کیا جاتا۔ علمی مذاکرہ اور شعروسخن کی گرم بازاری رہتی۔ ایسی مجلسوں میں نواب ذوالقدر علاوہ غزل پڑھنے کے اکثر نہایت برجستہ فی البدیہہ اشعار بھی کہتے۔

غزل۔ قصیدہ۔ رباعی اور مرثیہ میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا چنانچہ اپنی پیدائش کی تاریخ کو خود نظم کیا۔ یہاں نمونے کے طور پر اُن کے اردو قصیدے سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر   سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر
زبان خامہ ہے اسکے بیان میں عاجز   ہے جس کا ذمہ کلفت حساب صد دفتر
غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع وشریف   غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر
تمام روز کمر بستہ سب غنی و دنی   ہے زیر بار دو آب غریب شام وسحر
اسی تردد افکار میں لگی تھی نیند   کہ ناگہہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر
کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیر نورانی   لطیف عنصر وخوش منظر و خجستہ سیر
کہا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے   ہے تیرے کام کا حامی امام جن وبشر
شہ سریر کرامت امیر کل امیر   ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن وملک تاج دار ملک وفلک   کہا ہے جسکو نبی نے کہ جیسے شہ سرور
سوائے اسکے کہوں کون شاہ مرداں ہے   خدا نے سیف دی اور دی رسول نے دختر

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے　　　کمینہ بندۂ درگاہ صاحب قنبر

مراد بندہ درگاہ زود ہے کہ کرے

ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر　　　(۴۳) اشعار

دکن میں نواب ذوالقدر اکثر عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے اور نہایت حسن وخوبی سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ چنانچہ اس زمانہ کی تاریخیں اور تذکرے اُن کے حسنِ عمل کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں۔
تقریبًا ساٹھ برس کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا اور مقبرہ سالار جنگی واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔

(۴)

درگاہ قلی خاں کے دکھنی مرثیوں اور سلاموں کے علاوہ دو عربی اور ایک فارسی سلام بھی ہیں۔ ان کی زبان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اُن کے مرثیوں میں پائی جاتی ہے زبان کی روانی ہے۔ عربی۔ فارسی یا دکھنی جس کسی زبان میں وہ کہتے ہیں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ ڈالئے کہیں تعقید یا ٹھوس ٹھاس نہ ملیگی۔ اس سے ان کی غیر معمولی قدرت بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ اشعار خود زبان حال سے کہتے ہیں کہ ان کا کہنے والا ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔
شستہ الفاظ اور برجستہ ترکیبیں جو سلیس کلام کے دو اہم جزو ہیں ان کے مرثیوں میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں خصوصًا بعض فارسی الفاظ اور ترکیبیں انہوں نے ایسی استعمال کی ہیں جن میں پڑھتے وقت ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھدے اور کرخت الفاظ جن کی موجودگی سے شعر کی لطافت بڑی حد تک زائل ہو جاتی ہے ان کے کلام میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

ان مرثیوں کی زبان میں جو ۱۱۶۰ھ سے ۱۱۷۲ھ تک کے دوران میں لکھے گئے فارسی اثر بہت زیادہ ہے۔ فارسی ترکیبیں فارسی الفاظ جابجا استعمال ہوئے ہیں اسکے بعد ۱۱۷۲ھ سے ۱۱۷۶ھ تک کے مرثیے ہندی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نہ صرف ہندی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ مرثیوں کے ہر بند میں ایک خالص ہندی زبان کا شعر شامل کیا ہے۔ آخری عمر کے کلام میں تناسب پایا جاتا ہے یعنی ۱۱۷۶ھ سے ۱۱۸۰ھ تک نہ فارسی الفاظ زیادہ ہیں نہ ہندی البتہ دکھنی محاورات کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ تفصیلی نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور ہندی کے مقابلہ میں دکھنی اثر ان کے کلام میں بہت کم ہے۔ بعض اشعار کی زبان اسقدر صاف اور

شستہ ہے کہ اگر زمانہ حال کے مرثیہ گویوں کے کلام میں رکھ دئے جائیں تو مشکل سے امتیاز کیا جا سکے۔ مثلاً :۔

قبر میں ہے ہے رسول اللہ بے آرام ہیں — حضرت کرار بھی ناشاد اور ناکام ہیں
انکے دل پر کیا مصیبت اور کیا آلام ہیں — فاطمہ کی نامرادی سنکے اور زینب کی یاس (مرثیہ نمبر ۱۰)

اس زمانہ کے عام خیال کے موافق مرثیہ گوئی سے درگاہ قلی خاں کا مقصد بھی صرف رونا اور رلانا تھا۔ اسی خیال کے مدنظر انہوں نے نہایت سادہ اسلوب اختیار کیا۔ کلام کو عام فہم بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اس سعی میں نہایت کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے فارسی اور اردو قصائد اور غزلوں میں جا بجا تلمیحات اور استعارات موجود ہیں لیکن مرثیوں میں صرف دو تین جگہ حسن تعلیل۔ استعارہ۔ تشبیہ۔ اور رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں جو لطف سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو :۔ حسن تعلیل :۔

پکھراج غم سے زرد و زمرد ہے زہر نوش — موتی کے دل میں چھید ہے نیلم سیاہ پوش
اس دکھ سے آتش دل یاقوت ہے خموش — مرجاں لہو و لعل بدخشاں لہو لہو (مرثیہ نمبر ۶)

تشبیہ :۔ چڑھا نیزہ پہ سر گرداں کرینگے — مثال گوئی اور چوگاں کرینگے (مرثیہ نمبر ۲)

استعارہ :۔ جب چلا لے شہ کا سر نیزہ پہ رکھ — آفتاب آیا ہے استقبال پر (سلام نمبر ۲)

رعایت لفظی :۔ سب اہلبیت مصطفےٰ رو رو پکاریں تلملا — اندھوں کی ہے لکڑی یہی اے کور دل مت کر جدا (مرثیہ نمبر ۱۵)

بعض القاب جو مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ حضرت علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے لئے استعمال کئے ایسے ہیں جن کو اب تک شاید ہی کسی نے استعمال کیا ہو۔ مثلاً :۔

نور بخش شمس و قمر۔ امیر حشر و نشر۔ نونہال بوستان ہل اتیٰ۔ چراغ شبستان اولیا۔ گل گلبن سخا۔ گل حدیقۂ احسان۔ فخر المکارم۔ مرآۃ صدق۔ بانیٔ نثار تین۔ آب و رنگ گلشن دین۔ نوگل گلزار احمد۔ شمس شجاعت منور ملت۔ ہمائے اوج فطرت۔

(۵)

چونکہ مرثیہ گویوں کا مقصد خود رونا اور دوسروں کو رلانا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے مرثیہ

پیش کیا جائے وہ ان کے تمدنی اور معاشرتی فضا میں رنگا ہوا ہو جب ہی وہ مرثیہ موثر ہو سکتا ہے۔ ایک ملک کی معاشرتی حالت کا نمونہ دوسرے ملک کے باشندوں کو اتنا موثر نہیں کر سکتا جیسا کہ خود ان کے تمدن کی سچی تصویر دل میں درد پیدا کرتی ہے۔ اُردو کے بہترین مرثیہ گو میر انیسؔ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن ان مرثیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ سے تقریباً ایک صدی قبل ہی اسی خیال کے مدنظر نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں نے واقعات کربلا نظم کرنے میں عربی طرز معاشرت کو ہندوستانی معاشرت کا جامہ پہنایا ہے وہ ایک مورخ کی حیثیت سے واقعات بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اس دردناک واقعہ کا اثر خود ان کے دل پر ہوا ہے وہی دوسروں کے دل میں پیدا کر دیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک اجنبی اور دور افتادہ ملک کے باشندے اور ان کے رسم و رواج کو وہ اس طرح پیش کریں کہ پڑھنے والے کو اپنے ہی ملک کے باشندے اور انہیں کے رسم و رواج نظر آئیں۔ درگاہ قلی خاں نے اس عرب رجال داستان کو جس طرح پیش کیا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر اپنے موضوع کو اپنی ہی فضا کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اور کس حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ اپنے بیکس فرزند کی شہادت اور مصیبت پر اسی طرح بین فرماتی اور انہیں جذبات کا اظہار کرتی ہیں جو ایک ہندوستانی عورت سے ایسے موقع پر ہوا کرتا ہے جہاں کہیں مصنف نے حضرت سیدہ کے بین نظم کئے ہیں سب اسی رنگ کے ہیں۔ حضرت قاسم کی شادی کے بیان میں جہاں عمامہ اور مقنع (جو خالص عربی پوشاک ہے) کا ذکر ہے وہاں مقامی رنگ پیدا کرنے کی خاطر سہرا اور کنگنا باندھے جانے کا بھی بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ عرب میں سہرے اور کنگنے کا رواج نہ اس وقت تھا اور نہ اب ہے۔ ان چیزوں کا ذکر صرف بیان کو موثر کرنے اور واقعہ کو زیادہ مانوس بنانے کے لیے کیا گیا ہے جو ہر شاعر اور بالخصوص مرثیہ گو کیلئے ضروری اور ناگزیر ہے

(۶)

نواب درگاہ قلی خاں کے زمانے تک مرثیوں کے لیے کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی تھی شمالی ہند میں سوداؔ کے بعد سے اُردو مرثیے صرف مسدس ہی کی شکل میں لکھے جانے لگے۔ اس سے پہلے دکن اور شمالی ہند میں عموماً مربع کی شکل میں مرثیے لکھے جاتے تھے اور کبھی بعض مرثیہ گو مخمس اور مثمن وغیرہ کی شکل میں بھی لکھتے تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں کے مرثیے بھی

مختلف شکل میں ملتے ہیں چنانچہ ہم ہر شکل کی مثال کا انتخاب ذیل میں پیش کرتے ہیں :۔

مربع :۔

(۱) ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو — صحرائے دلفگار کا داماں لہو لہو
سب دشت و کوہ و جنگل و میداں لہو لہو — وہ رزمگاہ شاہِ شہیداں لہو لہو
اے خاک پائے زائر درگاہ بوتراب — اس ماجرائے غم کا نہیں حشر تک حساب
کتنک کریگا قصہ ماتم کنیں کتاب — کاغذ لہو لہو و قلمداں لہو لہو (مرثیہ نمبر ۶)

(۲) جہاں سیں فاطمہ کو دیکھ روتے مصطفےٰ گذرے — نواسوں اور بیٹی پر نظر کر مبتلا گذرے
خدا معلوم میرے بعد ان پر ہائے کیا گذرے — ستم گذرے بلا گذرے مصیبت یا جفا گذرے
بہ تقبیل حریم کربلا محوِ تمنّا ہوں — بطوف بارگاہ آسماں خرگاہ شیدا ہوں
نہ کھاتا ہوں کہتا ہیں سگِ درگاہ مولا ہوں — ترے سر پا گر ہنگامۂ روز جزا گذرے (مرثیہ نمبر ۱۶)

مخمس :۔

(۱) اے فلک بے سر پڑا رن میں شہید ابن شہید — تختۂ تابوت اُسے تخت ریاست پر یزید
مضطرب آل نبی اولاد بوسفیاں کو عید — عقل و ہوش و فطرت و غیرت سوں میرے ہے بعید
اے فلک بے سر پڑا رن میں شہید ابن شہید

بندۂ درگاہ پر ہے التفات ہشت و چار — فضل سیں ان کے میسر ہے سعادت اور وقار
رشک سیں ہے حاسدوں کا دیدۂ پرخوں دلفگار — یا علی اعدا کوں کیجو جلد زیرِ ذوالفقار
شان میں نازل ہوا ہے جس کے انزلنا الحدید

(۲) پھر ہاۓ غمِ سم کہ جان و جگر کوں کیا کباب — امڈی ہے فوج غم کی نہیں ہے گی دل میں تاب
ہیہات خاندان نبوت پہ کیا عذاب — سب اہلبیت رو کے کہیں یا ابوتراب
فرزند نامدار کی لیتا خبر شتاب

مسدس :—

کہی خاتوں رسول اللہ آؤ　　گھر اہلبیت کا اجڑ ا لباؤ
دکھیاری ماں سیں بچوں کو ملاؤ　　ہنیں آتے نظر ہے ہے بتاؤ
الٰہی آتش این غم بہ جان است
شرر در پنبہ زار استخوان است
الٰہی سن سوال اس ملتمس کا　　سگِ درگاہ اس کا ہے نہ کس کا
جہاں ہے صاحب اس کا قبلہ اس کا　　وہاں جلدی سیں نوکر کو لیجاؤ
الٰہی آتش این غم بہ جان است
شرر در پنبہ زار استخوان است　　(مرثیہ نمبر ۲۶)

(۲) کہتے تھے یا محمدؐ ال اہلبیت سارے　　ہیں کربلا میں پرخوں شاہِ نجف کے پیارے
اُن بیکسوں کوں ظالم دلبر جو تھے تمھارے　　بیداد سیں کھپائے لب تشنگی سیں مارے
نبی تمھارے نبس کوں ظالم مار کھپائے
پیاس پیاس کر جی دئے اور نیر بنا نرسائے

درگاہِ حق کا ہیگا وہ شاہ برگزیدہ　　جیوں سرمہ کرو پاہے جس کی صفائے دیدہ
امت کے ہاتھ سیتی ہے جاں بلب رسیدہ　　ہے جنتی جو کوئی اُس پہ دل اپنا وارے
مکھ منا ہی ہے جو خاک چرن حسین
یہ بندہ درگاہ کا آکھن کرے دن رین　　(مرثیہ نمبر ۲۸)

مثمن :—

(۱) نکلا مصیبت کا ہلال اے خاطر خوشتنر کدہر　　اس درد وغم کے سوگ کو اتہر کدہر جید رکدہر

حضرت حسن بھائی کدھر خیر النسا مادر کدھر / کلثوم اور زینب کدھر اصغر کدھر اکبر کدھر
سگرا کنبا کٹھم کہاں توری سر کے کیس / بیری با جا پہنچ کر مارا ہائے بدیس
کجا است حضرت خیر النسا کجا حیدر / کہ جامہ چاک کنند از پئے عزائے پسر

درگاہ اقدس کا طواف ہے منتہائے مدعا / عاصی کوں خاک کربلا ہر دم اشد التجا
اے صاحب حاجت روا جلدی سیتی کر کوں بلا / اس تفرقے کوں دور کر صاحب کدھر نوکر کدھر
سرن گسائیں کے محل اوہک تپستیا جان / شاہ تمھارے اد ہیں کوں یہی ہے ارمان
کمینہ بندۂ درگاہ سید الشہدا / برائے خدمت جاروب روز و شب بدعا (مرثیہ نمبر ۱۲)

(۴)

خلق میں پھر ہے جو شور ماتم / سوگ میں پھر جو ہوا ہے عالم
مشتعل آتش غم شعلۂ ہم / کیا مگر ماہ محرم ہے علم
ماہِ غم آمد و برخواست فغاں / دیدہ و دل شدہ گریاں بریاں
اِنّ فی الخلق بکاءً وحزن / لِعلیٍّ و حسینٍ و حسن

طوف درگاہ حسین ابن علی / آرزوئے دل درگاہ قلی
اے خدا جلد غلام ازلی / طوف میں جا کے کرے سر کو قدم
ہست امید کمیں بندہ ہمیں / خاکِ درگاہ شود نور جبیں
اِنّ فی الخلق بکاءً وحزن / لِعلیٍّ و حسینٍ و حسن (مرثیہ نمبر ۱۷)

(۵)

نواب درگاہ قلی خاں کے سلاموں کا موضوع بجز ہدیہ درود و سلام کے اور کچھ نہیں۔ کہیں مجموعی حیثیت سے محمد و آل محمد پر درود بھیجتے ہیں اور کہیں نام بہ نام چودہ معصومین کی خدمت میں سلام کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ کسی سلام میں واقعات کربلا کا ذکر نہیں اور نہ کسی کی شہادت کا حال درج ہے۔ بلکہ ایک قسم کی نعتیہ نظم ہے جس میں محمد و آل محمد کی مدح سرائی کی گئی ہے

یہ طریقہ آج کل کی روش سے بالکل جدا ہے۔ میر خلیق (انیس کے والد) اور میر ضمیر کے زمانہ تک سلام اسی طرح کی نعتنیہ نظم ہوتی تھی۔ غالبًا ان دونوں نے پہلی دفعہ اسکو وسعت دی اور حمد و نعت کے ساتھ بینیہ اشعار بھی داخل کئے۔ مگر اتنک بھی بعض مرثیہ گو وہی پرانی طرز کے پابند ہیں۔ عمومًا سلام میں بینیہ اشعار نہیں لکھتے۔

نمونہ کے طور پر نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں کا ایک سلام درج ذیل کیا جاتا ہے:—

ادب سے فاتحہ پڑھ کر کہو نبی پہ سلام　　نبی کے قوت بازو علی ولی پہ سلام

جناب اقدس خاتون حشر پہ صلوات　　شہید جرعہ زہر ہلاہل پہ سلام

لڑے ہیں جا کے ہزاروں سے جو یا تن تنہا　　شہ سریر شجاعت مہابلی پہ سلام

یتیم و بیکس و مظلوم عابد سجاد　　وہ نور چشم و جگر گوشہ علی پہ سلام

محیط علم لدنی محمد باقر　　پناہ روز قیامت کی کھلبلی پہ سلام

امام جعفر صادق منور ملت　　شعاع آئینہ دین صیقلی پہ سلام

امام موسیٰ کاظم قسیم نار و نعیم　　بہار نادعلی و سینجلی پہ سلام

امام ثامن ضامن گل ریاض رضا　　شہ سریر ریاضت زکی رضی پہ سلام

امیر ملک سخاوت شہ جواد کریم　　تقی و متقی و مہتدی زکی پہ سلام

گل حدیقہ احساں امام ہر دو جہاں　　بہار باغ ولایت علی نقی پہ سلام

حسام لشکر و صمصام خون فشاں مصاف　　ہژبر بیشہ اسلام عسکری پہ سلام

امام قائم بالحق خلیفہ رحمان　　امیر ہادی و مہدی و مہتدی پہ سلام

ادب سے بندہ درگاہ بھیجتا ہے مدام
جناب اقدس اثنا عشر ولی پہ سلام

میر نوازش علیخاں شیدا

از

میر سعادت علی رضوی ام۔ اے عثمانیہ

سابق صدر بزم اردو و سابق مدیر مجلہ عثمانیہ

مرقع سخن



نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی ۔

دی حیدر آباد پرنٹنگ ورکس

میر نوازش علیخاں شیدا

میر نوازش علی نام۔ شیدا تخلص۔ سنہ ولادت و وفات کا ٹھیک طور پر علم نہ ہوسکا معلوم ہوتا ہے کہ شیدا بحیثیت شاعر کے نہ اپنی زندگی میں مشہور ہوئے اور نہ مرنے کے بعد۔ اسلئے کہ باوجود بارہویں صدی کے شاعر ہونے کے اس عہد کے تمام تذکرے انکے حالات سے خالی ہیں۔ ہم نے تقریباً بیس ایسے تذکرے اسی سلسلہ میں دیکھہ ڈالے لیکن صرف دو میں انکا ذکر ملا وہ بھی ناکمل اور غیر تشفی بخش۔

طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق میں جس کا سنہ تالیف ۱۲۰۱ھ ہے لکھا ہے کہ:۔ "سید نوازش علیخاں خلف رشید مرتضیٰ خاں ایلچی ایران کہ برادر نواب محمد خاں بود از اوست":۔

آہ گر باغ سے وہ سرو خراماں گذرے — اشک قمری کا گلستاں منے طوفاں گذرے

زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر دکنی شاعر کا نہیں یا اگر ہے تو بعد کے زمانے کے کسی شاعر کا ہوگا اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سید نوازش علیخاں مصنف روضۃ الاطہار "شیدا" ہی ہیں نہ معلوم شوق نے نام کے ساتھ تخلص کیوں نہ لکھا۔

البتہ اسی عہد کا ایک اور تذکرہ "ریاض حسینی" تالیف خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت جس کا سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ ہے دفتر نظامت ملکی و مال حیدرآباد میں ہماری نظر سے گذرا جس میں شیدا کا ذکر اس طرح ہے:۔ "نوازش علیخاں شیدا مسکن و ماوائش بحیف بنیاد حیدرآباد و بہ میر سامانی بلدہ مذکور مامور است اکثر مدح بادشاہ شہیدان دشت کربلا می گوید و در نتیجہ شفاعت خود از آن دستاویزی می جوید از اوست":۔

چمن کی گلگشت کو نکلتا ہوں گھر سے جب خوش خرام نکلا — تیری بھواں کی ادا کے دیکھے ہلال کرتا سلام نکلا

اگرچہ کہنے تجھے قمریاں سب چمن میں انتراف سرسائیں — جب ہم نے تحقیق کرکے دیکھے تمہارے قد کا غلام نکلا

نوٹ۔ تیسرے مصرع میں قرین قیاس یہ ہے کہ "آزاد" کا لفظ ہوگا جیسے کاتب کی غلطی نے "انتراف" بنا دیا کیونکہ سرو کی

مناسبت اور چوتھے مصرع میں لفظ 'غلام' کے لحاظ سے 'آزاد' کا لفظ ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

'ریاض حسینی' کی عبارت سے ہمیں اتنا وثوق ہوتا ہے کہ شیدا حیدرآباد ہی کے رہنے والے تھے اور علاوہ مرثیوں اور مذہبی نظموں (جنہیں قصیدے اور مثنویاں شامل ہیں) کے کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے جس کے دو شعر مولف نے بطور نمونہ کے پیش کئے ہیں۔

(۲)

عہد اور ملکی خدمات

شیدا بہ نسبت شاعری کے درباری تعلق کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے چنانچہ 'تذکرہ نوتت' 'گلزار آصفیہ' مولفہ خواجہ غلام حسین خان ۱۲۶۰ھ 'حدیقۃ العالم' مولفہ میر عالم اور 'اخبار نظام علیخاں' ان تمام تاریخی کتابوں اور تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں بہادر کے عہد سلطنت میں نوازش علیخاں شیدا خانساماں یا بالقول بعض میر ساماں کے ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ آصفجاہ ثانی نے جب اطراف واکناف کی شورشوں کو رفع کرنے کے بعد اورنگ آباد سے حیدرآباد کی طرف اپنا دارالسلطنت منتقل کیا اور یہاں کی قدیم عمارتوں کی ترمیم اور نئے محلوں کی تیاری شروع ہوئی تو نوازش علیخاں شیدا زیادہ تر اس تعمیر و ترمیم کے نگران کار رہے۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ شیدا کے زیر اہتمام ایک محل تیار ہوا جس کا نام 'نوازش محل' رکھا گیا۔ یہ محل اب باقی نہیں رہا۔

تاریخ آصفجاہی مولفہ محمد بدیع الدین علی ۱۲۳۹ھ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۲ھ میں شیدا کی نگرانی میں حوض و بنگلہ تیار ہوا جس کے صلہ میں جشن نوروز کے موقع پر آصفجاہ ثانی نے دوشالہ ملبوس خاص اور دستبند مرصع شیدا کو سرفراز فرمایا۔ اسی تلاش کے سلسلہ میں دفتر نظامت دیوانی ومال سے ایک برآورد برآمد ہوئی ہے جو تیاری 'نظام ساگر' کے متعلق ہے۔ اور نظام علیخاں بہادر کے عہد میں داروغہ نعمت نواز خاں نے مرتب کی ہے۔ اس برآورد پر ایک مہر نوازش علیخاں بہادر کی ہے جس میں ۱۱۷۱ھ پڑھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام علیخاں بہادر کے تخت نشین ہونے کے قبل ہی سے شیدا عہدہ خانساماں پر مامور تھے کیونکہ نظام علیخاں بہادر ۱۱۷۵ھ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔ تاریخ آصف جاہی میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ سالگرہ کے موقع پر "نوازش علیخاں و قطب الدین خاں را بہ عطائے جیغہ و کنٹھی مالہ مروارید سرفراز ساختند"۔ دوسری جگہ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۴ھ کے سالگرہ کے دربار میں "مجاہد الدولہ و نوازش علیخاں را دو رقم جھپنہ عطا فرمودند"۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۴ھ تک شیدا زندہ تھے

ان متذکرہ سنین اور واقعات کے لحاظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نوازش علیخاں شیدا ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے اور ۱۲۱۱ھ کے قریب انتقال کیا۔ کیونکہ ۱۱۶۱ھ میں نظام ساگر کی برآورد پر جب انکی مہر ہے اور یہ خانسامانی کے عہدہ پر فائز تھے تو اسوقت انکی عمر پچیس چھبیس سال سے کم نہ ہوگی اور ۱۲۰۱ھ تک جب وہ زندہ تھے تو ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا ہوگا۔

'اخبار نظام علیخاں' ایک فارسی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش علیخاں کے اکثر عرائض آصفجاہ ثانی کی نظر سے گذرتے تھے چنانچہ لکھا ہے کہ فتح نرمل کی خوشی میں شیدا نے نذر گذرانی تھی "عرضی مرسلہ نوازش علیخاں بہادر با ہفت روپیہ نیاز فتح نرمل (۱۱۹۶ھ) از نظر مبارک گذشت" دوسری جگہ ایک اور عبارت اسی طرح لکھی ہے:- "غرہ محرم الحرام ۱۱۹۶ھ اول روز بکسی یاد نہ فرمود۔ عرضی مرسلہ نوازش علیخاں بہادر از نظر انور گذشت"۔ ان عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۶ھ سے قبل شیدا کو 'خان بہادر' کا خطاب مل چکا تھا لیکن دفتر نظامت دیوانی و مال میں فہرست خطابات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آصفجاہ ثانی کے عہد میں نوازش علی نام کے تین آدمیوں کو 'خان بہادر' کا خطاب ملا ہے:-

(۱) نوازش علی عرف محمد امین بیگ خطاب خانی و بہادری و منصب سہ ہزاری عطا ہوا لیکن سنہ عطا کا اندراج نہیں ہے۔

(۲) میر نوازش علی ولد میر عبداللہ۔ پانصدی منصب و خطاب خانی۔ ۲ ذیقعدہ ۱۱۸۳ھ شاہ عالم بدستخط نواب غفرانمآب۔ اسی سنہ میں انکے بھائی میر شریف علیخاں کو بھی خطاب خانی و منصب عطا ہوا۔

(۳) میر نوازش علی اقربائے اعتصام الملک عباس علیخاں عرض بیگی۔ یکہزاری منصب و خطاب خانی و بہادری عطا ہوا، ۲ محرم ۱۲۰۴ھ بدستخط آصفجاہ ثانی

ان تینوں میں قرین قیاس یہ ہے کہ دوسرے نوازش علیخاں ہی شیدا مصنف روضۃ الاطہار ہیں۔ کیونکہ شیدا سید تھے اور سادات کے نام کے ساتھ اکثر میر لکھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ آصفجاہ ثانی کی دستخط سے خطاب و منصب عطا ہونا اس بات کی تصدیق ہے کہ یہ نوازش علیخاں شیدا خانسامان سرکاری ہی ہیں۔ پہلے نوازش علی خاں کا عرف بتا رہا ہے کہ وہ سادات سے نہیں تھے اور نہ انکے نام کے ساتھ 'میر' کا لفظ ہے۔ تیسرے صاحب اس لئے شیدا قرار نہیں دئے جاسکتے کہ یہ بہت بعد کے آدمی ہیں نظام علیخاں بہادر کے عہد سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ اگر دوسرے نمبر کے نوازش علیخاں کو شیدا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیدا میر عبداللہ کے فرزند تھے اور صرف خانی کے خطاب سے سرفراز تھے۔ حالانکہ 'اخبار نظام علیخاں' کا مولف ان کو ۱۱۹۶ھ ہی میں 'خان بہادر'

لکھا ہے۔ بہرحال یہ امر مشتبہ ہے کہ انہیں خطاب کب اور کس سلسلہ میں عطا ہوا۔

(۳)

مذہبی خدمات معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی عاشور خانہ حیدرآباد سے شیدا کا تعلق عرصے تک رہا اور اس کی ترقی میں انہوں نے کافی حصہ لیا کیونکہ اکثر تاریخی کتابوں میں عاشور خانہ مذکور کے ذکر کے سلسلہ میں شیدا کے کچھ نہ کچھ حالات ملتے ہیں۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ بادشاہی عاشور خانہ جسے محمد قلی قطب شاہ نے چھیاسٹھ ہزار کے صرفے سے تیار کیا تھا اور عبداللہ قطب شاہ نے اپنے عہد میں رنگ آمیزی اور آئینہ کاری سے زینت دی تھی اورنگ زیب کی فتح کے بعد بالکل ویران کر دیا گیا اور سرکاری گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا تھا۔ آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں بہادر کے عہد حکومت میں نوازش علیخاں بہادر شیدا کی سعی و کوشش سے سرکاری طور پر اسکی مرمت و درستی کی گئی اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ اخراجات کے لئے مقرر ہوئے۔ شیدا کو اس عاشور خانہ کا منتظم بنایا گیا اور علم بھی استادہ کئے جانے لگے۔ چنانچہ جب اسکی ترمیم ختم ہوئی تو شیدا نے اندرونی رواقوں اور صدر دروازہ کی تاریخیں کہیں جو اب تک اپنی اپنی جگہ کندہ کی ہوئی موجود ہیں۔ رواق پر کی تاریخ:۔ (۱) چوں نظام الملک آصف منزلت۔ کرد از بہر حسین توقیر او۔ ہست این قدسی مکان آل امام۔ کہ بفرقاں آمدہ تطہیر او

گفت ہاتف سال تاریخ چنیں   کرد آصف جاہ ما تعمیر او
۱۱۷۹ھ

(۲) بہر احیائے طراز این مکان تدبیر کرد   در دل شرفا اسد خالق چو این تاثیر کرد
عہد آصف جاہ ثانی آں شہ ملک دکن   لامکاں جائے امام ما کہ او تعمیر کرد
۱۱۷۹ھ

صدر دروازہ پر کی تاریخ یہ ہے:۔ باب فیض امام عالمیان
۱۱۷۹ھ

منتظم عاشور خانہ کی حیثیت سے شیدا نے عزاداری و مرثیہ خوانی کو بہت فروغ دیا چنانچہ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ ارسطو جاہ کی رحلت تک (یعنی سنہ ۱۲۱۹ھ تک) مرثیہ خوانوں کی جماعتیں بڑے زور و شور سے تیار ہوتی تھیں چنانچہ سرکاری جماعتیں متفرق تھیں جن کے داروغہ پہلے نوازش علیخاں شیدا تھے ان کے بعد یہ عہدہ حکیم حمایت اللہ خاں کو ملا۔ یہ مرثیہ خوانوں کی جماعتیں یکے بعد دیگرے ایک خاص راگ میں مرثیے پڑھا کرتی تھیں۔ ان میں ایک پڑھنے والا اور متعدد اسکے جوابی ہوتے تھے۔ اس قسم کی جماعتیں اب بھی حیدرآباد میں موجود ہیں اور اس قسم کی مرثیہ خوانی کو "دنگل" کہتے ہیں۔ حسینی علم اور شاہی عاشور خانہ میں محرم میں اب تک دنگل ہوتے ہیں۔ عاشور خانہ شاہی سے

انتظام کے علاوہ "نعل مبارک" کے علم کا انتظام بھی شیدا ہی کے سپرد تھا چنانچہ "صولت عثمانیہ" میں لکھا ہے "جب محمد قلی قطب شاہ کے وقت حیدرآباد کی آبادی ہوئی تو اسنے قلعہ سے اس علم (نعل صاحب) کو لاکے حیدرآباد میں اپنے محلسرا کے ایک جانب مکان میں رکھ کر محرم میں استادہ کرنے لگا۔ قطب شاہی حکومت تک وہ وہیں استادہ ہوا کرتا تھا۔ میر نظام علیخاں بہادر کی عہد حکومت میں ارسطو جاہ مدارالمہام اور نوازش علیخاں متخلص شیدا کی سعی سے یہ علم چارکمان کی شمالی جانب جہاں اتک موجود ہے ایک مکان میں رکھا گیا اور محرم میں یہیں استادہ ہونے لگا"

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے گلزار آصفیہ اور حدیقۃ العالم میں لکھا ہے کہ عاشورخانہ شاہی کے اخراجات کے لیے بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کئے گئے تھے لیکن اس زمانہ کے اسناد جاگیر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف تین ہزار سات سو پچیس روپیہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی جو سنہ ۱۲۴۵ ف تک بحال رہی چنانچہ دو مختلف اسناد میں (جو اسوقت دفتر نظامت دیوانی و مال میں محفوظ ہیں) اس کا ذکر ہے:-

(۱) پہلی سند میں لکھا ہے ایکہزار چھ سو روپیہ اخراجات عاشورخانہ بادشاہی مقرر کیے گئے اور یہ عہدہ نوازش علیخاں بہادر تفویض کئے گئے (سند عطا کا داخلہ نہیں ہے)۔

(۲) دوسری سند ۱۱۶۱ھ کی ہے جس میں لکھا ہے کہ دو ہزار ایکسو پچاس روپیہ بجہت اخراجات عاشورخانہ عطا کئے گئے۔ منتظمی عاشورخانہ کا عہدہ اتک ان کے ورثا میں چلا آرہا ہے لیکن جاگیرات بحال نہیں ہیں۔ چنانچہ موجودہ منتظم عاشورخانہ میر محمد علی صاحب شفیق ہیں جو شیدا کو اپنا جد اعلیٰ بتاتے ہیں۔

(۴)

تصانیف | روضۃ الاطہار۔ یہ مشہور کتاب بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے جنکے موضوع پنجتن پاک اور شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ اسکا سنہ تصنیف ۱۱۶۳ھ ہے اسکے اکثر نسخے مختلف خانگی کتب خانوں میں ملتے ہیں سب سے قدیم نسخہ جس کا سنہ تصنیف اور کتابت ایک ہے عالیجناب نواب سالارجنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے اس کتاب کی تیاری میں تین ماہ بیس یوم صرف ہوئے جس کا اظہار مصنف نے اس طرح کیا ہے:- اگر ایام تیاری کے چاہو — عدد نام "علی" کے کر نکالو

تاریخ تصنیف بھی خود مصنف ہی نے اس طرح کہی ہے:- ہوا جب ختم یہ مضمون ماتم — کہا تاریخ ہاتف "مجلس غم" (۱۱۶۳ھ)

کیا چاہو تم اسانی سے از بر — ایکبارہ سو پہ سن اتمانتہ تہتر

اس قسم کی متعدد کتابیں اس سے پہلے بھی لکھی گئیں لیکن ان میں بالعموم دس فصلیں ہوتیں اور اُن کے نام "دہ مجلس" ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ کتابیں صرف محرم کے ابتدائی دس دنوں میں پڑھنے کیلئے لکھی جاتی تھیں۔ "روضۃ الاطہار" بھی اسی صنف کی کتاب ہے مگر اسکو اس قسم کی جملہ کتابوں میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ اسکی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:—

پہلی خصوصیت۔ "روضۃ الاطہار" ولی اور فضلی وغیرہ کی دہ مجلسوں کی طرح کسی فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ نوازش علیخان شیدا کی ذاتی تصنیف ہے جس کا اظہار مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے:—

ہوا ایکدن مجھے الہام از غیب — کہ توں حسنین کا شیدا ہے لاریب ۞ پڑا تج مرثیوں کا جگ میں ہے دھوم — محباں کے گلا یا دل کوں جیوں موم
کتاب یک توں بنا ہندی زباں سوں — اتھیاں عالم کی کرا نجواں سیں جیوں ۞ کر میں اس سعادت پر بندھا ہت — کتابوں کوں منگا تاریخ کی سب
لکھا احوال سارا بے کم و کاست — مدد حسنین سیتی کر کے درخواست

اس لحاظ سے "روضۃ الاطہار" کی اہمیت دوسری "دہ مجلسوں" کے مقابلہ میں بہت بڑھ جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت۔ مصنف کے معلومات کا ماخذ تاریخی کتب ہونے کی وجہ سے انہوں نے صرف حالات شہادت ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ پنجتن پاک علیہم السلام کی ولادت کے واقعات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں معجزے اور روایتیں بھی نظم کی ہیں۔ اور دہ مجلسوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اب یہ محض محرم میں پڑھنے کیلئے نہیں رہی بلکہ اسمیں ایک عام دلچسپی پیدا ہوگئی ہے جو اسے صرف فرقہ امامیہ تک محدود نہیں رکھتی۔

تیسری خصوصیت۔ اس سلسلہ کی کتابوں میں جو "دہ مجالس" کہلاتی تھیں اور عموماً مثنوی کی بحر میں لکھی جاتی تھیں "روضۃ الاطہار" آخری کتاب ہے۔ اسکے بعد مجالس کی منظوم کتابیں شاید ہی لکھی گئی ہوں کیونکہ مرثیوں کا رواج بڑھتا جارہا تھا جن کی شکلیں۔ مربع مسدس۔ یا مخمس پر مشتمل ہوتی تھیں اسکے علاوہ نوازش علیخاں شیدا (جو آصفجاہی عہد کے ابتدائی زمانے کے شاعر ہیں) کے بعد کچھ عرصہ تک دکن میں مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کا زور کم ہوگیا تھا۔ مرثیہ گوئی کی طرف بہت کم شعراء کا رجحان رہا۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے۔

چوتھی خصوصیت۔ لسانی خصوصیت کے لحاظ سے بھی یہ زبان دکن کی آخری کتابوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی تصنیف کا وہ زمانہ ہے جب کہ دکن میں شمال سے شاعروں کی آمد و رفت شروع ہوگئی اور یہاں کی تحریری زبان شمالی اثر کے تحت بدلنے لگی۔ دکنی خصوصیتیں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں اور اردویت کا عنصر بڑھنے لگا۔

اس حیثیت سے جب تاریخ ادبیات اردو کے مورخ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ دکن کی علمی زبان اپنے زوال کے زمانہ میں کس قسم کی تھی اور کن خصوصیات کی حامل تھی تو انہیں اس کتاب (روضتہ الاطہار) کا ضروری مطالعہ کرنا پڑے گا۔

یہ کتاب دکن کے تین سو سالہ عظیم الشان اردو ادب کی آخری کڑی ہے اور جب دکنی اردو کے قدیم ترین کارنامے مثلاً "نظام نامہ" "رسائل شاہ برہان" "قطب مشتری" "کلیات محمد قلی قطب شاہ" وغیرہ پر اردو کے بڑے بڑے محققین تحقیقات کر رہے ہیں اور ان قدیم ادبی شاہ کاروں کو موجودہ ادبی دنیا سے روشناس کرا رہے ہیں تو ضروری ہے کہ زبان کے تقابلی مطالعہ کیلئے اس سلسلہ کی آخری کتاب پر بھی نظر ڈالی جائے۔ روضتہ الاطہار کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے

اعجاز احمدی — یہ ایک طویل اردو مثنوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ روضتہ الاطہار سے اس کا حجم زیادہ ہے اور اس کے چودہ سال بعد لکھی گئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں بھی اسکا ایک نسخہ دستیاب ہوا لیکن اس نسخہ کے ابتدائی اوراق نہیں ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں بھی اعجاز احمدی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جسکے خاتمہ پر "جلد دوم" لکھا ہوا ہے حالانکہ یہ جلد صرف آنحضرت کی مکہ سے ہجرت تک کے واقعات پر مبنی ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کا نسخہ ہجرت کے بعد کے حالات سے شروع ہوکر آنحضرت کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شید انے دراصل اس کتاب کو کئی حصوں میں تقسیم کیا تھا کیونکہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کے آخر میں ان کے تخلص در خاتمہ کا شعر بھی ہے اور "تمام شد جلد دوم اعجاز احمدی" لکھا ہوا ہے۔

اے شید اقلم پر ہے یہ اضطراب۔ کہ منزل کوں مقصد کے پہنچے شتاب ٭ بھلا ہے توں کر اسکی مطلب کا کام۔ کروڑوں سیں کہنا نبی پر سلام

یہ نسخہ بھی ناقص الاول ہے لیکن آخر میں چند ابتدائی اوراق شامل ہیں۔ حمد کے بعد نعت میں بھی ایک شعر انکے تخلص کا ملتا ہے :۔

اے شید ا تجھے یہ قیافہ کہاں   کرے نعت ختم النبی کا بیاں

نعت کے بعد کتاب کی وجہ تصنیف تمہید میں اس طرح بیان کی ہے :۔

کہ اے نخل بند ریاض سخن   ترے شعر کا دھوم ہے چو کدھن   بہت نعت کے توں قصائد کہا   معطر و ماغ سخن کوں رکھا

تو کر مثنوی معجزوں کی تمام   رکھا گلشن ایمان کر اوسکا نام   جناب رسالت کا سب ماجرا   سیا میں مفصل گیا ہے لکھا

عربی ہے یا فارسی کا کلام   سمجھ اسکوں سکتے نہیں ہیں عوام   توں ہندی زباں میں اگر کہیگا   سبھی پڑھ اسے ہوئیں گے بہرہ ور

کیا اس میں کوئی نہیں اتنا فکر   کہ یہ فکر ہے فی الحقیقت ذکر   یہ دولت نہ تھی قسمت میں میرے لکھی   سمجھ عین افضال حق ہے یہی
منگا کر سیر کی وہیں سب کتاب   روایات اصحہ کو کر انتخاب   لکھا ابتدا سیں میں تا انتہا   نہو تے دیا فوت کوئی مدعا
یہ اعجاز ہے احمدی سر بسر   کیا میں نے موسوم اس نام پر   ہے بحر تقارب میں یہ مثنوی   ملے قرب قاری کتیں معنوی
ہے مصرع ہر یک اسکا سرو عدن   ترو تازہ سر سبز رشک چمن   ہر یک بیت جیوں بیت فردوس ہے   نہ سمجھے اگر کوئی تو افسوس ہے

ہے اعجاز خیر البشر یہ تمام   وگر نہ میں کیا اور میرا کلام

جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں مثنوی کے ختم پر تخلص کا شعر اور چند دعائیہ اشعار حسب ذیل ہیں :—

اے شیدا ہے مضمون یہ درد ناک   کیا صبر اپنے گریباں کو چاک   کہاں تاب لاوینگے سن مومناں   بھلا ہے توں کر ختم روتا بیاں
آلہی بہ حق رسول کریم   دے سامع کتیں اسکی اجر عظیم   قیامت کا ہے روز وہ پر نہیب   کر ہم عاصیوں کو شفاعت نصیب
محباں کر اول انکہوں سیں وضو   کہ جس سیں ملے حشر میں آبرو   کروڑوں درود اور کروڑاں سلام   وہ روح مقدس پہ بھیجو مدام

اعجاز احمدی کی زبان بہ نسبت روضۃ الاطہار کے زیادہ صاف ہے اور اسلوب میں روانی معلوم ہوتی ہے۔ ہم اعجاز احمدی کے چند اشعار کا اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے اسکے طرز بیان اور زبان کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے جنگ بدر کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں

اے ساقی مجھے دے توں جام ہلال   کہ ہے بدر کی جنگ کا اب خیال   نہ وہ جام جس سیں ہوئے خمار   کرے ملکہ اسرار کا راز دار
قلم کا یہ میری ہلالی نہ انس   اسے بدر کی فتح کا ہے تلاش   سنو اے محباں نصرت شعار   ہوا بدر کا کس طرح کار زار
کہ پہنچی نبی کوں خبر ناگہاں   کہ نکلا ہے کعبہ سیں یک کارواں   گراں جنس ہے سات اوسکی تمام   وہ جہنیں جانے کتیں ملک شام
ابوسفیاں ہے اس کارواں میں امیر   ہوئے ہیں قریش اسکے کئی یک شریر   سنے یہ خبر جب حبیب اللہ   کئے حکم تیار ہووے سپاہ
صحابی ہو مستعد آئے تیہی   چلے آپ تشریف لیکر نبی   ابوسفیاں کوں پہنچی ہے جا کر خبر   کہ لیکر صحابیوں کوں خیر البشر
کمر باندھ کر کینہ خواہی پہ تنگ   نکل آئے ہیں شہر سیں بہر جنگ   یہ سنتے ہی سفیاں ہوا خوفناک   سٹا ہوش کے سیس پر لیکے خاک

گلشن ایمان | اعجاز احمدی کے دیباچہ میں (جس کے چند اشعار ہم نے اوپر نقل کئے ہیں) شیدا لکھتے ہیں کہ انہوں نے قصائد نعتیہ کے علاوہ آنحضرت اور آئمہ علیہم السلام کے معجزات جمع کر کے مثنوی کی شکل میں نظم کئے تھے جس کا نام گلشن ایمان رکھا تھا

لیکن نہ تو 'قصائد نعتیہ' کا مجموعہ ہی ابتک دستیاب ہوا اور نہ 'گلشن ایماں' کا کسی کتب خانہ میں پتہ چلا۔ شیدا کے تمام تصانیف میں صرف روضۃ الاطہار ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے اکثر نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں اور یہ خود اسکے مقبول خاص و عام ہونے کی دلیل ہے انکے

جامع الفوائد کتب خانہ دفتر دیوانی و مال حیدرآباد میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا جس کا نام 'جامع الفوائد' ہے اور اسکے مولف شیدا ہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے جس کی تمہید میں شیدا نے وجہ تالیف یوں بیان کی ہے :-

"امابعد مولف این رسالہ و محرر این مقالہ اضعف من عباد اللہ میر نوازش علی خاں شیدا معروض خدمت صاحبان سخن می سازد کہ جمعی از دوستاں وارو کلبہ مسکین گشتند۔ چندی اختلاط و دوستانہ کرم داشتہ بعد انعقاد طول مصاحبت سررشتہ سخن باینجا رسانیدند کہ قوانین فارسی کہ متکلمان را دانستن آن واجب است تمام و کمال دریک کتاب یافتہ نمی شود۔ بایدکہ نسخہ جامعہ درایں باب تالیف سازی کہ بر صحیفۂ روزگار یادگار بماند۔ چون اصرار دوستان یکی از ہزار شد ناچار بعروۃ الوثقائے افضال ایزدی متمسک گردیدہ فرہنگ شرفنامہ و جہانگیری و موید الفضلاء و برہان قاطع و مدار الافاضل و دستور العمل و مفتاح الغرس و شرح مثنوی و شرح خاقانی و انوری وغیرہ کتب فراہم آورد و از ہر خرمن خوشہ و از ہر مائدہ توشہ برداشتہ بریک مقدمہ و سہ قانون و یک خاتمہ ترتیب دادہ بہ 'جامع الفوائد' موسوم ساخت "۔

اس مختصر رسالہ سے ہم یہاں چند سطور بطور نمونہ نقل کرتے ہیں تاکہ شیدا کی فارسی قابلیت کا بھی اندازہ ہوسکے :-

قانون سوم دربیان قواعد جلیلہ و فوائد جمیلہ۔ قاعدہ۔ بدانکہ حروف و کلمات ضمائر شش است۔ سہ از ان مفرد ساکن و آن شین و تائے قرشت و میم است کہ در آخر کلمات ترکیب یابند بجہت حصول معانی مختلفہ۔ شین برائے واحد غائب۔ تا برائے واحد حاضر۔ میم برائے متکلم۔ و سہ مرکب و آن ند و ید و یم۔ ند برائے تثنیہ و جمع غائب و ید برائے تثنیہ و جمع متکلم اگرچہ ند و ید کلمات ضمائر تثنیہ و جمع اند اما گاہے برائے تعظیم بہ اسم مفرد ہم می آرند و ہم چنین ضمائر منفصل نیز شش است۔ سہ برائے مفرد چون۔ او۔ تو۔ و من۔ او برائے مفرد غائب۔ تو برائے مفرد مخاطب حاضر۔ من برائے متکلم۔ و سہ برائے غیر مفرد چون ایشان و شما و ما۔ ایشان برائے تثنیہ و جمع غائب۔ شما برائے تثنیہ و جمع حاضر۔ ما برائے متکلم و تثنیہ۔ قاعدہ۔ باید دانست کہ شین در آخر اسما ضمیر غائب واحد و بمعنی او باشد چون اسپش۔ غلامش یعنے اسپ او و غلام او۔ و در آخر افعال بمعنی او را باشد چون زدش و گفتش زد او را و گفت او را"

جامع الفوائد کے خاتمہ پر شیدا نے خود ہی تاریخ تصنیف کہی ہے :—

"نسخہ جامعہ فارسی چہار دہم ماہ رجب المرجب ۱۲۰۱ھ روز چہار شنبہ دریکپاس و چار گھڑی روز برآمدہ بود کہ بانیکو زمان باتمام رسید و ازاین ہر چہار فقرہ علیحدہ علیحدہ ساز دسال تاریخ بر می آید نظم :—

بیا شیدا کہ اتمام کتاب است — سخن را از اطالب اجتناب است

ہمان بہ ختم کن برنام باری — کہ یابی مقصد دل ہر چہ داری

الٰہی رحم کن بر حال زارم — کہ غیر از تو کسی دیگر ندارم

سراپا گرچہ گشتم شکل عصیاں — چہ غم دارم چو تو غفار و رحماں

رسان دائم زمن صلوٰۃ بیحد — بروح اقدس حضرت محمد

اسکے علاوہ ممکن ہے کہ غزلیں اور مرثیے وغیرہ بھی شیدا نے لکھے ہوں لیکن اب تک ان کا پتہ نہیں نہیں ملا۔ ممکن ہے آگے چل کر کسی کو دستیاب ہو جائیں۔ البتہ غزل کے چند شعر دستیاب ہوئے تھے جو اس حصہ کے شروع میں مندرج کردئے گئے ہیں ان کے ورثاء کا بیان ہے کہ طغیانی رود موسیٰ میں شیدا کے متفرق کلام کا تمام ذخیرہ نذر سیلاب ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نوازش علیخاں شیدا علم نجوم سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق توزک آصفیہ کے صفحہ (۳۹۹) کی حسب ذیل عبارت سے ہو سکتی ہے :—

"روز غرہ رجب المرجب درمیدان باغ گورد ہند اس خیمہ نصرت اساس استادہ شد۔ خود چون نیر تاباں بدولت اقبال بعد انقضائی وقت زوال بایمائی انجم شناساں اہل کمال خصوصاً نوازش علیخاں بہادر کہ جامع کمالات محصوری معنوی ہست سوار شدہ داخل خیام فلک احتشام شدند۔"

شاہ تجلّی علی تجلّی

از

محمد عبدالقادر صاحب سروری

ایم اے، ایل ایل۔ بی۔ مددگار پروفیسر اردو

جامعہ عثمانیہ

مرقع سخن



اعظم الامراء نواب ارسطو جاہ بہادر

دی حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

شاہ تجلّی علی تجلّی

شاہ تجلی، جن کا اصلی نام تجلی علی ہے آصف جاہ ثانی کے دربار کے مورخ اور بڑے باخدا بزرگ، صوفی، اور نیک سیرت عالم تھے۔ اکثر تذکرہ نویس جو انکی شاعری کا ذکر کرتے ہیں، انکی سیرت اور باطنی اوصاف کی بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن انکو محض شاعر یا مورخ کہنا، انکی مختلف النوع قابلیتوں کا صحیح اظہار نہیں ہے۔ عہد آصفی کے علماء کے مقابلہ میں شاہ تجلی چند خاص حیثیتوں کے مالک ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک سنجیدہ مورخ اور شاعر ہیں۔ لیکن انکی قابلیت کا اہم ترین رخ یہ ہے کہ وہ اچھے مصور بھی تھے اور اچھے خوشنویس بھی۔ چنانچہ غلام حسین خاں جوہر مولف "تجلیات مہ لقا" ("ماہ نامہ") نے انکا ذکر اس عہد کے ممتاز خوشنویسوں اور مصوروں میں کیا ہے۔

عہد گزشتہ کے اکثر صوفی اور خدارسیدہ بزرگوں کی طرح شاہ تجلی کو بھی زرگری، آہنگری اور نجاری سے طبعی رغبت اور دلچسپی تھی خواہ اسکو اکل حلال کا ذریعہ سمجھو یا وقت گذاری کا مشغلہ۔ بہرحال وہ فنون صنعت و حرفت کے بھی ماہر تھے "گلزار آصفیہ" میں ان کے حالات میں ان کمالات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ تجلی کا ذکر سب سے پہلے میر قدرت اللہ قاسم نے "مجموعہ نغز" ۱۲۲۱ھ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"شاہ تجلی علی، وے مردے بود درویش نہاد در حیدرآباد (بسیار نیک خصلت) خوش (منش نہایت) پاک طینت پاکیزہ روش۔ ایں دو شعر از وے است۔

دامن کا کس کے عکس پڑا ہے کہ آج تک — پھیلا رہے ہیں سرو لب جوئبار ہاتھ

غنچے کی طرح خون جگر پیویں غم میں ہم — پہنچا (وے) یوں حنا ترے پا تک لگا تجلی"

اس اقتباس سے شاعر کے حالات اور اسکی شاعرانہ قابلیت تو واضح نہیں ہوتی لیکن یہ عبارت ان کی سیرت کی

ضرور آئینہ دار ہے میر قدرت اللہ قاسم کے بعد یوں تو چند اور تذکرہ نویس مثلاً عبد الغفور خاں نساخ اور مصطفے خاں شیفتہ نے تجلی کے حالات پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے مگر وضاحتاً ان کے کچھ حالات زندگی ملتے ہیں تو "محبوب الزمن" (مصنفہ عبد الجبار خاں ملکاپوری) ہی میں ملتے ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان کے حالات خود انکی قلمبند کردہ تاریخ دفتر آصفیہ میں بہت کم نظر آتے ہیں، یہ انکی درویشانہ طبیعت اور نام ونمود سے نفرت کی دلیل ہے ورنہ اس تاریخ میں اسکی کافی گنجائش تھی۔

شاہ تجلی کا سال ولادت صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن تزک آصفیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت اور آصفجاہ اول کی رحلت ایک ہی سنہ ۱۱۵۱-۵۲ھ میں واقع ہوئی صلابت جنگ کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ان کے منتہا علیہ رام داس پنڈت کی تحریک پر پونا کے قریب بالاجی پیشوا سے جو معرکہ ہوا تھا اس واقعہ کے سلسلہ میں تزک آصفیہ میں خود شاہ تجلی لکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ اس معرکہ میں شریک تھے اور عمر تیرہ سال کی تھی یہ جنگ سنہ ۱۱۶۴-۶۵ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے شاہ تجلی کی پیدائش کا سنہ ۱۱۵۱ھ یا ۱۱۵۲ھ متعین ہوتا ہے۔

تاریخ مذکور میں اکثر جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آصف جاہ ثانی کے عہد میں جتنے جنگ ہوئے ان میں سے اکثروں میں شاہ تجلی موجود تھے۔ کئی معرکوں کی انہوں نے تاریخیں بھی نکالی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ تجلی کا نشو ونما ابتدائے سن شعور سے درباری حلقوں میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تربیت غالباً ان کے ماموں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ ان کی علمی قابلیت کا اندازہ خود ان کی تاریخ سے ہو سکتا ہے، جو نہایت رواں اور دلچسپ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اسکا دیباچہ اور ایک دو عبارتیں جو خاص موقعوں پر لکھی گئی تھیں ان کی علمیت کا اچھا ثبوت ہیں۔ دیباچہ تصوف اور سلوک کے اعلی نکات اور کیفیات سے مملو ہے۔ ان عبارتوں میں سے ایک عبارت سیف الملک ماہی میاں کی شادی کی تقریب پر لکھی گئی ہے۔ دوسری آصف جاہ ثانی کی سالگرہ سنہ ۱۲۰۳ھ کے موقعہ پر۔ یہ عبارتیں معنی آفریں اور خیال بندی میں ادبا فارسی کی مشہور عبارتوں کی ہم پلہ ہیں۔

خوشنویسی میں شاہ تجلی، شاہ معین الدین تجلی کے شاگرد تھے۔ موخرالذکر کے کمال فن کا ذکر قدیم تذکرہ نگاروں نے نہایت احترام سے کیا ہے۔ شاہ تجلی غالباً استاد کی شہرت کو تو نہ پہنچ سکے۔ لیکن اپنے زمانہ کے اچھے خوشنویسوں میں گنے جاتے تھے

ان کے قطعات امرا و شوقین خواہش سے خریدتے تھے۔

افسوس ہے کہ شاہ تجلی کی خوشخطی اور مصوری کے نمونے باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہو سکے۔ تجلی نے مناظر اور اشخاص کی کئی تصویریں بنائی ہیں۔ چنانچہ ۱۱۹۱ھ میں جشن نوروز کے موقعہ پر حسب فرمائش آصف جاہ ثانی کی ایک قدآدم تصویر اس حسن سے کھینچی ہے جس میں ملبوس اور مرصع زیور وغیرہ بہترین رنگ و روغن سے نمایاں کئے گئے ہیں۔ خود تجلی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تجلی نے اہل فرنگ یعنے مغربی مصوروں کے نمونوں کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس کا اثر بھی ان پر پڑا تھا۔

تصویر کے صلہ میں شاہ تجلی کو پانچ ہزار روپیہ عطا کئے گئے۔ یہی کمالات تھے جس نے اُن کی قدر و منزلت دربار اور امرا میں بہت بڑھادی تھی۔ چنانچہ ان کی لڑکی کی شادی میں آصفجاہ ثانی بذات خود تشریف فرما ہوئے تھے۔ اور نقد اور جواہرات کی صورت میں پچاس ہزار کا سلوک فرمایا۔

اس واقعہ سلوک کو مصنف ''گلزار آصفیہ'' اور دوسرے مصنفین نے ''تزک آصفیہ'' کی تصنیف و تالیف کا صلہ قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ''تزک آصفیہ'' اس فیاضانہ عطیہ کے نو دس سال بعد لکھی گئی ہے۔

شاہ تجلی کی اولاد کے متعلق صرف اس قدر معلومات بہم پہنچے ہیں کہ ان کے ایک فرزند' محمد مرزا شاعر تھے اور مرزا تخلص کرتے تھے۔ حضرت ناصر الدولہ بہادر کے عہد میں صدارت کے عہدہ پر مامور تھے۔ ایک لڑکی بھی تھی جس کا ذکر خود شاہ تجلی نے ''تزک آصفیہ'' میں کیا ہے۔ اور یہ وہی لڑکی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور اسکے شوہر میر مرتضیٰ کو شادی کے دو سال بعد چارصدی منصب اور خانی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔

شاہ تجلی کی زندگی کا نصف آخر' ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ دربار کے امرا ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ارسطوجاہ' شمس الامرا' سردار الملک گھاسی میاں' راجہ رگھوتم راؤ اور دوسرے اعیان دولت اور خود رئیس وقت ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سردار الملک گھاسی میاں کو تو ان سے خاص انس تھا۔ انہیں کے ساتھ وہ اکثر رہا کرتے تھے۔ فطرتاً وہ ظریف طبع واقع ہوئے تھے اسلئے لوگ انکی صحبتوں میں مسرت سے شریک رہتے تھے۔ مذکورہ بالا امرا اور خود حضرت عفران مآب

ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

شاہ تجلی نے "تزک آصفیہ" کی ترتیب ۱۲۰۶ھ سے شروع کی اور ۱۲۰۸ھ میں اسکو ختم کر دیا۔ اسکے مکمل ہونے کے بعد اعظم الامراء ارسطو جاہ نے اسکو بندگان عالی کے ملاحظہ میں پیش کیا جنہوں نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اسکی ترتیب کے صلہ میں شاہ تجلی کو کافی صلہ ملا۔ ارسطو جاہ نے امراء اور ارا کین دربار سے پچاس ہزار کی رقم جمع کر کے ان کی قدر افزائی کی تھوڑے عرصہ کے بعد راجہ رگھوتم راؤ پیشکار نے "تزک آصفیہ" کو نفیس نستعلیق خط میں باتصویر لکھوایا۔ شاہی مجلسوں اور رزم آرائیوں کے کئی مرقعے اس میں موجود تھے۔ اس نسخہ کی طلائی جدولوں کی تیاری اور تصاویر کی رنگ کاری کے لئے راجہ موصوف نے اپنی ذات سے تین ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ یہ نسخہ مکمل ہونے کے بعد شاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ گلزار آصفیہ کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ انکی تاریخ کی ترتیب کے وقت (۱۲۵۸ھ) وہ سرکاری کتب خانہ میں موجود تھا۔

تاریخ "تزک آصفیہ" میر احمد علی موسوی کے اہتمام سے ۱۳۱۰ھ میں مطبع آصفی حیدر آباد دکن میں چھپی تھی لیکن اب عام طور پر بازار میں نہیں ملتی۔

شاہ تجلی کا انتقال "ماہ نامہ" کی ایک تحریر کے بموجب جو ان کے حال میں حاشیہ پر سرخی سے درج ہے، ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ اسی سنہ میں فارسی اور اردو شعراء کے وہ تمام افکار جو ارسطو جاہ کی مدح اور انکی دوسری تقریبوں میں پیش کئے گئے تھے اسمٰعیل یار جنگ کے استصواب سے ایک جا جمع کئے گئے اور شاہ تجلی نے اس کا مقدمہ لکھا۔ اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دفتر دیوانی رہا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

شاہ تجلی فارسی کے نہ صرف اچھے انشا پرداز تھے، بلکہ شعر و سخن سے بھی انہیں بہت دلچسپی تھی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے۔ ان کے فارسی اشعار "تزک آصفیہ" میں جا بجا ملتے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ کئی قصیدے اور قطعے دفتر دیوانی کے نسخہ میں موجود ہیں جو ارسطو جاہ کی مدح میں ہیں۔ قطعات عموماً بہت مختصر ہیں۔ جو ذرا طویل ہیں اور ان میں بہار کا منظر پیش کیا گیا ہے، بہت دلچسپ ہیں۔ ارسطو جاہ کے فرزند سیف الملک ماں میاں کے انتقال پر ایک طویل اور پر درد مرثیہ لکھا ہے، اسکے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسطو جاہ کے ساتھ ان کو بڑا لگاؤ تھا۔

صنعت نگاری میں بھی شاہ تجلی کی طبیعت خوب رواں تھی۔ ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے۔

زہے سال فرخندۂ نوبہار　　　　خوشا سال فیروز نصرت شعار

اس میں یہ صنعت رکھی ہے کہ ہر مصرعہ سے بقاعدہ جمل ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے۔

قصیدوں کی تشبیبیں عموماً بہاریہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے تغزل کا لطف آتا ہے۔ بعض قصیدوں کے درمیان غزلیں بھی آجاتی ہیں۔ شاہ تجلی اردو میں بھی اچھے شعر کہتے تھے چنانچہ اکثر تذکرہ نگاروں نے انکا ذکر اردو شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس فن میں دکن کے بعض مشہور شاعر اور استاد ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ان میں سے دو یعنے محمد داؤد ہنر اور شیر محمد خاں ایمان کا ذکر خود انہوں نے بر سبیل تذکرہ اپنی تاریخ میں کردیا ہے۔ ایمان کے متعلق سری رنگ پٹن کی فتح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ "شیر محمد خاں ایمان کہ گل سرسبد تلامذہ این مولف است این قطعۂ تاریخ بنظر عالی منظر بگذرانید" (صفحہ ۴۲۱)

تلاش کے باوجود ان کی غزلوں کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ جو دیوان عام طور پر شاہ تجلی علی کا مشہور ہوگیا ہے وہ دراصل میر حسن عرف میر حاجی تجلی کا ہے جو میر تقی میر کے خواہرزادہ اور شاگرد الحمد حسین کلیم کے فرزند تھے۔ یہ دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے اور اسکے متعلق راقم کا ایک تفصیلی مضمون مجلہ تحقیقات علمیہ میں شائع ہو رہا ہے۔ شاہ تجلی علی کے چند اردو قصیدے قطعے مسدس اور مسمط دفتر دیوانی کے مخطوطے میں موجود ہیں۔ یہ سب درحقیقت انکی مدحیہ شاعری کے نمونے ہیں۔ مدحیہ شاعری میں ہمارے یہاں عظمت اور شکوہ کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ تاہم تجلی کا طرز بیان سلیس اور سادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی قصائد کی تقلید میں وہ مبالغوں سے بھی کام لیتے ہیں لیکن عموماً وہ اپنے سچے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ قصائد انہوں نے یا تو رسطو جاہ کی تعریف میں لکھے ہیں یا بندگان عالی کی مدح میں۔ ان دونوں کی ذات سے شاہ صاحب کو محبت تھی۔ قصائد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے محسنوں کے احسانات کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ان میں تجلی عموماً بہار کی تشبیب باندھتے ہیں ذیل میں انکی تشبیب اور مدح کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

گر وصل گلبدن دے مجھے ایک بار دست　　　　ہر موسے ہو شکر ہوں پیدا ہزار دست

دامن کا کس کے عکس پڑا ہے کہ آج تک
کھولا ہے سرو نے لب جوئبار دست

غنچہ کی طرح خون جگر پیویں غم میں ہم
پہنچا دے یوں حنا ترے پا تک نگار دست

مسکین ہوں ایک عمر سے تیری نگاہ کا
سر پر کبھی نہیں اٹھاوے ہے مجھسے خمار دست

زنہار گل کو ہاتھ میں مت لے اے لالہ رو
ہووے کہیں مبادا ترا داغدار دست

جس طرح تجھ کو مشق تحمل ہے ہجر میں
ویسا ہی مجھکو مشق ستم میں ہے یار دست

چل اب شتاب ساقی گلرنگ جام بھر
کھولا ہے ہر طرف چمن سحر کار دست

گلگشت باغ سایہ گل تک کرے ہے آج
رنگین کیا ہے عکس سے ہر شاخسار دست

جوش چمن سے ہے در و دیوار رخنہ گر
تا آسماں بلند کیا لالہ زار دست

بلبل سے لیکے نشہ میں گل تک چھکائیے
دیوے ترا جو ساقی ہمیں اختیار دست

بیدست و پا ہوں بسکہ زمانے کے ہاتھ سے
یکدن کبھی نہیں دیا ہے مجھے اعتبار دست

یہ جلوہ گہ طلسم تحیر ہے بے خبر
کس کو دیا ہے یہ فلک بے مدار دست

ہوں گرچہ خاکسار پہ میری رسائی دیکھ
پہنچاوے ہے بچرخ بریں یہ غبار دست

(۳)

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو
اک گل پہ جھوم جھوم گرے ہے ہزار دو

گل کوئی شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ
قرباں ہیں صبح و شام بصد اضطرار دو

سیلاں ہے بسکہ جوش رطوبت سے باغ میں
سرو چمن کے بیچ سے نکلی جوئبار دو

موج نسیم آئینہ آبشار سے
صیقل سا صاف کر دیا زنگ غبار دو

یہاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر
یک بیج سے گلوں کے ہر یک شاخسار دو

اے مست نیم خواب یہ نرگس کے سیر میں — منظور ہو تو ہم کھڑے ہوئیں دو چار دو
ٹک کھول زلف مکھڑے پہ اے رشک مہرو ماہ — دیکھوں میں ایک صفحہ پہ سنبل و نہار دو
ایسی غزل کو طرح کروں اور لیوں میں — ہر بیت کے صلہ میں در شاہوار دو
دینے کو نذر دست نشاطی اے اغباں — گلدستہ باندھ لیکے رگِ گل سے تار دو
گھر گھر میں جن کی سالگرہ کا ہے انبساط — بیٹھے ہیں آج جشن میں مل شہریار دو
ایک ہے مہ کیانی و دوم رئیس ملک — فرق شہنشہی کے ہیں دُرِّ افتخار دو
جنکی گرہ کے دینے برس گانٹھ کے ہزار — لادے ہے مہر خط شعاعی کے تار دو
دریا سے لیکے کان تلک خشک و تر کے بیچ — بذل و عطا سے انکے ہیں یہ شرمسار دو
خوان فلک میں صبح و مسا سیم و زر کو بھر — خورشید و ماہ آتے ہیں بہر نثار دو
دہشت سے جنکی تیغ دو دم کے مخالفین — ہو جاویں چار ٹکڑے جو ہوں گو وہ وار دو
ہوتے ہی صبح میں جو گیا سیر باغ کو — دیکھوں کھلے ہیں واں چمن لالہ زار دو
خوش قد مثال سرو چمن جوئبار پر — بیٹھے ہیں رشک باغ ارم طرحدار دو
تھا بہرویں کا آب رواں کا ساز مزمہ — بجتے تھے ایک سر میں رباب و ستار دو
تاریخ جشن سالگرہ با دعائیہ — گاتے تھے بیٹھ مصرعہ یہ آبدار دو
جب تک ہیں نیرین فلک حق کے فضل سے — دائم رہیں یہ سالگرہ بے شمار دو
شاہا ترے کرم سے ادا ہو گیا یہ قرض — باقی ہیں سخت اوس سے جو ہیں قرضدار دو
امید ہے تجلی مداح کی ترے — اترے شتاب سر سے جو رہ گئے ہیں بار دو

(۳)

ہولی اور نوروز کیا توام مل آئے اب کے سال — جوش سے روئیدگی کے اٹھ گئی ہے اعتدال

بھول عادت نامیہ اپنی رکالی اور چال　　سبزۂ خوابیدہ طوطی سا اوڑے ہے کھول بال
بلبل تصویر سے پرواز کا ہے احتمال　　عکس آئینہ عجب نیں ہے کرے خوفیل و قال
رنگِ گل سے ہے حبابِ موج فانوس خیال　　دیکھئے کیا ہو دوانوں کا یہ موسم میں مآل

موج گل دام پری شد مژدہ اے مجنوں نشاں
می برد سیل جنوں بنیاد زہد زاہداں

بسکہ شبنم سے برستے ہیں گلستاں میں گہر　　کھول کر دامن کو اپنے گل کھڑے ہیں منتظر
شعلۂ گل پر گرے پروانہ ہردم جھوم کر　　شمع جلتی ہے اسی حیرت سے تا وقت سحر
ہو گیا نظارہ غرقِ رنگ گلشن تا کمر　　ڈوب جاویگا کہیں گلچیں قدم آہستہ دھر
عطر مجموعہ چنبیلی موتیا شیشوں میں بھر　　واسطے نواب ارسطو جاہ لے آئیں گہر

شد معطر یک قلم کاشانۂ کے منظری
غنچہ مینا گر شد و گلگشت وقف ساغری

ہو گئے گرچہ بہت سے خسروانِ ماسلف　　مادرِ گیتی سے نیں پیدا ہوا تجھ سا خلف
ماہ سے میلاد کے تیرے جہاں کو ہے شرف　　جس طرح رنگِ گہر سے آبروئے یا و صدف
گر عدو سہ سر کے ہو کر پے بہ پے ہوویں صف　　نوکِ پیکانِ غضب تیرے کیں ہوویں سب ہدف
کیوں نہ تیرے سر پہ ہوئے سایہ شاہ نجف　　اسم اعظم سے ترے سب دشمنِ دیں ہیں تلف

یاد نا اعداد اعظم دو نشانت نور چشم
مردم چشم عدو چوں صفر باشد کور چشم

دوسرا دور

۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک

اس دور میں نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی (۱۲۱۸) اور نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (۱۲۴۴) کے علاوہ وزرائے سلطنت ارسطوجاہ (۱۲۱۹) اور میر عالم (۱۲۲۳) نے حیدرآباد میں شعر وسخن کی خاص سرپرستی کی ہے جس کا شہرہ سن کر اسی زمانہ سے اقصائے ہندوستان سے باکمال شعرا کی دکن میں آمد شروع ہوی۔

میر قمرالدین منت (۱۲۰۸ھ) اور خواجہ احسن اللہ بیان (۱۲۱۳ھ) کے علاوہ مرزا علی لطف، حافظ تاج الدین مشتاق، اور میر دولت علی دولت وغیرہ اس دور کے وہ مشہور شعرا ہیں جو حیدرآباد آئے تھے۔

خود حیدرآباد میں اس وقت متعدد باکمال شعرائے اردو موجود تھے جن میں سے چار یعنے ایمان، چندا، قیس اور شاد ان پر تفصیلی معلومات آئندہ صفحات میں درج ہیں۔ ان کے علاوہ اس دور کے شعرائے اردو میں میر علی مردان خاں یکدل (۱۲۰۹) محمد علی نیاز (۱۲۱۰ھ) نیاز احمد خاں نیاز (۱۲۱۱ھ) میر ہاشم فقیر (۱۲۱۲ھ) مرزا محمد جان نثار (۱۲۱۲) میر نجف علی خاں ندرت (۱۲۱۳ھ) اور مرزا داود بہتر زیادہ مشہور ہیں۔ میر حسین علیخاں ایما، میر بہاء الدین حسین خاں عروج، اور میر عباس علیخاں احسان بھی اس دور کے شعرا میں شمار کئے جاسکتے ہیں اگرچہ یہ تیسرے دور کے اوائل میں بھی موجود تھے۔ اس دور کے بعض شاعروں کے کلام کے مکمل مجموعے موجود ہیں اور اکثروں کے کلام کے نمونے مختلف تذکروں

اور رسائل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ عبدالولی عزلت اور عارف الدین خاں عاجز بھی اس دور کے مشہور شعرا ہیں۔

اس دور سے حیدرآباد کے اردو شاعر اپنی قدیم زبان کو (جو تین سو سال تک معیاری اردو رہ چکی تھی اور جس میں اسوقت تک سیکڑوں اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھی جا چکی تھیں جن کو دیکھ کر دہلی کے صاحبان ذوق نے فارسی گوئی ترک کرکے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا) متروک سمجھنے لگے کیونکہ اس وقت دہلی میں مرزا مظہر جان جاناں کی یہ تحریک کامیاب ہو چکی تھی کہ اب شمال کے اردو شاعروں کو دکنی زبان کی پیروی ترک کرکے اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کے محاورے اور روزمرے نیز فارسی کے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرنا چاہیئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سے حیدرآباد میں مقامی شاعروں کے مقابلہ میں شمالی ہند کے شعراء کی قدر و منزلت زیادہ ہوگئی۔ اور حیدرآبادی شاعر یہ سمجھنے لگے کہ ہم جو زبان بولتے ہیں وہ معیاری نہیں ہے اور اب ہمیں شمال کے اردو شاعروں کی زبان کا اتباع کرنا چاہیئے۔

حیدرآباد سے باہر اس عہد میں اردو کے جو ممتاز اور مشہور شاعر موجود تھے ان کے یہ نام ہیں۔ میر محمد علی بیدار (۱۲۰۹) قیام الدین قائم (۱۲۱۰) عبدالحی تاباں (۱۲۱۱) محمد میر سوز (۲۱۳) ہدایت اللہ خاں ہدایت (۱۲۱۵) جعفر علی حسرت (۱۲۱۷) قلندر بخش جرأت (۱۲۲۵) اور میر تقی میر (۱۲۲۵)۔

شیر محمد خاں ایمانؔ

از

سید اشفاق حسین صاحب

شیر محمدّ خاں ایمانؔ

دکن کی علم پروری اور ادب پرستی نے بہت سے صاحبانِ علم و فضل اور شعرائے نازک خیال ایسے پیدا کئے جن کے کام آج تک علم و ادب کی جان ہیں۔ قدیم دکھنی شاعری کا عروج اور دکھنی بادشاہوں کی شعر پرستی اور شاعر دوستی نے شاعری کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کر دیا کہ آج اہل ذوق انھیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ دورِ قطب شاہی کا زوال قدیم دکھنی شاعری کا زوال تھا' گولکنڈہ کی سلطنت کے ساتھ ہی قدیم دکھنی کے وہ میٹھے بول ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ آصف جاہ اول سے نظام علی خاں آصف جاہ ثانی تک کا زمانہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا' ہندوستان کی بساطِ سیاست پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مہرے دوڑ رہے تھے اور خود مرکز میں بابر و تیمور کی اولاد اپنے اسلاف کے کارناموں کے سہارے جی رہی تھی۔ بابری عزم آہنین اور اکبری تدبر کی بجائے محمد شاہی عیش و نشاط کا دور دورہ تھا۔ مرہٹے بھی اپنی فوجی قوت کے گھمنڈ میں ہندوستان کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہشمند تھے۔ ان مختلف قوتوں کے یک بیک کھڑے ہو جانے اور مرکزی حکومت کی بے دست و پائی نے ہندوستان کا نقشہ بدل رکھا تھا۔ آصف جاہ اپنی ہمت بھر مرکز کی حفاظت کرتے رہے مگر جب دیکھا کہ آسمانی سلطانی خود اسکے خلاف ہے اور حالات بتہ دیر ہے تھے تیمور کی اولاد اب زیادہ دنوں ہندوستان پر حکومت نہیں کر سکتی تو یہ بھی دلی چھوڑ کر دکن چلے آئے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافہ کی تمہید تھی کہ جس میں انگریز اور فرانسیسی ساحلی مقامات پر قابض ہوتے جا رہے تھے اور مرہٹے اور افغانی دلی کا تخت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ مرکز کی کمزوری نے ان قوتوں کے ابھارنے میں کافی مدد دی۔ غرض یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں عجیب کشمکش اور جنگ و جدل کا زمانہ تھا' آصف جاہ اول کا دورِ حکومت ان ہی شورشوں کی نذر ہوا۔ ان کے بعد بھی نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے زمانہ تک بھی دکن کی حکومت کو سکون نصیب نہ ہو سکا۔ ایسی صورت میں یہاں کسی علمی یا ادبی ترقی کا ہونا ناممکن تھا مگر آصف جاہ اول کی علم پروری کی وجہ سے جو کچھ ہوا وہ حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔ دکن کے تخت نے جب آصف جاہ ثانی سے زینت پائی تو اردو شعر و شاعری کے بھی

بھاگ کھلے یہ وہ وقت تھا جب دلی اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا۔ تاناشاہ کے ساتھ گولکنڈہ کا سہاگ قائم تھا مگر جب بادشاہت ختم ہوگئی تو شعر و شاعری کا وجود معلوم۔ غرض گولکنڈہ کے اجڑنے کے بعد دکن میں اردو شاعری کا دوسرا دور اورنگ آباد سے شروع ہوا ملک عنبر کی بسائی ہوئی بستی کو عالمگیر نے اپنا پایہ تخت بنا کر رونق دی اور علم و فضل کی ایسی محفل رچائی جو ایک مغلیہ دار السلطنت کے شایان شان تھی۔ اورنگ آبادہی کے ایک شاعر ولی کے ہاتھوں شمال کی اردو شاعری نے جنم لیا۔ ادھر سراج اور داؤد وغیرہ نے دکن میں بھی اسے پھر سے پروان چڑھانے میں مدد دی، غرض دکن میں دوبارہ شعر و شاعری کی محفل جمی۔ اسوقت تک شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا نہ ہو سکی تھی، اورنگ آبادہی سے ولی کا دیوان دلی جاتا ہے اور اسکے فیض سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

شمالی ہند میں جس وقت میر، سودا اور درد شعر و شاعری کے استاد مانے جاتے تھے، اورنگ آباد میں شفیق اور حیدرآباد میں ایمان اپنی شاعری کا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ شفیق کی طرح ایمان بھی کوئی بڑے شاعر نہ تھے کہ انھیں میر و سودا کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاسکے مگر حیدرآبادی شعرا میں انکا درجہ سب سے بلند تھا اور استاد مانے جاتے تھے۔ شیر محمد خاں ایمان کے والد محمد عاقل خاں سرکار نظام میں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور تھے اور اخبار گوئی کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ ایمان کے والد نے ان کو تعلیم شہر کے علما اور فضلا سے دلوائی عربی اور فارسی کتابوں کی تحصیل کے بعد ایمان نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ باپ کی وفات کے بعد یہ ان کی خدمت پر مامور ہوئے اور آخر میں سارے اخبار گویوں کے افسر مقرر ہوئے۔ دکن کے سارے واقعات ان کے دماغ کے خزانے میں محفوظ رہتے تھے دربار کے علاوہ عوام میں بھی معزز و موقر تھے۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ جیسے علم پرست اور شاعر دوست وزیر اعظم کی جناب میں ایمان کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ایمان سفر و حضر میں ہر وقت اعظم الامرا کے ساتھ رہتے، شعر گوئی اور شعر فہمی میں اپنے زمانہ کے استاد تھے۔ آصف جاہ ثانی کا زمانہ تھا، ۱۲۱۶ھ میں محلہ کمان الحجی بیگ میں ایک مشاعرہ قرار پایا، شمالی ہند اور دکن کے اچھے اچھے شاعر جمع تھے ایمان کسی وجہ سے وقت پر نہ آسکے مشاعرہ کا وقت ٹل چکا تھا مگر سارے لوگ ان کے منتظر تھے کیونکہ بغیر استاد کے آئے مشاعرہ شروع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آخر یہ آئے، دیری کی معذرت چاہی تب کہیں جاکر مشاعرہ شروع ہوا۔ تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ آصف جاہ ثانی کی وفات پر

تاریخ کہی۔ دوسرے شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی تھی مگر ایمان کی تاریخ آصفجاہ ثانی کے مقبرہ پر کندہ کرائی گئی جو آج تک موجود ہے۔ چوتھے مصرع سے دو مادہ تاریخ برآمد ہوتے ہیں۔

بر روح پاک میر نظام علی مدام — زین مصرع عجیب دو تاریخ در بخواں
خوانند با وضو ہمہ اشخاص فاتحہ — مستوجب بہشت و باخلاص فاتحہ
۱۲۱۸

عوام ان کو دل سے چاہتے، جدھر نکل جاتے لوگ بڑی آؤ بھگت سے پیش آتے، خوش سیرت و خوش کلام تھے مجمع احباب میں اپنی خوش گوئی کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے زیادہ حالات نہ مل سکے، مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند نے جو اس زمانہ میں حیدرآباد آئے اور اعظم الامرا کی سرکار سے نوازے گئے اپنے تذکرہ شعرا میں کہیں ایمان کو جگہ نہ دی، حالانکہ جس دربار میں انھیں جگہ ملی تھی، ایمان بھی وہیں تھے اور اعظم الامرا ارسطو جاہ کے ہر دلعزیز مصاحبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایمان نے ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں شاعری کے چرچے تھے اور شعرا کی دل کھول کر ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ وہ شاہ تجلی مولف تزک آصفیہ کے شاگرد تھے چنانچہ شاہ صاحب اپنی تاریخ میں ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ صاحب گلزار آصفیہ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں مرزا علی لطف حیدرآباد آئے، ایمان بھی ان سے جا کر ملے اور باہم خوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے ایمان کے شاگردوں میں قیس، چندا اور حفیظ (جو مہاراجہ چندو لال کے درباری شاعر تھے) مشہور ہیں۔ قیس اور چندا کے دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں، دونوں بہت اچھے شاعر اور اپنے ہم عصر شعرا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس سے پہلے مجلہ مکتبہ میں عمر یافعی صاحب نے بالانضباط ایمان کا کلام شائع کیا تھا اُن کا ایک ضخیم دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے مگر ان کے حالات بہت کم تذکروں میں ملتے ہیں، ایمان نے سنہ ۱۲۳۱ھ میں انتقال کیا۔ دیوان کے علاوہ ضلع جگت میں ایک کتاب گلدستۂ گفتار، اپنی یادگار چھوڑی۔

شاعری | ایمان میر کے ہم عصر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعرا ایہام گوئی کو ایک فن سمجھتے تھے، ایمان کا کلام بھی ایہام سے خالی نہیں وہ ایک پرگو شاعر تھے اور پرگوئی میں مطالب و معانی کا معیار قائم رکھنا مشکل ہے، مگر ایمان کے یہاں مطالب و معانی کا معیار اتنا پست نہیں کہ انکی شاعری تک بندی کہلائی جا سکے۔ ایمان کے سامنے اورنگ آباد اور دلی کے

شعراء کا کلام موجود تھا اور انہوں نے اس سے کافی استفادہ کیا جبھی تو ان کے کلام میں اتنی شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے کہ ان کے اور کسی دلی کے شاعر کے کلام میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ ایمان کا حلقہ تلمذ کافی وسیع تھا ہمارے یہاں کسی استاد شاعر کا زیادہ وقت تلمیذ نوازی میں گزر جاتا ہے۔ دوسری طرف ایمان ارسطو جاہ کے مصاحب بھی تھے اور ریاست میں اخبار گوئی کے افسر اعلیٰ کی خدمت بھی انجام دیتے تھے تو اس لحاظ سے ایمان کی شاعری زیادہ محنت اور غور و فکر کی پیداوار نہیں ہے مگر اس وجہ سے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے شاعر اور حیدرآباد کے ایک اہم ادبی دور کی پیداوار تھے' انکی شاعری کو منظر عام پر لانا نہایت ضروری ہے۔ اسکے علاوہ ایمان نے اپنے بعد دو ایسے شاگرد چھوڑے' جن کا نام اس زمانہ کے حیدرآبادی شعراء میں سرفہرست رہیگا۔ ان میں سے ایک ماہ لقابائی چندا ہے جو اپنے وقت کی بڑی ہر دلعزیز شاعرہ تھی۔ دوسرے محمد صدیق قیس ہیں جن کی شاعری بعض خصوصیات کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں سب سے بلند پایہ ہے۔

ایمان کی غزل گوئی میں استادانہ اثر غالب ہے' بعض جگہ انکی شاعری بہت بلند ہوگئی ہے اور بعض جگہ پستی کی طرف مائل ہے۔ مثنویوں اور قصائد میں انھیں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا ہے' ایمان کی رباعیات ان کے سارے اصناف سخن پر بھاری ہیں' اور یہاں وہ ایک بلند پایہ شاعر نظر آنے لگتے ہیں۔

اسلوب و زبان اس زمانہ میں حیدرآباد کی زبان دلی اور لکھنو کی زبان سے مختلف ہونا چاہیے تھی' مگر ایمان کی زبان دیکھکر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ حیدرآبادی شاعر تھے انہوں نے متروکات کا بہت کم استعمال کیا ہے اور تعقیدیں بھی کلام میں زیادہ نہیں ہیں تعقیدوں اور متروکات کا استعمال اس زمانہ میں کچھ عیب نہ تھا کیونکہ زبان بن رہی تھی فارسی کے جملوں کا ترجمہ اور متروکات کا استعمال ناگزیر تھا' ایمان قادر الکلام شاعر تھے جس زمین میں غزل کہی اسے آسمان پر پہنچا دیا مشکل زمین اور مشکل ردیف و قافیہ میں بڑی آسانی سے غزلیں کہی ہیں۔ اس غزل میں "بسمل، منزل" قافیہ ہے اور "غش کیا" ردیف۔

ایدھر تو ایک ہاتھ میں بسمل نے غش کیا
اودھر لہو کو دیکھ کے قاتل نے غش کیا

وادی ہے تجھ دیار کی اتنی سموم خیز
پہلے قدم میں رہرو منزل نے غش کیا

کس کی شمیم زلف یہ لائی ہے اے نسیم
ٹک سونگھتے ہی عاشق بیدل نے غش کیا

موجوں سے بحرِ غم کے بچا، پر ہوں نیم جاں | جیسے نکل کے طالب ساحل نے غش کیا

تعریف دلربا کے سراپا کی کیا کہیں | ایمان ہم کو ایک ہی بس تل نے غش کیا

اس سلسلہ میں دو چار شعر اور لکھے جاتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ایمان کی نادرالکلامی میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا ۔

حُسن اس جبین جبیں کا دیکھ مانی نے کہا | چشمۂ خورشید پر کھینچی ہے یہ تصویر موج

مشہد یہ میرے آن کے دامن کشاں چلا | اللہ رے ستمگر خونخوار کا گھمنڈ

سرمہ ہو جل کے برق تجلی سے کوہسار | پھبتا ہے اسکو جلوۂ دیدار کا گھمنڈ

تشبیہیں اور استعارے ایمان کے کلام کا سب سے گراں مایہ عنصر تشبیہیں ہیں ایسی لطیف اور نازک تشبیہیں کلام میں استعمال کی ہیں جو کسی فارسی کے مشہور شاعر یا بھاشا کے استاد ہی کے یہاں مل سکتی ہیں ۔

کسی آتشیں رخسار معشوق کا آویزۂ گوہر، ہماری شاعری میں کوئی نیا مضمون نہیں مگر ایمان نے تشبیہ میں ندرت اور اچھوتے پن کو ختم کر دیا ہے ۔

زمرد اس کے آویزہ کا یوں عارض پہ جھکے ہے | پری کے ہاتھ ہے شیشہ شب مہتاب میں گویا

معشوق کے رخسار کو شب مہتاب کہہ کر اسکی رعایت سے پری اور شیشہ کتنی لطیف تشبیہ ہے ۔

معشوق کی عرق آلود زلفوں کو قطرات شبنم، قطرات گہر سے تو ہر کوئی تشبیہ دیتا ہے مگر ایمان نے اسمیں بھی ندرت پیدا کر دی ہے ۔

یاد آتی ہیں عرق آلود وہ زلفیں مجھے | جب اندھیری رات میں ہو آسماں اختر فروش

عرق آلود زلفیں اور اندھیری رات میں آسمان کی اختر فروشی، اس سے زیادہ محسوس تشبیہ اور کوئی ہو سکتی ہے ۔

چہرہ نور فشاں یوں ہے نراز زیر نقاب | جیسے خورشید ہو دامان سحر کے ہاتھ میں

کسی خورشید رخ کی نقاب پوشی کو خورشید کے دامان سحر میں ہونے سے تشبیہ دینا کتنا نیچرل اور اصلیت سے قریب انداز بیان ہے تشبیہوں کی سادگی اور ان میں جدت و ندرت پیدا کرنا ایمان کے کلام کا امتیاز ہے ۔ ان کا انداز بیان ہمیشہ نیچرل اور

اصلیت سے بہت قریب ہوتا ہے وہ بال کی کھال نہیں کھینچتے۔ اور غیر محسوس تشبیہات سے بالعموم پرہیز کرتے ہیں۔
تشبیہ کی سادگی اور لطافت ملاحظہ ہو۔

جس نے دیکھا تری چوٹی میں پڑا سرخ مباف — کہا آتا ہے شفق آج نظر آخر شب
حسن اس چین جبیں کا دیکھ مانی نے کہا — چشمۂ خورشید پہ کھینچی ہے یہ تصویر موج

معشوق کے چین جبیں کو چشمۂ خورشید پر تصویر موج کہہ کر ایمان نے تشبیہ میں انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔
تشبیہوں کے علاوہ استعاروں میں بھی ایمان کے یہاں ویسی ہی لطافت ہے۔

جب میں پوچھا غلام کب آوے — ہاتھ میں لیکے زلف بل کھایا

مضمون آفرینی ایمان کے یہاں مضمون آفرینی بھی کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ ایمان گردش آسمان کی وجہ بتلاتے ہیں

گردش کو تیری چشم کے دیکھا تھا ایک دن — تب سے پڑا ہے چرخ میں خورشید اب تلک

آویزہ گوہر سے متعلق کیا نفیس مضمون باندھا ہے۔

آویزۂ گوہر بھی عجب کم نصیب ہے — پہنچا تھا اسکے کان تلک پر لٹک گیا

شہاب ثاقب ٹوٹتا ہے تو ایمان اسکی یوں تشریح کرتے ہیں۔

ٹوٹا نہ یہ شہاب ہے ایمان بے سبب — پہنچی ہے میری آہ کہیں آسمان پر

ہمارے یہاں شمع سے متعلق نئے نئے مضامین باندھے گئے ہیں کوئی شمع کے اس طرح جلنے کو معشوق سے رشک کے باعث تعبیر دیتا ہے کوئی پروانہ کے غم کا نتیجہ بتاتا ہے غرض شمع کا مضمون ہمارے ان چند مضمونوں میں سے ہے جو اردو شاعری کا مستقل موضوع ہیں۔ یقین کہتے ہیں۔

رشک تیری دلربائی کا زبس کھاتی ہے شمع — دیکھ تیرے حسن کے شعلہ کو جل جاتی ہے شمع

میر کا شعر ہے۔ ہر زباں جاتی ہے گھٹتی سامنے تیرے کھڑی۔ جوشِ غم سے آپ ہی اپنے تئیں کھاتی ہے شمع
پھر ایمان کا شعر ملاحظہ ہو۔ شعلہ رو ہے عشق تیرا کس بلا کا دلنشیں۔ داغ کو اپنے جگر کے اب تلک دھوتی ہے شمع

روانی | ایمان کے کلام کی روانی ان اشعار سے ظاہر ہوگی۔

غمزہ، ادا، نگاہ، تبسم خرام سے
میں ایک اپنی جان بچاؤں کہاں تلک

ہیں اگر آپ کے نزدیک برا ہوں حقا
پھر مرا کا ہیکو مذکور ہو تقصیر معاف

آپ کا الطاف اگر پائیں ہم
غیر کے گھر کا ہیکو پھر جائیں ہم

یہ پوری غزل بندش زبان اور روانی کے لحاظ سے بہترین ہے۔

کیا ہی تماشہ اللہ دیکھا
دلبر کو اک روز دل خواہ دیکھا

جوں برق ناچار جھپکی ہیں آنکھیں
جب اسکو ہم نے ناگاہ دیکھا

الفت کا لیجیو مت نام کوئی
یہ درد ہم نے جاں کاہ دیکھا

شاید کہ آئے وہ رشک یوسف
سپنے میں ہم نے شب ماہ دیکھا

اسلوب وزبان کے اعتبار سے ایمان اپنے ہم عصروں میں خاص امتیاز رکھتے تھے، جیسی زبان انہوں نے استعمال کی ہے دوسروں کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔

مطالب و معانی | متقدمین مطالب و معانی سے زیادہ اسلوب وزبان کا خیال رکھتے تھے سوائے میر کے بہت کم شاعروں نے الفاظ سے وہ نکات اور معنی پیدا کئے جو شاعری کی روح ہیں۔ سوز کی زبان و اسلوب میر سے زیادہ پاکیزہ اور سادہ ہے مگر مطالب و معانی کے لحاظ سے انکی شاعری کا درجہ بہت کم بلند ہے۔ میر نے سادہ الفاظ اور بناوٹ سے خالی انداز بیان کو مطالب و معانی کے زیور سے آراستہ کر کے جس بلندی تک پہنچایا وہ ان ہی پر ختم ہوگیا۔

ایمان کی شاعری اسلوب وزبان کی بندشوں سے آزاد نہ ہوسکی مگر مطالب و معانی کے اعتبار سے بھی ان کی شاعری کچھ کم بلند نہیں ہے۔

اخلاق و موعظت | اس مختصر سی زندگی میں جہاں انسان گردش آسمان میں "پرکا ہے میانہ گرداب" سے زیادہ وقیع نہیں، اگر کوئی چیز اسکی ثبات کا باعث ہوسکتی ہے تو صرف اسکی نیک نامی ہے۔

زندہ جاوید کہتے ہیں اسے ایماں ہم — جس کا نام نیک آخر اس جہاں میں رہ گیا

دنیا کی بے ثباتی اور زمانہ کا انقلاب ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص اطمینان وچین سے زندگی بسر کرے۔ بڑے بڑے صاحبان شان وشوکت جو مرتے تک دولت کے ڈھیروں میں جیا کئے جب موت تے دستک دی تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ بھی ان کے ساتھ نہ گیا۔

مجھ سے کل گور غریباں میں کہا عقل نے یوں — اور کچھ یاں نہ سوا حسرت و غم ہے نہ خاک

اور کہتے ہیں۔ دنیا کے عز و جاہ پہ مت بھولیو کہ یاں — یک آن ہی میں چتر کئے و علم الٹ گیا

باوجودیکہ نہیں فرصت یک شبنم زدن — اتنی ہستی پہ بھی ہم مثل شرر جلتے ہیں

قدرت کے انوازنے کو کیا دیر لگتی ہے، آج جو فقیر ہے کل بادشاہ ہو سکتا ہے۔ ایک مفلس و نادار کو تخت شاہی نصیب ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ عزّو شاں پہ سمجھا تو ہما کو دیکھ — ہوتا ہے بادشاہی کا ایک مشت پر سے فیض

زندگی کی آخری منزل ہے، چل چلاؤ کا زمانہ ہے کوچ کی صدا بلند ہو چکی ہے، ایسے وقت خواب شیریں کے مزے لینا کتنی غفلت ہو سکتی ہے؟ میر کا ایک قطعہ ہے۔

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں

ان کا بھی قیام ہے کوئی دم — یہ بھی نہ رہیں گے جو اب رہے ہیں

دنیا کا یہ حال اور ہم کو — کچھ فکر نہیں ہے سو رہے ہیں

ایماں کہتے ہیں۔ عہد پیری میں عزیزو بہتر نہیں خواب شیریں — صبح ہوئی صبح بس اسباب اپنا لادو

عاشقانہ | عشق و محبت کے مضامین اردو شاعری میں اپنی فرسودگی کے لحاظ سے کسی تشریح کے محتاج نہیں عشق کے سچے اور پاک جذبات کے ساتھ مخرب اخلاق اور عریاں خیالات کی بھی ہمارے یہاں کمی نہیں خواب جوانی کی تعبیروں

اور حدیث دل کی تفسیروں کے اجاگر کرنے میں ہمارے شاعروں کی طبع رسا نے وہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ شاید ہی کسی زبان کے شاعروں کا اتنا زیادہ وقت اس موضوع پر صرف ہوا ہو۔

اردو شاعری کا عشق کتنا ہی فرسودہ اور بدنام کیوں نہ ہو پھر بھی عشق کے پاک اور سچے جذبات اور عاشق کے دلی واردات کا بیان ہر سننے والے پر اثر کرتا ہے اور یہی عشق کی ہمہ گیری ہے۔ دنیا کسی سائنس داں کی تحقیق یا کسی ماہر پرواز کے کارناموں کو تھوڑے زمانہ تک یاد رکھ سکتی ہے مگر محبت کا کوئی سچا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یاد رہ جاتا ہے اور کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ عشق کی پہلی ہی منزل اتنی کڑی ہوتی ہے کہ اچھوں اچھوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ ایمان کہتے ہیں

وادی ہے تجھ دیار کی اتنی سموم خیز　　　پہلے قدم میں رہرو منزل نے غش کیا

عشق کی نہ ابتدا معلوم ہو سکتی ہے نہ انتہا۔

ایمان خدا جانے انجام محبت کا　　　جب فہم میں کچھ اپنے آغاز نہیں آتا

عشق کے دریا کی طوفان خیزی میں عاشق کے عافیت کی کشتی ڈگمگاتی جاتی ہے اور عاشق بہ حسرت و یاس ساحل کی طرف دیکھتا ہے مگر پہنچ نہیں سکتا۔ یہ ایسا دریا ہے کہ آج تک نہ کوئی گہرائی معلوم کرسکا نہ کامیاب ساحل تک پہنچ سکا

عشق کا دریا بے پایاں و طوفاں خیز ہے　　　یاں شناور کے رہی دل ہی میں ساحل کی ہوس

موجوں کے تھپیڑوں، اور دریا کی پرجوش روانی میں عاشق کی شکستہ حالی اور بے دست و پائی ہر لحظہ ساحل کی آرزو کرتی ہے اور خواہش ہوتی ہے کہ کاش کوئی ایسی مبارک ہوا چلے اور کشتی ساحل تک پہنچ جائے۔

کشتی شکستہ حال ہے اور بحر موج زن　　　اے شوق آ پہنچ کہ ہے ساحل کی آرزو

محبت کی اس منزل میں جہاں عاشق فراق کی بے چینی اور محبوب کے تغافل کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہا ہو اس وقت ایمان کہتے ہیں۔

دل کے ایمان کی صبا خبر لے جلدی　　　کیا بری طرح تڑپتا ہے یہ نخچیر قفس

شکوہ و شکایت عاشقوں کا شیوہ ہے۔

الگ ہی سیر کو گلشن کی تو گیا پیارے ادھر میں راہ تری دیکھتا رہا شاباش

یہاں شاباش کہہ کر کیا اچھی داد دی ہے۔

محبت کا اقتضا یہ ہے کہ درد و کرب سے خاموش گھلے جاؤ مگر نالہ و فریاد نہ کرو۔ ایمان کہتے ہیں۔

پروانہ ساں خموش ہیں جانباز عشق یاں اے عندلیب نالہ و افغاں نہیں ہے شرط

عاشقی میں پروانہ کی طرح خاموش گھل گھل کر مرجانا محبت کی معراج ہے، بلبل کا نالہ و شیون اسکی کمزوری کی دلیل ہے پروانہ اور بلبل کے عشق کے فرق کو یقین نے خوب ظاہر کیا ہے۔

یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا تکلف برطرف بلبل کو پروانہ سے کیا نسبت

ایمان نے اس فرق کو ایک قطعہ میں ظاہر کیا ہے۔

شمع محفل نے ایک رات کہا دیکھ پروانہ کو بسوز و گداز
وہ جو ہے عندلیب عاشق گل آہ نالہ سے ہے سدا دمساز
چپ ہی چپ تو جو دے ہے جاں عزیز ہم پر اتنک کھلا نہیں یہ راز
سن کے پروانے نے پڑھا ایماں آہ یہ شعر سعدئ شیراز

عاشقاں کشتگان معشوق اند
بر نیاید ز کشتگاں آواز

دیگر شعرا کی طرح ایمان نے بھی عاشقانہ خیالات کے اظہار میں خوب دریا دلی سے کام لیا ہے اہل ذوق حضرات کے لئے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

پامال کر کے خاک میں ظالم چلا گیا مانگا جو اپنے دل کو میں اس دلشکن سے کل
ہم کبھو جو تجھ سے کرتے ہیں محبت کا گلہ دل کو بھاتی ہے تری اے شوخ جھنجھلانے کی طرز
رقیب سے نہیں چھٹتا ہے یار کا اخلاص کہ ناگزیر ہوا گل کو خار کا اخلاص

رقیب اور معشوق کے اخلاص کی مثال پھول اور کانٹے کے تعلق سے دینا تمثیلی شاعری کی بہترین مثال ہے۔

جاتا رہا ہے دل یہ تڑپتا ہے جی ہنوز — دلال پھنس رہا ہے خریدار کے عوض
ہزار شیشۂ دل پاش پاش ہو جائیں — کسو کی چیز کو تیری بلا رکھے محفوظ
اب جو دو ہنس کے لاتا ہے لگا ہیں ایدھر — کچھ تو پھونکی ہے مری آہ نے تاثیر میں جان
مشہد پہ میرے آ کے دامن کشاں چلا — اللہ رے سنگر خونخوار کا گھمنڈ
مجلس میں تیری کاوش مژگاں کے ہاتھ سے — غنچہ نمط ہر ایک جگر لخت لخت تھا
انصاف ہے کہ غیر ہنسیں تیری بزم میں — جوں شمع میری چشم رہے اشکبار حیف
بھڑا ہی جائے ہے قاتل کی تیغ ابرو سے — بھلا کہو تو کوئی دل کو کیا رکھے محفوظ
خسرو سے ادھر جنگ ادھر کوہ سے کاوش — دیکھا ہی نہیں ہم نے کوئی فرہاد سا بانکا
کچھ سرخ جو ہے رنگ مرے اشک رواں کا — شاید کوئی ٹوٹا دل مجروح کا ٹانکا

جگر مرادآبادی نے اسی مضمون کو باندھا ہے

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ — کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا

اہل ذوق حضرات ایمان کے اور جگر کے شعر میں ضرور فرق محسوس کرینگے، مگر ایمان کی زبان ایک صدی پہلے کی زبان ہے اور مضمون کی اولیت کا سہرا تو ایمان ہی کے سر رہیگا۔

معشوق کی حسن کی تعریف اور اسکے سراپا کی تصویر کشی ہماری شاعری کا خاص موضوع ہے، ہر شاعر اپنی نقدُ پھر اس ذخیرۂ حسن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے۔ ایمان نے بھی حسن افزینی کی ہے۔ چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

اس قدر اے سرو قامت مت خرام ناز کر — خوف ہے مجھکو یہی حشر ہو برپا نہ کہیں
آتی نہیں ہے یکسر مو بھی خیال میں — کتنی کمر ہے آپکی تقصیر ناتواں

تقصیر حیدرآباد میں دو مضمون میں مستعمل ہوتا ہے ایک تو قصور یا خطا کے مضمون میں جو ہر جگہ استعمال

ہوتا ہے۔ دوسرے طنزاً صاحب یا جناب کے معنوں میں۔

کیوں نہ طاؤس ہو ترے قرباں　　　سر سے لے پاؤں تک چمن ہے تو
دیکھ لیں ہم نے شوخیاں تیری　　　یا ہرن یا کہ منہرن ہے تو
فصل بہار میں بھی یہ حسن گل نہ دیکھا　　　ہے جس قدر کہ اس کے جوش شباب منہ پر

ایمان نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں، حسن و عشق کی واردات اور معاملات عشق کا بڑے اچھے طریقہ سے اظہار کیا ہے۔

رات دیکھا میں اک کوچہ میں　بدرِ تاباں یا کہ مہر انور تھا　جس طرح آسمان پر تارے　یوں چمکتا تھا جو کہ زیور تھا
حلقہ تنجہ خصوص مکھڑے پر　عید کا جوں ہلال اظہر تھا　شاہزادہ تھا یا شہنشاہ تھا　حسن کا جس کے ساتھ لشکر تھا
شوکت و شان کیا کہوں اسکی　صاحبِ تاج و تخت و افسر تھا　غنچہ گلعذار نرگس چشم　گلشنِ حسن کا صنوبر تھا
وہیں ایک دو قدم خراماں چل　پھر گیا اس طرف جدھر گھر تھا　سایہ ساں میں بھی لگے ساتھ چلا　جب کہ پہنچا وہاں جہاں در تھا
فی البدیہہ یہ شعر حسب حال پڑھا　پہنچا اس گوش تک کہ گوہر تھا　مرغ دل بسکہ آہ مضطر تھا　اوڑ گیا اب تو گرچہ بے پر تھا
سنتے ہی پھر کھڑا رہا یک بار　شعر تھا یا فسوں تھا منتر تھا　کہنے لاگا تو کون ہے اے شخص　جان کا اپنے کچھ تجھے ڈر تھا
تب کہا میں غلام ہوں تیرا　شوق دیدار تھا مجھے گر تھا　بول اٹھا پھر تو چل ہمارے ساتھ　برج الطاف کا وہ اختر تھا
لے گیا جس جگہ وہ ہاتھ پکڑ　بہتر از قصر لعل و گوہر تھا　تھا بچھا اک وہاں پلنگ ایسا　تخت نیلم سے جو برابر تھا
جبکہ ہم دونوں ملکے جا بیٹھے　پوچھنا کیا ہے پھر تو اظہر تھا　عیش و آرام خوب ہی لوٹے　بسکہ وہ مہر ذرہ پرور تھا
تجھ سے ایمان تا کجا کہیے　قصہ کوتاہ ورنہ دفتر تھا

تصوف و تفلسف ہمارے یہاں مسئلہ جبر و قدر ایک لاینحل مسئلہ ہے، مگر ہمارا ہر صوفی شاعر اس مسئلہ پر ضرور روشنی ڈالتا ہے، درد کا شعر ہے۔

وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر　　　مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں

ایمان کہتے ہیں ۔

عرصۂ ہستی میں کچھ مختار ہوں بھی اور نہیں　　　سایہ آسا صاحب رفتار ہوں بھی اور نہیں

صاحب دل، ظاہر بیں لوگوں کی طرح کعبہ و دیر کی راہ سے منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے دل کا ہر ذرہ آفتاب ہوتا ہے جس میں انوار الٰہی کا پرتو جھلکتا نظر آتا ہے ۔ درد نے کہا ہے ۔

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو　　　درد منزل ایک تھی کچھ راہ ہی کا پھیر تھا

ایمان کا شعر ہے ۔　شیخ کعبہ کے در و دیوار میں کیا خاک ہے ۔ خانۂ دل سے ہے اپنے اتصال کوئے یار

معرفت کے مختلف مدارج کے بعد جب ایک صاحب دل اس منزل پر پہنچتا ہے کہ جہاں اسکی دل کی وسعتیں کائنات کے طول و عرض سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں اور اسکی نظریں وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں فرشتوں کا وہم بھی پر مار نہیں سکتا ۔

وہم فرشتہ کا نہ پہنچے جہاں　　　پہنچا ہے وہاں حضرت انسان جا

درد کا بھی ایک شعر ہے ۔

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر　　　آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں

اس وقت اسکی قوت پرواز تیز تر ہوتی جاتی ہے ۔

کریں شاخ طوبیٰ پہ جا آشیانہ　　　اگر اپنے ہم بال پر آزمائیں

غالب نے کہا ہے ۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی　　　ورنہ میں ہر لباس میں ننگ وجود تھا

ایمان کا شعر ہے ۔　خلقت ہستی ہی جس کو تنگ ہے ۔ بند میں جامہ کے رہنا ننگ ہے

شوخی | ایمان نے شوخ نگاری میں بھی اپنے کمال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے ۔ کہتے ہیں ۔

مجھ سے تو راز عشق کا افشا نہیں ہوا　　　لیکن چلے ہی جائے ہے تاکید اب تلک

اور پھر کس مزے سے کہتے ہیں۔

جب کہوں میں کہ کروں جی قرباں — ہنس کے کہتا ہے کہ ہاں بہتر ہے

اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک تجربہ کار عاشق اپنے سادہ لوح معشوق کو کس طرح عاشقوں سے ملتے رہنے کی استدعا کرتا ہے تو اس شعر میں دیکھ لیجئے۔

جو ہزار بولے کوئی کہ نہ ملیو عاشقوں سے — تو نہ کیجیو پیارے یہ خیال خام ہرگز

خیال خام کہہ کر سادگی کی انتہا کردی۔

ہماری شاعری کا معشوق ایک شکاری ہوتا ہے جو تیر و کمان باندھ کر اپنے شکاروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ جہاں کوئی زد میں آیا بس اس نے وہیں اُسے شکار کیا اور اپنے فتراک میں ڈال لیا۔ معشوق تیر و ترکش سے آراستہ ہوکر نکل رہا تھا، ایمان سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں "اگر اجازت ہو تو میں بھی حضور کے ہمراہ جلوں کہ آپ شکار کریں تو میں ان خدنگ زدہ نیم جانوں کو جلد جلد جمع کرتا پھروں" اسکی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں۔

نکلے جب تیر و کماں وہ صید افگن باندھ کر — میں جلو میں کیوں نہ تب حاضر ہوں دامن باندھ کر

یہ تھی ایمان کی غزل گوئی، مگر ان کی طبع رسا نے غزل سے زیادہ دوسرے اصناف سخن میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ مر گئے مگر ان کا کلام اب تک زندہ ہے اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اور ان کی یہ آرزو پوری ہوی جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

ایمان اور کچھ نہیں مقدور اگر تجھے — عالم میں یادگار تو اپنے سخن کو چھوڑ

رباعیات | ہمارے یہاں غزل گو شعرا کی کمی نہیں۔ مگر ایمان کے ہم عصر شعرا میں خواجہ میر درد کے سوا شاید ہی کوئی رباعی گو شاعر گذرا ہو۔ زبان و اسلوب کے لحاظ سے ایمان کی رباعیات اپنے زمانہ کی بہترین پیداوار کہی جاسکتی ہیں۔ رباعیات میں ان کا اسلوب بیان اتنا سادہ اور شگفتہ ہے کہ جس سے زیادہ کی توقع نہیں کیجا سکتی۔ اس میں شک نہیں ایمان کی رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں۔ کوئی اخلاقی تعلیم یا دقیق نکتہ کا بیان نہیں

مگر شاعری ہے اور شاعری کے ساتھ زبان کی خوبی اور صفائی۔ ایمان نے زیادہ رباعیاں عاشقانہ کہی ہیں۔ خمریات کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں اخلاق و تصوف کے علاوہ تولائے حسین میں بھی چند رباعیاں ہیں۔ غرض اسلوب اور زبان کے لحاظ سے انکی رباعیات اردو کی اچھی رباعیوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

درکار ہے مجھکو تجھہ سے ملنا لیکن　　　دشوار ہے مجھکو تجھ سے ملنا لیکن
بے تاب ہے دل نہ مل تو مجھسے ہرچند　　　یکبار ہے مجھکو تجھ سے ملنا لیکن

درکار کے ساتھ دشوار کہہ کر اپنی ضرورت اور مجبوری کا اظہار کس مزے میں کر گئے ہیں اور پھر یکبار کی لازمیت نے مضمون کو کتنا بلند کر دیا ہے۔ موعظت میں ایک رباعی ہے۔

دنیا کے نہ مال و زر سے ہو تو مانوس۔ شمع کا نور ہو یا بلوریں فانوس — قاروں کی طرح سوائے گنج حسرت۔ کچھ اپنے نہ ساتھ لے گیا دنیا تو میں

عاشقانہ　　ہو عشق کے ہم سر نہ کبھی حرص و ہوس　　　پروانہ کے منصب کو نہ پہنچے ہے مگس
معشوق کا در اصل تغافل ہے محک　　　ہو جس سے دریافت ہر ایک نا کس کس

سرمد کی رباعی ہے۔　　سرمد غم عشق بو الہوس را نہ دہند　　　سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار　　　ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

اہل ذوق ایمان کی شاعری کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

سو بار اگر روٹھ گیا ہے مجھ سے　　　پھر آپ سے ہی آن ملا ہے مجھ سے
ہیں ناز کے انداز ہزاروں اس میں　　　کہتا ہے یہ کون کہ وہ خفا ہے مجھ سے
ٹک آنکھ لگی ہے شب کو روتے روتے　　　دیکھا سپنے میں تجھ کو سوتے سوتے
پر آنکھ جو کھل گئی یکایک جوں شمع　　　جان آگئی لبوں پہ صبح ہوتے ہوتے

کس درجہ درد و اثر میں ڈوبی ہوئی رباعی ہے — معاملات عشق میں وہ یوں گویا ہیں۔

از بسکہ رقیب سے نپٹ ڈرتا ہوں۔ کوچہ میں ترے قدم نہیں دھرتا ہوں　　ناچار کیا ہوں ضبط دل کو اپنے　　ہرچند کہ ملنے کے لئے مرتا ہوں

غیروں کی سنو مزہ سے ساری باتیں — اور تلخ لگیں تمھیں ہماری باتیں
اوڑتے ہو یہ کس سے باز آؤ صاحب — ہم خوب سمجھتے ہیں تمھاری باتیں

کتنا شگفتہ اندازِ بیان ہے۔ اب ایمان کو ایک رندِ مئے نوش کی حیثیت سے دیکھئے۔

جس دم کہ ہوائے ابرِ بنگالی ہووے۔ شیشہ میں شرابِ پرتگالی ہووے۔ اللہ ہی اللہ ہے اسوقت اگر۔ آغوش میں یار لاؤ بالی ہووے

یہاں "اللہ ہی اللہ" سے زیادہ کونسا لفظ موزوں ہوسکتا ہے۔

اے ساقیٔ بزمِ عیش و عشرت بنیاد — ہے دور میں تیرے مست ہر اک دل شاد
ایک شیشہ ادھر بھی بھیج دیجیو گا ہے — خم خانہ ترا مدام رہیو آباد

وعدہ جو کیا ہے سو شتابی بھیجو۔ پر شرط ہے یہ کہ انتخابی بھیجو۔ دیکھے سے ہو نشۂ مسرت جسکے۔ اک ایسی شراب کی گلابی بھیجو
پھر ویسا ہی بھیجو ایک مل کا شیشہ۔ جوں غنچۂ گل، گل کا شیشہ — منظور ہے یہ کہ مثل جامِ جمشید — رکھے احوال جزو کل کا شیشہ

ایمان کی حسن آفرینی ملاحظہ ہو۔ وہ ماہ جبیں ہے اسکا زیبا منظر — ہوتا ہے خجل رنگ سے لعلِ احمر
نقشہ کے لئے مصورِ قدرت نے — یاقوت کو حل کیا بہ آبِ گوہر

اس ماہ جبیں کا اسکا روشن ہی جمال — ابرو کو ہوا دیکھ کے شرمندہ ہلال — گل بھول گیا ہے نسبت عارض سے — تشبیہ سے قامت کے ہوا سرو نہال
آنے کی جو گلبدن کے پائی آہٹ — نرگس کی گئی چمن میں نیند اچٹ — شمشاد نے سرو قد غرض کی تعظیم — غنچے لینے لگے بلائیں چٹ چٹ

شہادتِ حسینؓ پر ایمان کی نوحہ خوانی۔ ماتم میں شہیدِ کربلا کے واللہ — پہنا ہے لباس آسماں نے بھی سیاہ
تشریف وہ لائے کلبۂ احزاں میں — رونا جسے منظور ہو اور نالہ و آہ

ہے مجلسِ ماتمِ شہیدِ اکبر — سرگرم ہے جوں شمع ہر اک رونے پر — تشریف لے آئیے کہ اس ماتم میں — ہر دانۂ اشک ہے بہ از گوہرِ تر
کچھ صبح کا اس غم سے گریباں ہی نہیں چاک — ایشام بھی کھولے بال اڑاتی ہے خاک — شبنم کے برسنے سے یہ ہوتا ہے یقیں — ماتم میں حسین کے ہے گریاں افلاک
اب غم سے حسین کے جگر پانی ہے — جو چشم ہے سو وہ ابرِ نیسانی ہے — لانا تشریف آج شب کو کہ جہاں — ماتم ہے بکا ہے مرثیہ خوانی ہے

نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کی سالگرہ مبارک پر ایمان نے یہ رباعی کہی تھی۔

ہردم ہو شہنشاہ کو مولا کی مدد اور زندگی خضر و نشاط سرمد یوں سالگرہ سے ہووے عمر فزوں جوں صفر کے دینے سے ہو وہ چند عدد

دعا میں کتنی جدت اور لطافت ہے۔ جشن نوروز پر رباعی کہی ہے۔

جشن نوروز میں مبارک ہووے شاہان کیاں کی جانشینی تجھ کو تو وہ ہی چراغ دودمان کسریٰ روشن ہوا جس سے خاندان کسریٰ

اعظم الامرا ارسطو جاہ کی سالگرہ کی رباعی۔ تو وہ ہے امیر اعظم و بندہ نواز کہیئے جسے ابنائے زماں میں ممتاز

یوں سالگرہ سے عمر یارب ہو فزوں جیسے کہ گرہ سے نیشکر ہو دراز

ایمان نے ایک مثلث، چھ مخمس اور ایک مسدس بھی کہا ہے۔ مثلث کا ایک بند ہے جس میں انہوں نے شاعرانہ تعلی کا اظہار کیا ہے۔

جو سخن کہ ہو سامان بہتر از در مرجان طرز یہ نہیں آساں طبع ہے کہ ہے نیساں

شعر کا ترے ایماں لفظ ہے ہر اک گوہر

ایک مخمس کا ایک بند ہے جس میں ایک بت فرنگی کی اس طرح تعریف کی ہے۔

چمن کے روبرو تیرا ہے یہ رخسارۂ گلگوں لبوں میں ہے چھپا گویا مسیحا کا دم موزوں جہاں کے ہوش ہیچ مارا ہی زلفوں نے ترے شبگوں تری ہی تیغ نگہ کا ہو فرنگی زادہ کشتہ ہوں

مجھے کہہ عشق دین ظالم شراب پرتگالی میں

مسدس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ایمان آدمی کو کچھ ایک درد خوب ہے یعنی سرشک سرخ و رخ زرد خوب ہے لب پر برنگ صبح دم سرد خوب ہے پیدا کرے جو سوز وہی مرد خوب ہے

ہووے نہ ملک عشق سے کم زہم داغ دل روشن رہے الٰہی ہمیشہ چراغ دل

مثنویات

مثنوی سارے اصناف سخن میں اپنی وسعت کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں داخلی کے ساتھ خارجی شاعری بھی کیجا سکتی ہے۔ ایک کامیاب مثنوی نگار ایک بہترین مصور ہوتا ہے جو جا بجا واقعات اور مناظر قدرت کی تصویروں سے اپنے بیان کو مزین کرتا چلا جاتا ہے، اسکے ساتھ ہی اسے سورج کی کرن کی سی تیز نظر ملجاتی ہے جس سے وہ فطرت کے گہرائیوں کے راز آشکار کرتا رہتا ہے۔ ہمالی اردو میں بہت ہی کم کامیاب مثنوی گو گزرے ہیں، میر حسن، اثر، شوق اور نسیم اردو کے مشہور مثنوی نگار ہیں مگر ان سب میں میر حسن کا درجہ بلند ہے اور یہ سب فارسی مثنویوں کی تقلید کرتے ہیں۔ ایمان بھی میر حسن ہی کے ہمعصر تھے مگر ان کی مثنویوں پر فارسی سے زیادہ

قدیم دکھنی مثنویوں کا اثر غالب ہے۔ مثنوی میں ہی شاعر کامیاب ثابت ہو سکتا ہے جو داخلی اور خارجی دونوں طرز کی شاعری پر پوری قدرت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ میر ایک بلند پایہ مثنوی نگار نہ بن سکے انکی مثنوی نگاری میں داخلی شاعری کا عنصر غالب ہے اور اسکی وجہ انکی کامیابی غزل گوئی تھی۔ ہماری مثنویوں میں منظر نگاری کی کمی عام ہے چند ہی مثنویاں ایسی ہیں جن میں منظر نگاری کامیاب نظر آتی ہے ایمان کی مثنویاں چھوٹی چھوٹی ہیں، ان میں کسی قصہ یا واقعہ کا بیان نہیں، مگر منظر نگاری کے ساتھ واردات دل کی داستانیں مذکور ہیں۔ اسلوب زبان کے اعتبار سے بھی ایمان کی مثنویاں کافی بلند ہیں، زبان صاف اور طرز بیان شگفتہ ہے تشبیہوں میں سادگی اور لطافت ہے۔ کلام میں ربط اور تسلسل کا خیال رکھا ہے مبالغہ بھی کیا ہے مگر واقعیت سے دور ہٹ کر نہیں کہ لغو معلوم ہونے لگے۔ ایمان کی مثنویوں میں بعض جگہ مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ انکی زیادہ طویل و استادانہ مثنوی برق تاب یا برسات نامہ ہے، اس میں انکا زور بیان، مبالغہ اور تشبیہوں کی لطافت قابل داد ہے۔ مثنوی برسات کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ایسے ہم آہنگ الفاظ کا استعمال کیا ہے جسکی وجہ سے انکے بیان میں برق کی تڑپ اور دھواں دھار بارش کا ساز و شور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ مثنوی فارسی سے زیادہ دکھنی مثنویوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ کوئل کی کوک اور پپیہا کی پی کہاں کے ساتھ ساون کی دلفریب گھڑیوں میں جھولوں کی بہار اور پھر ٹھمری اور دادرے کے الاپ کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ساری دنیا محو طرب ہوتی ہے مگر شاعر ہجر کی صبر آزما گھڑیوں کی بے چینیوں میں پڑا سسکتا ہے آخر میں محبوب سے ملنے اور ایک جا ہونے کی خواہش پر مثنوی ختم ہوتی ہے۔ "مثنوی برق تاب" اس طرح شروع ہوتی ہے۔

عجب برسات کی ہے فصل پیاری کہ جسکا فیض ہے عالم میں جاری
لکھوں کس رنگ سے تعریف اسکی کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہے ابری
اگر صفحہ پہ کھینچوں جدول سیم رواں ہوتی ہے مثل جوئے تسنیم

زور بیان ملاحظہ ہو۔

ہجوم ابر کا ہے اس قدر جوش کہ ہے خورشید بھی عالم سے روپوش
جو طوفان آب کا ہے غرب تا شرق مہ نو کی بھی کشتی ہو گئی غرق
تلاطم بسکہ تا چرخ بریں ہے نہنگ کہکشاں بھی نہ نشیں ہے
حباب ساز مانہ کا ہے اسباب زمیں تا آسماں ہے عالم آب
عروج آب کا اتنا ہے طوفاں پھریں بہتے بروج حوت و سرطاں

برق کی چمک سے اچھے اچھوں کی نظریں جھپک جاتی ہیں اور اسکی کڑک بڑے بڑوں کا دل ہلا دیتی ہے۔ ایمان نے اس کیفیت کے اظہار میں

سادہ تشبیہوں کے استعمال سے حسن پیدا کر دیا ہے۔ نہیں یہ برق اب چمکی ہے ناگاہ   دلِ مجنوں کی آتش ریز ہے آہ

شرارِ تیشۂ فرہاد یا ہے   کہ جس نے بیستوں کو شق کیا ہے

یکایک برق جب کڑکے ہی بے باک   دہمک جائے حصارِ ہفت افلاک

سیاہ بادلوں کے ہجوم سے دنیا پہ تاریکی چھا جاتی ہے۔ موسم شکن اور فضا صہبا بدوش ہو جاتی ہے۔

اگر ابرِ سیاہ کوہ و ہاموں   نہیں ہے دود آہ رشکِ مجنوں   نہیں ہر گز شبِ تیرہ سیہ پوش   سویدائے دلِ مجنوں کا ہے جوش

سیہ خیمہ ہے لیلیٰ عرب کا   سواد وادی عالم میں برپا ۔ قوس قزح کی دلاویزی اور شفق کی سرخی موسم کی خوشنمائی میں اضافہ کر دیتی ہیں

ہو قوس قزح از بسکہ زہ گیر   برستے ہیں عجب قطرات کے تیر   شفق ابرِ سیہ میں نہیں ہے غلطاں   ملا ہے خاک میں خونِ شہیداں

بارش کے فیض سے جنگلوں میں سوائے سبزے اور ہرے بھرے درختوں کے نظر کیلئے کوئی چیز ہوتی ہی نہیں قوت نمو کا یہ عالم ہوتا ہے کہ نوکِ خار سے بھی گل پھوٹا پڑتا ہے یہاں ایمان کی شاعری میں عرفی کی سی ژرف نگاہی پیدا ہو گئی ہے۔

ہے آتش سنگ میں اسکے نایاب   شرر کے جائے نکلے قطرۂ آب   یہ دشت و در میں بارش کا اثر ہے   کہ خارِ خشک بھی نشتر گلاں تر ہے

سمندر کے یہ سنتے ہیں پانی   ہوا جاتا ہوں میں بھی پانی پانی   جہاں شمشیر میں جوہر عیاں ہے   بہ رنگ سبزہ و آب رواں ہے

بجائے بید مجنوں ہے مکاں میں   ہوئی قوس قزح پیدا جہاں میں   نہیں جگنو چمکتے ہیں یہ سارے   پڑے افلاک سے ہیں ٹوٹ تارے

ایمان منظر نگاری اور موسم کی کیفیت و خصوصیت کے بیان میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ اہل نظر فرما سکتے ہیں۔ یہاں سے ساقی نامہ شروع ہوتا ہے۔

ادہر لا کشتیِ مے جلد ساقی   جہاں کے ڈوبنے میں کیا ہے باقی   تشنابی آکہیں اس وقت ساقی   ہے تیری سرد مہری نے لیا جی

اسکے بعد ایمان اپنی ہجر اور فراق کی داستان بیان کرتے ہیں۔ عاشق کے ہجر کے لمحات یوں بھی نہیں گذرتے مگر برسات کے موسم میں انکا گذارنا بڑی ہمت کا کام ہے اور پھر دوسروں کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر شوق وصل تیز تر اور وقت کاٹنا دشوار تر ہو جاتا ہے۔

یہ رت بدلی ہے جب سے جی گھٹا ہے   کہ وہ خورشید رو مجھ سے جدا ہے   ادھر یکبار بجلی کا کڑکنا   غضب ابر دہر ہر دل کا دھڑکنا

خدایا ہجر سے کیونکر ہوں رستہ   مجھے قوس قزح آرہ ہے سر پہ   اندھیری رات ساون کی ڈراوے   ادھر بجلی جدا ہی آنکھیں دکھاوے

[illegible]

عجب اک کشمکش کے دام میں ہوں　　کہ اک دم بھی نہیں آرام میں ہوں
سنو پی پی پپیہا کی جب آواز　　کرے ہے مرغ جاں قالب سے پرواز
جدھر دیکھو ادھر کیا کہوں میں　　هنڈولوں پر پری رو جھولتے ہیں
نظر اس رنگ میں حسن کب آوے　　ہوا پر اک بجلی چمک جاوے
حنائی دست و بازو پر طلائی　　شفق میں جوں کرن کی روشنائی
کہیں ساون کی ہے آواز دلکش　　فرشتے کو سنے سے جس کی ہو غش
کہیں ٹھمری کسی جا دادرا ہے　　کہ ٹک سنتے ہی جس کی جی ہوا ہے
پری رو سب مکاں میں ہو کے اب جمع　　برنگ صحبت پروانہ و شمع
کریں بالکل یکایک گرم جوشی　　مہیا سب ہے بزم بادہ نوشی
جہاں میں جا بجا ہے راگ اور رنگ　　جسے دیکھو نواب ہے عیش آہنگ

آخر میں مثنوی اس دعا پر ختم ہوتی ہے ـــــ

رہے کب تک مری کشتی تباہی　　مجھے دے وصل کی دولت الٰہی
جہاں میں جب تلک ابر و ہوا ہے　　یہی ایمان کی یا رب دعا ہے
وہ میرا مہرباں اور میں ہوں ہر اک دم　　رہیں ابر و ہوا کی طرح باہم

مثنوی بیتاب نامہ اس مثنوی میں برسات نامہ سے زیادہ سلاست اور روانی ہے مثنوی جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے،
دل کی بے چینی اور بے تابی کی داستان ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے۔

سرو گلزار آشنائی　　جان شیریں دلربائی
رہیو مجلس میں تیری جوں گل　　لبریز نشاط ساغر مل
تیرا ہے خیال اسکو دن رات　　خوش آتی نہیں کسی کی بھی بات
آنکھوں میں پھرے ہے تیری صورت　　دل میں ہے بھری ہوئی محبت
ہر صبح یہی دھیان ہوگا　　کس جائے وہ مہرباں ہوگا

یہ مثنوی ایمان کے اسلوب و زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ زبان سادہ اور خیالات پاکیزہ ہیں، اس میں خارجی سے زیادہ داخلی شاعری کا عنصر غالب ہے۔ ایک ہجر نصیب عاشق کا دن تو جوں توں گذر جاتا ہے مگر رات اضطراب اور بے چینی میں کٹتی ہے

جب لطف کشا عروس شب ہو　　آفت ہو عذاب ہو غضب ہو
ہے داغ سے دل کے گرم بستر　　درکار نہیں ہے نرم بستر
جوں شمع تمام شب ہے رونا　　جلنا ہے یہاں کدھر ہے سونا
گاہے جو پلک جھپک گئی ہے　　تجھ پر ہی نظر اٹک گئی ہے

انداز بیان کس قدر واقعیت پر مبنی ہے۔ ایک عاشق مہجور اپنے محبوب کی یاد میں بے چین تڑپ رہا ہو اگر اسوقت اسکی ذرا کی ذرا آنکھ لگ جائے تو جو چیز اسکی خواب کی دنیا میں جلوہ گر ہوگی وہ اسکا محبوب ہوگا جو بیداری میں اس کے

خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خواب کے ان چند خوشگوار لمحات کے بعد بیداری بے چینیوں میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ اس بیان پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے

پر آنکھ جو کھل گئی ہے ناگاہ　　آیا نہ نظر وہ یار دلخواہ　　تا صبح قرار پھر نہ آیا　　وہ رشک بہار پھر نہ آیا

ہو جان پر اس قدر تباہی　　جیسے کہ چراغ صبح گاہی　　لازم ہے خبر شتاب لینا　　مرتے کو جلا، ثواب لینا

ہم ہیں اور باد مہربانی　　کہیو قاصد یہی زبانی　　سوئے ایمان ہم نگاہی　　بیہم گر نیست گاہ گاہی

مثنوی اشتیاق نامہ - یہ ایمان کی تیسری مثنوی ہے۔ باد صبا کی زبانی اپنا پیغام محبوب تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

اے نسیم بہار نوروزی　　تجھ سے آتی ہے بوئے دلسوزی　　تجھ سا اس جہاں میں تو کہیں　　کوئی دمساز عاشقوں کا نہیں

کون تجھ بن ہے نامہ بر اپنا　　یا ہوا خواہ و داد گر اپنا　　جا کے اس گلعذار سے کہیو　　مونس و غمگسار سے کہیو

اے گل نو بہار باغ وفا　　در یکتا ہے بحر صدق و صفا　　پھر کہ آیا جہاں میں موسم گل　　چہچہاتے ہیں باغ میں بلبل

کوئلیں کوکتی ہیں چار طرف　　مور جھولا ہے اب ہزار طرف　　رات ہے چاند سے چکور دو چار　　اور پروانہ شمع پر ہے نثار

چکور اور پروانہ کو اپنے دل کے حوصلے نکالتا دیکھ کر شاعر کے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ ہجر نصیب ہے۔

زور والی بسنت کی رات اب　　ایک عالم ہے محو عیش و طرب　　دیکھتا ہوں جسے بقدر حال　　یار سے اپنے خوش ہے لا کلام

پر ہے ایمان کو یہ حیرانی　　مجھ سے کیوں دور ہے مرا جانی　　کس سبب آسماں ہے برسر کیں　　میں بھی یارب جہاں میں ہوں کہ نہیں

کب خوش آتا ہے سیر باغ مجھے　　دے ہے لالہ جگر پہ داغ مجھے　　جب نسیم بہار چلتی ہے　　تیر سی دل سے ہو نکلتی ہے

دل میں سلتا ہے بار بار مجھے　　ہر رگ گل سے خار خار مجھے

دل میں سلنا، دکنی محاورہ ہے یعنی دل میں کھٹکنا۔ گل سے خار کسی حالت میں بھی جدا نہیں رہتا، شاعر خار کی اس خوش نصیبی پر رشک کرتا ہے

دیکھ کر چاندنی کو روتا ہوں　　جوں کتاں چاک چاک ہوتا ہوں　　مور پر جب صدائے کوئل ہو　　ریشہ ریشہ وہیں مرا دل ہو

راگ سنتا ہوں جب کہیں ہنڈول　　میں ہوں مجلس میں ڈانواں ڈول　　کوئلوں کی سنوں ہوں جب کوکیں　　دل سے اٹھتی ہیں دمبدم ہوکیں

یا الٰہی ملا شتابی تو　　اس گل نو بہار سے مجھکو - اسکے بعد معشوق کی تعریف میں کچھ شعر کہے ہیں اور اسطرح مثنوی ختم کی ہے

اس سوا کب رات سہانی ہے　　کون کافر کو آہ بھاتی ہے　　اب کہیں جلد ہو بدل یارب　　وصل کے دن سے ہجر کی شب

مثنوی فراق نامہ یہ چوتھی مختصر مثنوی ہے۔ ایمان کی ان تین مثنویوں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے ان تین مثنویوں کے لئے ایک ہی عنوان کافی تھا مگر ایمان نے مختلف عنوان قائم کرکے اپنی موزونیٔ طبع کی داد چاہی ہے۔ اس مثنوی میں زباں کے ساتھ شاعری مکمل ہوگئی ہے۔

سراپا کرم گستر و مہرباں　　الٰہی سلامت رکھے جاوداں　　تمنا یہاں تک ہے دیدار کی　　کہ طاقت نہ تحریر و گفتار کی

مثال آئینہ کے یہاں تا بکے　　قسم ہے ملی نہیں تا بکے تلک　　چلے جب چمن میں نسیم سحر　　تو کہتا ہوں اس دم بہ دم سرد کر

صبا عرض کیجیو تو بعد سلام　　کہ ایمان کا ہے یہی اب پیغام　　اگر باغ میں دیکھے شمشاد کو　　کرے یاد اس سرو آزاد کو

سدا دن اسی طرح جاوے گذر　　چھپے جب کہ خورشید نکلے قمر　　کرے آہ کو مشتعل جوں چراغ　　دکھاوے ستاروں کو سینہ کے داغ

نظر جب کرے ہے ستاروں پہ وہ　　تو لوٹے سحر تک انگاروں پہ وہ　　غرض طرفہ غم میں گرفتار ہے　　کہ جینے سے بھی اپنے بیزار ہے

اپنی حالت زار کے اظہار کے بعد مثنوی ختم ہوتی ہے۔

شتابی خبر لو برائے خدا　　نہیں تو کوئی دم میں مرتا ہوا

قصائد ایمان کے قصائد میں تخیل کے ساتھ زور بیان پایا جاتا ہے بعض جگہ الفاظ کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے ان قصائد سے اس زمانہ کے حالات اور ریاست کے نظم و نسق پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ ایمان کے اس کلیات میں کل سات قصیدے موجود ہیں (۱) قصیدہ در نعت سید المرسلین (۲) در منقبت جناب امیر المومنین (۳) در مدح خسرو دکن نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۴) قصیدہ مشتمل بر جشن نوروز و سالگرہ اس میں ایک بہاریہ قصیدہ بھی کہا ہے (۵) قصیدہ مہتابیہ (۶) در مدح سردار الدولہ گھانسی میاں (۷) در مدح ارسطو جاہ۔ آصف جاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے وہ زیادہ طویل اور قابل توجہ ہے۔ آغاز قصیدہ۔

شکر للہ اب سعادت پر ہے دور آسماں　　راحت و آرام سے معمور ہے سارا جہاں

دم کرے جو طرفہ باد صبا افسون طلسم　　ہر سحر اقبال لاوے رونما آئینہ ساں

کھولتی ہے شام بھی زلف پھیلائے مراد　　جس کے بوئے عنبریں سے عطر بیز جہاں

تمہید میں کئی شعر کہنے کے بعد اس طرح گریز کیا ہے۔

الغرض ایمان پوچھا میں نے یہ چرخ سے
کس کے عہد راحت مہد سے ہے یہ امن و اماں

یعنی نواب سلیماں قدر و آصف جاہ عصر
عادل و اکرم نظام الملک عالی خانداں

سنتے ہی یہ نام اقدس میں کہا کیا پوچھیے
وہ کریم ابن کریم و یار جوئے صاحب قراں

گوہر درج سعادت افسر برج شرف
جوہر شمشیر جرأت ....

ابتدا سے پرورش پایا ہے میرا گوشت پوست
مو بمو اس کے نمک سے اب تلک تا استخواں

گرچہ شعر و شاعری میں کچھ نہیں مجھکو شعور
پر ادا کرتا ہوں میں حق نمک کو اب یہاں

تو ہے وہ مہر جہاں افروز وہ ماہ مہرباں
روز و شب تجھ سے منور ہے زمیں تا آسماں

کیا بتاؤں جوہر تری شمشیر کا
جس کے قبضہ میں ہے لیکر ہند سے تا اصفہاں

اس قدر ہے دبدبہ اس کا کہ شاہ روم و زنگ
بھیجتے ہیں واسطے تیرے ہمیشہ ارمغاں

چلتے ہیں تیرے جلو میں آفتاب و ماہتاب
جس کو یہ باور نہو وہ دیکھ لے تیرے نشاں

حشر تک یہ دولت و اقبال قائم کیوں نہو
ہیں ترے اعیان و ارکاں بہتر از بسیار گاں

ذکر تیرے رزم کا جوں چاہیے کب ہو سکے
بزم آرائی کی تیری کیا کروں اب میں بیاں

اس قدر ہے جابجا رنگیں لباسوں کا ہجوم
جس طرف دیکھو تو ہے رشک بہار گلستاں

رزم اور بزم کے ذکر میں اپنی شاعری کے خوب خوب جوہر دکھانے کے بعد کہتے ہیں۔

نام رکھ کر اس قصیدہ کا جلوس آصفی
دیں بنا ختم کرتا ہوں دعائیہ یہاں

دوستوں کا دیکھ تیرے منہ پر رنگ صبح عید
غرق حیرت دشمناں جوں دیدۂ قربانیاں

جشن نوروز و سالگرہ پر جو قصیدہ کہا ہے اس میں ایک قصیدہ بہاریہ بھی ہے اسکی تمہید اس طرح شروع کی ہے۔

عجب بہار سے آیا ہے اب کا خرم سال
زمانہ عیش و طرب سے ہوا ہے مالا مال

بیاں وفورِ نشاط و طرب کا کیا کہوں میں
کہ شرق و غرب سے لیکر کے تا جنوب و شمال

نظر میں اتنا ہی دلکش ہے داغ لالہ کا
سیاہ عارضِ گل رخ پہ جیسے ہووے خال

طراوت اتنی ہے فیض ہوا سے عالم میں
ہر ایک سنگ سے جاری ہوا ہے آب زلال

ان قصائد کو دیکھ کر ایمان کی استادی کو ماننا پڑتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، کلام کی سلاست اور روانی تخئیل اور محاکات کی جا بجا رنگ آمیزی نے ایمان کے قصائد کو کتنا وزنی کر دیا ہے۔ اس بہاریہ قصیدے میں انکا زور طبع دریا کا سا جوش دکھاتا ہے اور یہاں ان کی طبیعت اور شاعری کا پورا پورا حسن جھلک پڑتا ہے جب کہتے کہتے وہ خود جھک جاتے ہیں تو اسطرح گریز کرتے ہیں

شرف میں آج ہے خورشید و شاہ میزاں میں
زہے ہمایوں ساعت زہے مبارک فال

بہم ہے شادی نوروز و جشن سالگرہ
بہار گاہ شہ فیض بخش و عدل فصال

سو وہ نظام علی فتح جنگ و آصف جاہ
بلند جس کا ہے جمشید سے بھی جاہ و جلال

سر یر تاج کو زینت ہے ذات اعلیٰ سے
کنیز دولت دنیا ہے اور غلام اقبال

اسی سلسلہ میں ارسطو جاہ وزیر اعظم سے متعلق بھی دو شعر کہے ہیں۔

وزیر اس کا جو ہے بے نظیر والا شان
شجاع و عالم و مجموعۂ تمام و کمال

اسی کی رائے سے ہے انتظام دولت و ملک
اسی کی رائے سے ہے سلطنت کا استقلال

قصیدہ اسطرح ختم کیا ہے

بس آگے عرض کی قدرت نہیں رہی شاہا
کہ صبح و شام ہے ایمان کو یہی اشغال

الٰہی تو ہو مسرت ہو اور دنیا ہو
جہاں کے بیچ با فضال ایزد متعال

یہ دونوں جشن ہیں قائم زمانہ میں جب تک
رہیں یہ شاہ و وزیر آفتاب و ماہ مثال

یہی دعا ہے بحق نبی و علی وصی
کہ سرفراز رہیں دوست اور عدو پامال

یہاں ایمان کے دوسرے قصائد کا ذکر طوالت کے خوف سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس مضمون میں انکی شاعری کا صرف ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ایمان کی شاعری پر بحث کرنے کیلئے ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔



(عمل ناخن تمیز)

نواب سکندرجاہ بہادر آصف جاہ ثالث

ماہ لقا بائی چندا

از

سیّد اختر حسن صاحب اختر



ماہ لقا بائی چندا

ماہ لقا بائی چندا

غلام حسین خاں جوہر (منصبدار) نے ماہ لقا کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاکر ۱۲۲۶ھ میں ایک ضخیم فارسی تاریخ لکھی اور چندا کے نام پر اُس کو 'ماہ نامہ' سے موسوم کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ 'کتب خانہ آصفیہ' میں موجود ہے۔ اس میں مختلف تاریخی حالات کے سلسلہ میں چندا کے خاندانی حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کتاب کے اختتام پر مولف نے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ماہ لقا بائی کی فرمائش ہی پر لکھی گئی تھی۔ چندا کے حالات اور سوانح حیات ہم کو زیادہ تر اسی تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ماہ لقا بائی کا جد اعلیٰ قوم چغتائی برلاس سے تھا۔

ماہ لقا بائی ۲۰ ذیقعدہ ۱۱۸۱ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئی۔ اُس کی خالہ مہتاب کنور بائی کو مدار المہام رکن الدولہ بہادر نے اپنے عقد نکاح میں لے کر "صاحب جی صاحبہ" کا خطاب دیا تھا۔ مہتاب کنور بائی نے لاولدی کی وجہ سے چندا کو گود لے لیا۔ اس طرح ایوان وزارت میں اُس کی پرورش ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے لئے بڑے بڑے باکمال مقرر ہوئے اور ساتھ ہی فن موسیقی کی تعلیم بھی مشہور اساتذہ فن سے دلوائی گئی۔ ماہ لقا، چونکہ ترکی الاصل تھی اسلئے حسن و جمال میں بے مثال تھی، حضرت غفران مآب کی اُس پر خاص نظر عنایت تھی۔ چنانچہ سفر کولاس ۱۱۹۶ھ معرکۂ نرمل ۱۱۹۸ھ اور مہم پانگل ۱۲۱۱ھ میں حضور والا نے چندا کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ آخر الذکر مہم سے واپس ہو کر جشن فتح آراستہ کیا تو چندا کو "ماہ لقا" کے خطاب اور نوبت سے سرفراز فرمایا۔ ہر مجرے کیلئے ایک ہزار انعام مقرر ہوا۔ عطائے نوبت کی تاریخ کسی شاعر نے کہی ہے۔

نوید آمد بہ عالم مہ لقا را	نوازش کرد از نوبت شہنشاہ
ترانہ ساز سالش گفت ناہید	بلند آوازہ نوبت باد دلخواہ

ماہ لقا کے تمول کا یہ حال تھا کہ جب اسکے انتقال کے بعد اسکی دولت کا جائزہ لیا گیا تو عمارات و باغات کے علاوہ نقد و جنس کی قسم سے ایک کروڑ روپے کا شمار ہوا مواضعات   ، سید پلی، حیدر گوڑہ، چندا پیٹھ، پلے پہاڑ، علی باغ اور

"اڈک میٹ" اس کی جاگیر میں شامل تھے۔

کس قدر حیرت انگیز اور پرلطف بات ہے کہ آج جس قطعہ زمین پر جامعہ عثمانیہ کی باعظمت دنیا آباد ہو رہی ہے کبھی اس پر حیدرآباد کی ایک باکمال اور بے مثال عورت اور اُردو کی سب سے پہلی شاعرہ حکمراں رہ چکی ہے، خدا کرے کہ 'اڈک میٹ' کی شعر پرور فضا (جس کو حسن و نغمہ سے یک گونہ فخر انتساب حاصل ہے) عثمانیہ یونیورسٹی کے ہر طالب علم کے دل میں ایک ایسا "جمالیاتی ذوق" پیدا کرنے کا باعث بنجائے جس کی بدولت "زندگی" میں اسکو "حسن و کیف" کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے کہ ترقی اور کامیابی کا راز انسان کے نفاستِ ذوق اور لطافت احساس ہی میں پنہاں ہے۔

ماہ لقا کو تعمیر کا بہت شوق تھا۔ اُس نے اپنے زمانۂ حیات ہی میں ایک لاکھ کے مصارف سے اپنا شاندار مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ مقبرہ "کوہ مولا" کے دامن میں نہایت سرسبز و شاداب مقام پر واقع ہے جس کی مسافت بلدۂ حیدرآباد سے ۵ میل ہے "کوہ مولا" کا پختہ دالان اور وہیں گذرگاہ پر حوض بھی اُسی کی یادگار ہے۔ کمان اِلچی بیگ کی شاندار حویلی اور اُس جگہ ایک مسجد بھی اُسی نے بنوائی تھی۔

ماہ لقا کا احترام امرا اور اعیان دولت ہی کے دلوں میں نہ تھا بلکہ حضرت مغفرت منزل بھی اسکو بے انتہا پسند کرتے اور فرماتے رہتے تھے کہ "مانند ماہ لقا بائی دیگرے بہ این کمالات پیدا شدن مشکل است" نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ بہادر اور مہاراجہ چندولعل ہمیشہ اسکی بہت تعظیم اور آؤبھگت کیا کرتے۔ نواب میر عالم بہادر مدار المہام دولت آصفیہ اکثر کہا کرتے تھے "جلیس باتمیزے بہ این حدت طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا بائی کم دیدہ شد" نواب ممدوح نے فارسی نظم میں اُسکا ایک سراپا بھی لکھا ہے جس میں تقریباً سوا دو سو اشعار ہیں۔

ماہ لقا کی مسافر نوازی اور باکمال ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کے واقعات مشہور ہیں۔ حافظ محمد تاج الدین مشتاق دہلی کے رہنے والے، اور میر درد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ یہ جب حیدرآباد آئے تو ان کے فضل و کمال پر نظر کرتے ماہ لقا بائی نے انھیں اپنے پاس مہمان رکھا اور پھر اُسی کے توسط سے حافظ صاحب نے مہاراجہ چندولعل کے دربار میں رسوخ حاصل کیا جہاں سے دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر شمس الدین فیض کو حافظ مشتاق ہی سے تلمذ تھا

ساٹھ برس کی عمر میں ۱۲۴۰ھ میں چندا کا انتقال ہوا کسی شاعر نے تاریخ وفات کہی جو اسکے مقبرہ پر کندہ ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔ راہیِ جنت شدہ ماہ لقائے دکن۔

ماہ لقا بائی کی یوں تو بہت سی پروردہ لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے صرف "حسین لقا بائی" نے شہرت حاصل کی اسٹیشن حیدرآباد (بڑی لائن) کے قریب محلہ نام پلی میں حسین لقا کا ایک باغ اور مکان ابتک موجود ہے۔ اور یہ کس قدر دلچسپ اور عجیب بات ہے کہ اگر ایک طرف "ماہ لقا" کی جاندادا اڈک میٹ میں جامعہ عثمانیہ کی بلند و باعظمت عمارتیں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ "حسین لقا" کے مکان اور باغ میں "زنانہ کالج نام پلی" قائم ہے۔ یہ رشتہ اس قدر دلچسپ اور قدرتی ہے کہ اسکی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ درازِ عشق۔

چندا اردو کی پہلی شاعرہ ہے جس نے ایک مکمل اور مرتب دیوان اپنی یادگار چھوڑا وہ اکتسابی یا فنی شاعرہ نہ تھی بلکہ اپنی فطرت اور اپنے ذوق کی مناسبت سے تفریحاً شعر کہا کرتی تھی اسلئے اسکی شاعری میں نہ کوئی خاص پیغام نظر آئے گا اور نہ کسی خاص قسم کی فنی خوبیاں ملیں گی۔ لیکن پھر بھی اسکی غزلیں ان تمام خصوصیات کی حامل ہیں جو اچھی شاعری کی جان ہیں۔

وزارت میں اسکی پرورش ہوئی تھی اور اعلیٰ پیمانہ پر اسکی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ فارسی میں اسکو اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی تھوڑی بہت عربی بھی جانتی تھی اور اردو تو اسکی زبان تھی اسکا علمی ادبی ذوق اعلیٰ درجہ کا تھا ہمیشہ اہل علم و فضل سے اس کی صحبت رہتی۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور اس کا اپنا ایک نفیس کتب خانہ تھا جس میں اس نے اپنے مذاق کے مطابق کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔

موسیقی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی اور اس میں کمال حاصل کیا تھا اور پھر قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ حسن و جمال کی دولت اسے عطا کی تھی بادشاہ وقت عمائدین سلطنت اور امرائے ملک اسکی کمال قدر و عزت کرتے تھے بچپن بھی اس کا ناز و نعم میں گزرا تھا اور جوانی میں تو دولت اور عشرت کی دیوی اس پر اتنی مہربان تھی کہ اسکی زندگی کا ہر لمحہ چاندی سونے کی جھنکاروں اور عیش و عشرت کے نغموں سے گونجا ہوا تھا۔

ان تمام حالات کا اثر اسکے ذوق شعری پر بہت اچھا مترتب ہوا حسن و شباب اور نغمہ و موسیقی کا کسی عورت میں

اکٹھا ہو جانا ہی کیا کم قیامت ہوتا ہے کہ اس پر یہ اس کا شاعر ہو جانا...... خیال کیلئے اب اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ وہ پر گو نہیں تھی لیکن اسکی خوشگوئی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

اسکے نغمے جانفزا ہیں جن میں شعریت ہے، موسیقی ہے اور پاکیزگی و لطافت ہے اسکے اشعار زیادہ تر اسکے ذاتی حالات و خیالات کے آئینہ دار ہیں اس کی غزلوں سے اسکے قلبی واردات اور ذہنی تاثرات کی نفاست اور علوئیت ظاہر ہوتی ہے وہ سراسر ایک عورت کا کلام معلوم ہوتا ہے ایسی عورت کا جو حسن و شباب کے نشہ میں چور اور اپنی فاتحانہ فتوں پر مغرور ہے لیکن جس کا دل سچی اور دائمی محبت کا پیاسا ہے اور جس کی روح ایک ابدی اور لازوال سکون کی متلاشی ہے جس کا اظہار وہ بار بار اپنے مقطعوں میں کرتی ہے۔ متبذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے اسکی شاعری کا دامن پاک ہے کہیں کہیں شوخی اور عریانی ہے بھی تو برائے نام۔

اسکی آرزوئیں ہر وقت شہرت اور دولت کا طواف کرتی ہیں فلسفۂ حیات اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا بجز اسکے کہ :۔

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است"

عمر خیام کا پیام اسکی شاعری میں ایک عجیب اور نئے رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے وہ دوسری دنیا سے ناامید نہیں لیکن دنیا کو تج دینے والے خدا پرست کی طرح وہ اس مادی دنیا کو حقیر اور بے حقیقت بھی نہیں سمجھتی۔

مادہ اور روح دونوں کی اسکے نزدیک یکساں اہمیت ہے۔ یہ دنیا مادی ہے اس کا عیش و غم، اسکی محبت اور نفرت اسکے تمام کاروبار عارضی اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ دوسری دنیا جو اس حیات مستعار کے بعد ہمارا خیر مقدم کریگی وہی دراصل ہماری روحانی زندگی کی اصل جولانگاہ ہوگی مختصر یہ کہ مولانا روم اور عمر خیام دونوں کا فلسفۂ حیات اسکی شاعری میں بالکل غیر محسوس طور پر ہم آہنگ ہے اسکے مطالعہ کرنے والے کے دل میں ایک ایسا سکون آفریں احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کو بھی اپنے لئے آسان اور پرکیف سمجھنے لگتا ہے اور موت بھی اسے بھیانک اور ڈراؤنی نظر نہیں آتی۔ وہ حیات بعد الممات کے خوشگوار لمحوں کے خیال سے آسانی اور اطمینان کے ساتھ مرجانے پر اپنے کو تیار پاتا ہے یہ ہم آہنگی چندا کے پورے کلام کی روح رواں ہے۔ میرے پڑھنے والے خیال کرتے ہوں گے کہ ایک معمولی عورت کے کلام میں عمر خیام اور رومی کا فلسفۂ حیات پیش کرنا کس قدر مضحکہ خیز امر ہے لیکن جب وہ چندا کے کلام کا مطالعہ کرینگے تو انھیں یقیناً میرے خیالات سے کچھ زیادہ اختلاف باقی نہ رہیگا

چندا کے کلام کی اس خوبی کو ظاہر کرتے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ دراصل اسکے اپنے چند خاص نظریے تھے اور وہ ان پر ایک فلسفی شاعر کی طرح غور و فکر کرنے کے بعد اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان کو انتہائی محنت اور کاوش کے ساتھ پیش کرتی تھی۔ نہیں میرا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اس کی شاعری میں یہ رنگ بہت گہرا ہے اور اس کا سبب محض یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ماحول اور اس کی اپنی زندگی اور معاشرت نے اسکی شاعری میں خیام کی رجائیت اور سرشاری پیدا کر دی تھی۔ لیکن امیر علیہ السلام کے ساتھ اس کو جو گہری عقیدت اور پھر اسکی بے سہارا اور غیر مطمئن زندگی نے اسکی روح میں بے چینی اور انتشار کی جو کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا اثر اس پر اتنا زیادہ تھا کہ اسکی شاعری پر دوسری زندگی اور دوسری دنیا کے متعلق ایک خاص فلسفہ چھا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وہ حضرت علیؑ سے کوئی التجا کرتی ہے یا کسی قسم کی امداد چاہتی ہے تو دین و دنیا اور زندگیٔ آخرت کا ذکر ساتھ ہی ساتھ کرتی ہے۔

۱۲۲۶ھ میں خود اس نے اپنا دیوان ترتیب دیا جس میں ایک سو چھبیس غزلیں ہیں اور ہر غزل پانچ شعر کی ہے۔ یہ صرف پنجتن کے نام کے پانچ پانچ شعر کہے ہیں بلکہ تقریباً تمام غزلوں کے مقطعے منقبت میں ہیں۔ چندا کی شاعری کی یہ خصوصیت بالکل انفرادی ہے اردو شاعری میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے بھی اس التزام اور اہتمام کے ساتھ غزل کہی ہو یقین کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنی غزل میں پانچ اشعار کا التزام رکھا تھا لیکن یہ ادعا واقعہ کے بالکل خلاف ہے اس میں شک نہیں کہ یقین نے زیادہ تر غزلیں ایسی ہی کہی ہیں جن میں صرف پانچ شعر ہیں لیکن انکی بہت ساری غزلیں ایسی ہیں جن میں اشعار کی تعداد پانچ سے زیادہ ہے۔

چندا کی شاعری کی اس صوری خصوصیت نے اسکے تمام کلام میں ایک ایسی ہم آہنگی اور نفاست پیدا کر دی ہے کہ پڑھنے والے پر اس کا ایک خاص شاعرانہ اثر پڑتا ہے اور پھر چار اشعار پڑھنے کے بعد جب ہر بار ہم مقطع میں ایک ہی خاص خیال سے دوچار ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک رنگین اور پر فضا وادی میں سیر کرتے ہوئے بار بار باعظمت اور مقدس چشمے پر آ کر رک جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اس قدر جاذب نظر اور جاذب خیال بن جاتا ہے کہ ایک طویل مطالعے کے بعد بھی کوئی دماغی تھکن محسوس نہیں ہوتی۔

چنداؔ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ ایک اور نسخہ مولوی عبدالحق صاحب کی لائبریری میں ہے منشی کریم الدین نے "طبقات الشعراء ہند" میں لکھا ہے کہ چنداؔ کے کلام کی " ایک جلد سرکار کمپنی کے کتب خانہ میں درمیان انگلینڈ کے موجود ہے۔ یہ کتاب اپنے ناچ میں کپتان ملکم صاحب کو اس نے بطور نذر پہلی اکتوبر ۱۷۹۹ء کو دی تھی (طبقات الشعراء ہند) "دکن میں اُردو" میں چنداؔ کے دیوان کے متعلق لکھا ہے کہ " ۱۲۲۹ھ میں اس کا دیوان مرتب ہوا اس دیوان کا ایک نسخہ برٹش میوزیم انگلینڈ میں بھی موجود ہے۔

چنداؔ کی شاعری کا عروجی دور تقریباً تیرھویں صدی ہجری کا ربع اول ہے ۱۲۲۵ھ میں خدائے سخن میرؔ نے انتقال کیا۔ یعنے چند سال کی تقدیم و تاخیر سے دہلی میں سوداؔ، میرؔ اور دردؔ جیسے اردو کے مایۂ ناز شعراء اسکے ہمعصر تھے اور حیدرآباد میں مہاراجہ چندولعل شاداںؔ، محمد صدیق قیسؔ اور شیر محمد خاں ایماںؔ جیسے مسلم الثبوت شعرا موجود تھے۔

ایماںؔ سے چنداؔ مشورۂ سخن کرتی تھی لیکن اسکی شاعری پر ایماںؔ کا کوئی اثر نہیں ہے۔ برخلاف اسکے خود چنداؔ کی شاعری نے بعض شعراء اور امراء پر خاص خاص اثر ڈالے ہیں لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے بالکل الگ ہے چنداؔ کی شاعرانہ عظمت بظاہر اسکے سوانح حیات کی دوسری مہات سے بہت کم ہے لیکن اب اردو میں چنداؔ کا نام صرف اسکی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے اور رہیگا زبان اُردو کے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ اس کا دامن عورتوں کے افکار ادبی و شعری سے بھی مالامال ہے اور وہ کسی حالت میں بھی دنیا کی دوسری مہذب زبانوں سے کم رتبہ نہیں۔ جو لوگ اُردو زبان کی تہی مایگی کا رونا روتے ہیں ان کو خاص طور پر اردو زبان و ادب کی گذشتہ تاریخ کو تحقیقی نظر سے دیکھنا چاہئے تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ اس میں شعر و ادب کا کتنا ایسا ذخیرہ موجود ہے جو ابھی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور نہ جانے کیا کچھ ہوگا جو امتداد زمانہ اور حوادث روزگار کے ہاتھوں بے نام نشاں ہو چکا ہے ؎

گمان مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں | ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

چنداؔ کا انداز بیان نہایت شیریں اور لطیف ہے۔ اسکے کلام میں بہت زیادہ نمایاں نسائیانہ جھلک موجود ہے اس نے اکثر ضمائر تانیث کا استعمال کیا ہے اور یہ خصوصیت اس کو تمام اردو شعر کہنے والی عورتوں سے ممتاز کرتی ہے

مثال کے لیئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سو جان سے ہوگی وہ تصدق مرے مولا　　چندا کی جو کونین میں امداد کروگے

مثل بلبل جو اسے دیکھے غزل خواں کیوں نہ ہو　　یا علیؑ چندا ترے گلشن سے پائی ہے بہار

اس کی شاعری تمام تر اسکی اپنی زندگی کا عکس ہے۔ وہ اپنے حالات اور خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے مثلاً

ثابت قدم ہے جو کوئی چندا کے عشق میں　　صف میں وہ عشق بازوں کی سالار ہی رہا

حسب ذیل اشعار میں کس قدر نسائیت موجود ہے اور کتنا گہرا داخلی رنگ ہے ؎

مری نازک مزاجی کی خبر رکھنا نہیں ہرگز　　وہ سنگیں دل نہیں ممکن کسی کا ہو کبھی عاشق

خوب سجتی ہے ترے بر میں یہ پوشاک سفید　　دیکھے تو ر نکلے ہے جوں نور سحر میں غوطہ

دل میں رہتا ہے مرے گرچہ وہ طفل بدخو　　اشک کی طرح نہ ٹھہرا کوئی دم آنکھوں میں

جناب مرتضیٰ کی کنیزی پر وہ فخر کرتی ہے اور نہ صرف آخرت میں بلکہ دونوں جہاں میں سرخروئی کی طالب ہے ؎

سرخرو ہرگز نہ ہو چندا کسی سے دہر میں　　یہ جناب مرتضیٰؓ کی ہے کنیزی کا غرور

مجھے دو سرخروئی دو جہاں میں اپنی بخشش سے　　سدا مولا سے چندا مانگتی ہے یہ دعا بجود

شاہ وگدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر　　عاشق ہے نیم جان نئی لے سے تان بھر!

یہ آخری شعر اسکے رجحان طبیعت اور معمولات زندگی کو صاف طور پر پیش کرتا ہے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہے اپنے رقص سے آپ مست و بیخود ہے، 'شاہ وگدا' اور 'عاشق نیم جاں' کی طبیعتوں کے نفسیاتی فرق کو پہچانتی ہے اور بڑے مزے میں اسکو بیان کرتی ہے اسی طرح ایک اور جگہ بوس وکنار کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ پیرایہ بیان کی لطافت اور بیساختگی قابل غور ہے

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے　　جی میں ہے کیجے پیار سے بوس وکنار خوب

چندا کے کلام میں شوخی اور رنگینی بھی بہت ہے لیکن ایسی نہیں کہ اسے ابتذال سے تعبیر کیا جائے بلکہ اسی قدر جتنی کہ ایک عورت کے کلام میں ہونی چاہیے خصوصاً چندا جیسی عورت کے کلام میں جس کے حسن وجمال کے سینکڑوں

مدّاح و پرستار تھے لیکن جس کو خود کوئی ایسا نہیں ملتا تھا کہ اسکی پرستش کے لئے اپنی زندگی وقف کر سکتی۔ اسکی زندگی باوجود ظاہری سازوسامان اور عیش و تنعم کے کچھ غیر مطمئن سی تھی اور اسلئے اسکے انداز بیان میں اکثر ایک جھجھک، ایک رکاوٹ سی پائی جاتی ہے۔

ذرہ کی کیا مجال گلے مہر کے لگے
بس ہے یہ ایک بوسۂ لب بے حجاب خوب

اس سے زیادہ شوخی اس شعر میں ہے لیکن کس قدر اہتمام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔

گرچہ عالی قدر ہے وہ بے مثال اس دہر میں
پر خدا آغوش میں لاوے ہماری ایکبار

بعض اوقات چندا بہت زیادہ شوخ ہو جاتی ہے اور اسکے اشعار مصنوعی اور ظاہرا عیش و عشرت کے لمحوں کو بھی زندگی کی دلفریبیوں سے معمور کر دیتے ہیں۔

شب کو بغل میں تنگ تھا وہ بے حجاب خوب
دیکھوں ہوں صبح آئینہ میں آب و تاب خوب

دونوں طرح ہیں یاد اسے دلبری کے ڈھب
محبوب ہم سے خواہ رہے یار خواہ شوخ

شعبدہ بازی سے اپنی درگذر اے مست ناز
وصل کے وعدہ میں حیلہ خوب نیں تدبیر کا

نہ بار بار ہوس ہو نبات کی مجھ کو!
رکھے جو ایک ہی بوسہ میں لب شکر محفوظ

گو اختراع عیش کا معدن ہے تو مگر!
رغبت مجھے ہمیشہ ہے بوس و کنار سے

رخصت بوسہ دیا پان چبا کر ظالم
اپنی قسمت میں مگر تھا یہ "حجاب یاقوت"

اس آخری شعر میں بہت معمولی بات بیان کی گئی ہے لیکن "پان چبا کر بوسہ دینے" کو "حجاب یاقوت" کہنا، گویا پان کی سرخی کو ایک پردہ حائل قرار دینا کس قدر پیارا اور دلنشیں خیال ہے۔

چندا نے اکثر اشعار میں آپ اپنے حسن و شباب کی تعریف کی ہے گویا وہ خودی کے نشہ میں مست ہو کر جھومتی ہے اور اپنا منہ آپ چومتی ہے۔

اور حسن جہاں ہوتا ہے خودنمائی اور خودستائی پر مجبور ہوتا ہے لیکن وہ کسی حال میں بھی حضرت علیؑ کو نہیں بھولتی۔

ناز چندا کو نہ ہو کیوں نوجوانی پر فلک
جس کو ہر دم ہے بھروسہ مرتضیٰ سے پیر کا

چنداؔسی عندلیب غزل خواں کی احتیاط ہے گلشنِ نجف میں ترے ہاتھ یا علیؑ

مشتری و زہرہ تاپروین ہوسات روبروچنداؔ کے ہر گز نہیں عجب

وہ حسین تھی اور ہمیشہ حسین رہنا چاہتی تھی۔ اس خیال بلکہ اپنی اس آرزو کو بار بار ظاہر کرتی ہے۔

آرزو رکھتے ہیں یہ حیدر کرار سے ہم عمر بھر یوں ہی رہے حسن کا چنداؔ جلوا

جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق گرمی وہ ہووے حسن میں چنداؔ کے یا علیؑ

اپنی سالگرہ کے موقع پر اس نے ایک مسلسل غزل کہی ہے جس میں وہ اپنے آپ سے اس طرح مخاطب ہے ؎

یوں ہی تیری گرہ ہو سال بہ سال ہو تری عمر خضر، ماہ جمال

ہو مبارک تجھے یہ فرخ فال رشتۂ تارِ دم مسیحا ہو

اور اللہ کا رہے افضال پنجتن تجھ پہ ہوں کرم گستر

کہاں حاتم میں ایسے تھے افعال شش جہت میں ہے شہرۂ بخشش

پائے دونوں جہاں کا چنداؔ مال عرض سرکارِ مرتضیٰ میں یہ ہے

چنداؔ جاہ و ثروت کی شیدائی تھی بچپن سے اس نے ناز و نعم میں زندگی بسر کی تھی خود ملک کا بادشاہ جس پر مہربان ہو اور عمائدین سلطنت جس کی قدر و منزلت اور عزت و وقعت کرتے ہوں اس کا دماغ آسمان پر کیوں نہ ہو۔ اسکو اپنے حسن شباب پر غرور تھا اور بجا تھا وہ اپنے کمال فن پر ناز کرتی تھی اور بجا کرتی تھی۔

دولت کی دیوی اسکے قدم چومتی تھی اور اسکے سر پہ عزت کا تاج تھا۔ اسکو آلام زندگی کا کبھی مقابلہ نہیں کرنا پڑا وہ بظاہر تو بس یہی چاہتی تھی کہ۔ ع عیش ہووے روز و شب میرے سیہ خانہ کے بیچ

اور اسکی یہ آرزو برابر پوری ہوتی رہی۔ شاید اسلئے کہ وہ ہمیشہ صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ، شہ دلدل سوار کی جناب میں اس عارضی عیش اور فانی مسرت کے ساتھ ساتھ دوسری زندگی کی آسائشوں اور راحتوں کیلئے بھی ملتجی رہی۔

رتبہ جو دو جہان میں ہوا افتخار کا چنداؔ کو بخش یا علی اپنی جناب سے

یہ ہی مراد و مقصد و مطلب ہے یا علیؑ — چندا پہ لطف و رحم ہو ہر دوسرا کے بیچ

وہ اسی طرح بار بار شاہ نجف کی سرکار میں اپنا معروضہ پیش کرتی ہے ؎

یا علی کیجئے فردوس میں چنداؔ کو عطا — لعل کا قصر کہ ہووے جسے باب یاقوت

اسی طرح دنیاوی جاہ و ثروت کی خواہش بھی اتنی بڑھی ہوئی ہے اور اپنی دولت و وقعت اور اپنے جمال محبوبی پر اتنا ناز و غرور ہے کہ وہ شاعرانہ تعلی سے گزر کر بالکل حقیقی طور پر اس قسم کے شعر کہہ جاتی ہے کہ

چنداؔ کے دیکھنے ہی کی خواہش کرے جو کوئی — رکھتا ہو وصف اپنے میں عزت و جاہ کا

اس کو اپنے شاعرانہ کمال کا بھی احساس ہے۔ کہتی ہے ؎

میداں میں تجھ سے گوئے سخن کوئی لے نہ جائے — چنداؔ امید رکھ یہ شہ ولدل سوار سے

چنداؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ندرت اور شگفتگی ہے۔ اسکے دیوان میں کتنے ہی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں جدّتِ خیال اور نازکیٔ فکر کے ساتھ سادگیٔ بیان اور صفائی بے ساختگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا کے ہاتھ سے اپنے کمال عاجز ہیں — جفا تو اس کی مخفی معلوم پیشتر ہم کو

گل کے ہونے کی توقع پہ جیے بیٹھی ہے — ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے

عشق میں حق کے انا الحق کہہ رہا ہی بار بار — ہر قطرہ پر لحنتِ دل اپنا نہیں منصور ہے

گر نہیں ہے محوِ رخ تیرا تو پیارے کس لئے — رات دن رکھتا ہے یکساں چشم بیدار آئینہ

کیا ہے ضبط اس پردہ نشیں کے عشق میں میں نے — صدائے آہ نا ممکن ہے دل سے تا بگوش آئے

اسی خیال کو مومنؔ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ در نہ ہو جائے

لیکن مومنؔ کو راز الفت فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے اور چنداؔ کو اپنے ضبط عشق پر اطمینان اور اعتماد ہے۔

اسی طرح سوزؔ کا ایک بہترین شعر ہے ؎

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے	دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

لیکن چندا نے اسی خیال کو بالکل نئے طریقہ سے اور اس سے زیادہ صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے ۔

جلوہ گر ان دنوں کچھ اشک ہیں کم آنکھوں میں	اسلئے خون رہا آن کے جم آنکھوں میں

اس نے آنکھوں میں خون کے جم جانے کی شاعرانہ توجیہ بھی کر دی ہے اور سوز کے اس بے ضرورت ٹکڑے کو حذف کر کے کہ "دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے" سامع کے ذہن کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا ہے۔ مختصر یہ کہ چندا کا شعر بہت زیادہ شعر واقع ہوا ہے اور سوز نے نتائج و مواقب کی تفصیلات میں پڑ کر اپنے شعر کو پوری ایک حکایت ایک داستان بنا دیا ہے۔

"ہمہ اوست اور ہمہ از اوست" کے عقیدے شاعری کے رنگین دامنوں میں آکر بہت زیادہ خوشنما اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ فارسی اور اردو شعرا نے صوفیائے کرام کے ان عقائد کو مختلف پہلوؤں سے بار بار باندھا ہے لیکن چندا نے اپنے مخصوص رنگ بیان یعنے سادگی و جدت کو یہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

ہماری چشم نے ایسا کمال پایا ہے	جدھر کو دیکھئے آتا ہے تو نظر ہم کو

غور کیجیے تو ہیں پر نور جمادات و نبات	نہ ترے جلوے کا ہے ذات بشر میں غوطہ

ادا نشرط عبادت ہو سکے ہے کب بھلا اسکی	خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد کو پہونچے

"عہد الست" سے متعلق جتنے مضامین اور جس قدر پہلو بیان کے ہو سکتے تھے ہمارے شعرا نے ان سب کو اپنے اپنے طور پر استعمال کیا ہے لیکن چندا کا ایک شعر ایسے ہزاروں شعروں پر بھاری ہے۔ انداز بیان کی لطافت بیان سے باہر ہے ۔

روز ازل جو جام محبت پلا دیا	سرخی رہی ہے آنکھوں میں اب تک خمار کی

چندا نے عشق و محبت کے متعلق کئی جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کے متعلق اس کا تصور کس قدر بلند ہے اور محبت کو وہ کتنی اعلیٰ اور پاکیزہ چیز خیال کرتی ہے ۔

بہ نظر اختصار یہاں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار دنیا کی مہذب ترین زبانوں کی اعلیٰ ترین شاعری کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ناظرین اندازہ لگائیں کہ یہ کس درجہ اور رتبہ کی شاعری ہے اور چندا کو اس کا یہ کلام کس بلند

مقام پر پہنچا رہا ہے ؎

کیمیا کے لئے ناحق نہ ہو مس ہوخراب　　جو چمک عشق میں ہے کب ہے وہ سیماب کے بیچ

ایک ہی شعلہ میں بس یہ جائے، پانی ہو کے جل　　عشق کی آتش کے گر ہمسر ہو شیخ و شاب برق

کب بوالہوس کو عشق میں منزل ہے جسم کی　　ہے جادۂ نگاہ سے آہو کی راہ شوخ

متحد عاشق و معشوق ہیں باطن میں ہم　　ظاہراً گو کہ نہ تھا شیریں کو فرہاد سے ربط

یہ رشتہ وہ ہے عشق کا اے صاحبِ کنشت　　جب تک کہ زندگی ہے وہ زنار ہی رہا

ہر چند راہِ عشق میں دل پائیمال ہے　　روزِ جزا میں رتبہ ہے اس انکسار کا

عشق کی سرشاری اور وارفتگی کا بیان ملاحظہ ہو ؎

عشق میں ننگ سے مطلب ہے نہ ہے کام سے کام　　کچھ کہے کوئی سدا اپنے ہمیں کام سے کام

جامی کا مشہور شعر ہے ؎　بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی　　کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن دونوں شعروں کا فرق صاف ظاہر ہے۔ جامی کا شعر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا نظریہ ہے جو بہت سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن چندا کے شعر میں جو سادگی اور بے ساختگی ہے وہ اس کو جامی کے شعر سے بہت بلند کر رہی ہے۔

مومن کا ایک شعر ہے ؎　اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو　　ہم کو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

لیکن مومن سے بہت پہلے اس خیال کو چندا نے بیان کیا ہے اور انداز بیان کی سادگی اور لطافت نے چندا کے شعر کو مومن کے شعر سے بہت بڑھا دیا ہے کہتی ہے ؎

ناصح عبث کرے ہے مجھے منع دید سے　　آجاوے وہ نظر تو پھر انکار دیکھنا

داغ کا ایک مشہور شعر ہے ؎ رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہو　　اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

چندا کا بھی یہی خیال ہے صرف انداز بیان جداگانہ ہے۔ "وہ عشق کی موج" کو "کسی دریا بکنار بتاتی ہے اور صرف اس ٹکڑے میں داغ کے پورے شعر سے زیادہ جوش و اثر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

عشق کی موج رکھے ہے کشتی دریا بکنار — دل ناداں نہ پڑے دیکھیو گرداب کے بیچ

چندا کی شاعری میں محاکات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ نرم اور سادہ الفاظ اور سیدھے سادے انداز بیان کے ساتھ موسیقی اور مصوری اسکے اشعار میں اس طرح ہم آہنگ ہوتی ہے کہ اسکے اکثر اشعار متحرک اور مجسم نغموں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ماہرو صبح کو بنا غرق جو اٹھے ہو کر — سیر دریا کا کرے ہے شب مہتاب کے بیچ
شاخ گل میں کب ادا ہے وہ چمن کی ساقیا — خوشنما جیسا ہے تیرے ہاتھ میں یہ جام سرخ
ہر رنگ سے ہزار جھلک کو دکھائے برق — چشمک کا لطف یار کی ہرگز نہ پائے برق
باہر جو نکلے برقع سے وہ روئے آتشیں — چادر میں ابر کی وہیں منہ کو چھپائے برق
مجھے نام خدا اس شوخ کا یہ طور بھاتا ہے — ادا سے چھپ کے ابرو ہولیوں میں مسکراتا ہے

تشبیہ اور استعارہ کو شاعری کی جان اور شعر کا ایمان کہا گیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔ چندا کا کلام تشبیہ و استعارے کے زیور سے بھی آراستہ ہے۔ اس موقع پر سب سے زیادہ قابل غور امر یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان بن رہی تھی۔ اسکی تعمیری زندگی کا آغاز تھا۔ ایسے زمانے میں کسی شاعر کے کلام میں عمدہ تشبیہوں اور لطیف استعاروں کا پایا جانا زبان پر اس کی پوری قدرت اور اسکے تخیل کی انتہائی نزاکت اور ندرت کو ظاہر کرتا ہے "حسن تعلیل" اور "ادعائے شاعرانہ" سے بھی کلام کی حسن و خوبی میں اضافہ ہوتا ہے اور ان حسن افزا صنعتوں سے بھی چندا کا کلام خالی نہیں ہے۔ ہم یہاں نمونے کے طور پر اس کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں ارباب نظر خود حظ اندوز ہوں ؎

آکے ہے در پہ تیرے جبہہ سائی ہر سحر — اس لیے چشم خلائق میں ہے منظور آفتاب
حسن کے شعلہ سے تیرے جبکہ ٹپکے ہے عرق — شرم سے لیں ابر کے دامن میں ہے نت آفتاب
نہیں ہے زلف کی لٹ اس رخ معرق پر — یہ اوس چاٹنے نکلا ہے ماہتاب میں سانپ
قتل پر آج کس کے ہوئے ہے — توسن حسن پر سوار شراب
کنول مت سمجھ محفل میں ان لگنوں کو پیارے رات کو — دیکھ کر ماریہ کو تیری سے گھبرائی ہے شمع

کچھ کچھ نظر جو آتی ہے سیماب میں تڑپ — سیکھی ہے طرز دل سے مرے اضطرار کی
خلش تیر مژگاں کی دل میں ہے یوں — کھٹکتا کہیں جیسے نشتر رہے
یوں اس کے مرے نشہ میں ہے صلح کا عالم — جس طرح کہ مستوں میں رہے جنگ خرابات
کیا تجھ سے سوز دل کہوں اپنا بہ رنگ شمع — کہتا ہے دیکھ دیکھ کے دل رات کی طرف

چنداؔ کی شاعری بے معنی تکلفات سے خالی ہے محاورہ اور روزمرہ کا استعمال اس نے اپنے کلام میں بہت کم کیا ہے اور اگر اسکے بعض اشعار میں کوئی خاص محاورہ نظر بھی آجاتا ہے تو وہ اس قدر بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوتا ہے کہ کہیں سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خاص محاورہ کی خاطر شعر کہا گیا ہے۔ اس قسم کے چند اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

نہ پورا وصل کی شب میں ہوا عاشق کا اک ارماں — جدائی نے تری ظالم قیامت مجھ پہ دن ڈالے
اشارہ پھر اسی ابرو سے چاہے ہے یہ دل میرا — کہ جس چشم سیہ نے سینکڑوں کے بل میں کھل کھالے
کہاں سمجھائے سے سمجھے ہے ناداں قدر تو دل کی — نہ تو جب تک پڑے ظالم کسی بیدرد کے پالے
ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے — دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے
لگ چلنا ایسے ویسوں سے دستور مت کرو — تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو

چنداؔ کے کلام میں ایک بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے یعنی خیالات میں پستی اور بلندی کا ایک ایسا توازن نظر آتا ہے کہ اسکی اصلی فطرت اور اسکے حقیقی رنگ کلام کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے لیکن جب ہم بہ نظر غور اسکے پورے دیوان کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسکے اصلی خیالات اس کا حقیقی رنگ فی الواقع بہت ہی بلند اور ارفع ہے لیکن ماحول کے اثرات اور اسکی اپنی زندگی کے معمولات نے بعض اوقات اسکو ہلکے اور پست خیالات کے اظہار پر آمادہ کر دیا اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے اشعار اسکے دیوان میں خال خال نظر آتے ہیں تو ہم کو اپنے اس نتیجہ پر اور زیادہ یقین ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں لیکن ناظرین غور کریں کہ جن کو میں پست اور معمولی شعر سمجھتا ہوں ویسے ہی اشعار سے ہماری زبان کے بڑے بڑے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ چنداؔ تو پھر عورت تھی اور ایسی عورت جس کا

زندگی کی راتوں کو گناہوں کی تاریکیوں سے لبریز خیال کیا جاتا ہے کیسی روشن راتیں اور کس قدر نورانی گناہ۔ خیالات کے نشیب و فراز کا تماشہ دیکھئے۔

آیا نہ ایک دن بھی تو وعدہ پہ رات کو — اچھا کیا سلوک تغافل شعار خوب!
سوتا ہے ساتھ اپنے وہ گلعذار ہر شب — صد شکر دیکھتے ہیں کیا کیا بہار ہر شب
بڑی جرأت ہے ان کی جو ہیں تیری ہم نشینی میں — یہ تیری اک نگہ نے دل پہ میرے کی ہے کیا غفلت
کہا گلے سے لگا لے تو التفات نہیں — کہے ہے تس پہ مجھے کیوں تو دمبدم گستاخ
چھپا یا راز محبت کو دل میں پر ہیہات — کرے ہے نام مرا بد یہ چشم نم گستاخ

چنداؔ کی شاعری فطرت سے بہت قریب ہے وہ کبھی دور از کار باتوں اور بعید از فہم چیزوں کا ذکر نہیں کرتی۔ مناظر قدرت کا بیان وہ اس خوبی اور لطافت کے ساتھ کرتی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اس کا ایک شعر ہے۔

ہے صراحی غنچہ۔ ساغر گل ہے صحن باغ میں — یار ساقی ہو برستا ہووے ابر نوبہار

محاکات یا مصوری کے ایسے لطیف نمونے اسکے کلام میں اکثر ملتے ہیں بہار اور بسنت سے متعلق اسنے متعدد مسلسل غزلیں لکھی ہیں۔ اس قسم کی چند غزلیں ناظرین کے مطالعہ کے لئے یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بس ہجوم گل سے اپنے کیا خوش آئی ہے بسنت — باغ میں گلرو کے آکے رنگ لائی ہے بسنت
جوشش گلرو سے مجھ کو کب خوش آتی ہے بہار — گرچہ رعنائی کا اپنے ساز لائی ہے بسنت
میکش و زرپوش ہو جب تو کیا نازک خرام — پھول سے تیرے لئے منڈوے کے چھائی ہے بسنت
جلوہ گر ہو یار جب بر میں کیئے رنگیں قبا — جس طرف کیجے نظر دھوم مچائی ہے بسنت
سر کو اپنے کر تصدق آکے یہ مثل گدا — تیرے در پہ یا علیؓ چنداؔ نے گائی ہے بسنت

ہے خبر بھی باغباں گلشن میں آتی ہے بہار — دیکھئے کس پر بلائے تازہ لاتی ہے بہار
یہ کہاں طاقت ترے رخ کے برابر ہو سکے — گرچہ کہنے کو صدا جوبن دکھاتی ہے بہار
کون ہے گم گشتہ اب دیوانہ مجھ سا فصل میں — کھوج کو جس کے چراغ گل لے آتی ہے بہار

منتظر ہے چشم عالم مثل نرگس ہر طرف　　دیکھیں کس کا اب چمن میں دل چلاتی ہے بہار
مثل بلبل جو اسے دیکھے غزلخواں کیوں نہو　　یا علیؑ چنداؔ ترے گلشن سے باقی ہے بہار

چنداؔ نے ارسطو جاہ اور شاہ دکن کا ذکر اپنے بعض اشعار اور غزلوں میں کیا ہے۔ اسکے دیوان میں دو مکمل غزلیں ارسطو جاہ کی مدح میں ہیں۔ یہ غزلیں مسلسل ہیں اور ان سے اسکے واقعات زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً اسکی ایک غزل ہے ؎

جب ہوا صحن چمن میں خسرو گل کا گذار　　عندلیبوں نے کیئے ہر سمت سے مجرا ایکبار
سن کے یہ آواز خوش دل نے کہا مجھ کے اٹھ　　چل سبز پوش ہو کر تو بھی اب دیکھیں بہار
الغرض پہنچی جو اس جشن فریدوں فر تلک　　مسند آرا اس جگہ دیکھا امیر نامدار
وہ نتیجہ ہے کیے خسرو کا جس کے روبرو　　رعب سے نام سخاوت لے نہ حاتم زینہار
مدعا چنداؔ کا ہے یہ اب ارسطو جاہ سے　　فیل و زر بخشش تو کی جاگیر کا بھی ہو شمار

شاہ دکن کی مدح میں اس نے کئی جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند شعر اور غزلیں پیش کی جاتی ہیں اسکے علاوہ اسکے پورے دیوان میں نہ کسی کی تعریف و توصیف ہے نہ کسی امیر کا کچھ ذکر۔ حالانکہ میر عالم اور چند و لعل جیسے امرائے وقت اور صاحب جاہ و حشمت لوگ اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ لیکن چنداؔ ان تعریفوں سے بے نیاز تھی وہ جب مالک سیف و قلم کو تسخیر کر چکی تھی اور جس کی محفل جشن جمشید سے بڑھ کر ہوتی تھی تو پھر وہ ان کا خیال کرتی اور کیوں کرتی شاہ دکن کی تعریف میں اسکی ایک غزل ہے ؎

مہیا دور میں جو عیش ہے تیرے سر شاہاں　　نہ جم سے بھی ہوا تھا اس قدر نوروز کا ساماں
بھلا اب کوئی ہو کیا شان و شوکت میں ترا ہمسر　　کھڑے ہوں دست بستہ سامنے جو قیصر و خاقاں
نہیں کچھ حاجت اظہار شاہا حال دل میرا　　برنگ ذرہ کب مہر کرم سے تیرے ہے پنہاں
یہی مشہور عالم ہے گدا ہے شاہ تک باہم　　ترے خوان کرم پر کون ہے وہ جو نہیں مہماں
سدا لیتے ہیں چنداؔ سے ہزاروں جسکے ثنا میں　　نظام الدولہ شاہ دکن ہے رستم دوراں

ایک اور غزل کسی اور بسنت کے موقع پر اس نے شاہ دکن کی تعریف میں کہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بسنت آئی ہے موجِ رنگ گل ہے جوش صہبا ہے — خدا کے فضل سے عیش و طرب کی اب کمی کیا ہے

بیاں میں کیا کروں اسکے شبستاں کا تعالی اللہ — قضا و قدر جس کے جشن کا اب کار فرما ہے

سخاوت میں کوئی ہمسر نہ ہو اس کا زمانہ میں — وہی کرتا ہے پورا جس کے دل میں جو ارادہ ہے

خضر کی عمر ہو اس کی تصدّق سے آئمہ کے — نظام الدولہ آصف جاہ جو سب کا مسیحا ہے

یہی خوان کرم سے ہے سدا امید چندا کو — کسی کی بھی نہ ہو محتاج تم سے یہ تمنا ہے

وہ اپنی شاعری کو بہت زیادہ اپنی زندگی کی نقل بنا کر پیش کرتی ہے۔ کہتی ہے ۔

حاکم کے کہنے کا نہیں تجھ کو اثر کہیں — محکوم ایسا دیکھا کوئی بے خبر کہیں

نغمہ سوز سے دل کیوں تجھ نہ پرواز کرے — رقص کرتا ہے تو جس وقت بجا نا خنوں کو

حیدرآباد کے توطن پر اسکو فخر ہے ایک جگہ اس کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

دیکھ چندا کو یہ کہتے ہیں موالی علی — حیدرآباد میں اک اہل وفا رہتا ہے

اس کو اپنی تعریف آپ کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے دیکھئے کہتی ہے ۔

کسرےٰ سے لے کے آج تلک چشم دہر نے — دیکھا نہ تجھ سا اور کوئی اہل جاہ شوخ

سو بار سا جشن بھی جمشید کا ہم نے — لیکن نہیں پایا تری محفل کے برابر

چندا کی شاعری میں اخلاقی عنصر بھی موجود ہے۔ وہ ایک ناصح یا واعظ کی طرح خشک پند و نصیحت نہیں کرتی بلکہ اخلاق کے مسلمہ اصولوں کو ایک ایسے شاعرانہ رنگ میں بیان کرتی ہے کہ سننے والے کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ دل آزاری انسانیت کا سب سے بڑا گناہ ہے مذہب بھی دلداری کی تعلیم دیتا ہے اور شاعری کا پیام بھی یہی ہے۔ مشہور مصرع ہے کہ۔ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" اسی خیال کو چندا نے بھی اپنی مخصوص لطافت بیان کے ساتھ بار بار ظاہر کیا ہے۔ کہتی ہے

ہر چند دل دکھانا کسی کا برا ہے پر — رنجیدہ خاطروں کو تو نور حرمت کرو

ہوا اس میں زرق برق زمانہ کا الغرض   ہے ذی شعور وہ جو کسی دل میں جا کرے

مومن کے دیوان کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے ۔ غضب ہے تیرے ڈر نا ہو رضا کی تیرے خواہش ہے   نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

لیکن چندا کا خیال اس سے زیادہ بلند ہے ۔ دوزخ و جنت تو بڑی چیز ہے اسے یہ بھی منظور نہیں کہ اسکی رضا و رغبت کا بھی خیال کرے وہ صرف اسکی بندگی اور اطاعت سے کام رکھنا چاہتی ہے عبودیت کے اس انتہائی جذبہ کا نام ہی عشق کامل ہو ملاحظہ ہو

سوائے بندگی رب نہیں کچھ مطلب دل ہے   غرض اکرام سے مجھ کو نہ ہے انعام کی خواہش

ناقص اور کامل کے فرق کو ایک جگہ وہ پرویز اور فرہاد کی عام مثال کے ذریعہ اس طرح بیان کرتی ہے ۔

پرویز کو نسبت نہیں فرہاد سے شیریں   ناقص نہیں ہوتا کبھی کامل کے برابر

اس قسم کے چند اور شعر جن میں کوئی نہ کوئی خاص اخلاقی نکتہ بیان کیا گیا ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔

ہاتھ میں کب آئے ہے افسوں سے اقلیم دل   جز تواضع کے نہ دیکھا چٹکلا تسخیر کا !

بجز اپنے خدا کے غیر سے ہرگز توقع نہیں   مگر دنیا کے لوگوں میں مجھے ہے پیار سے مطلب

سود و نقصان کی نہیں مجھ کو غرض دنیا سے   میں رکھوں تیری ہی خوشی تو ہو خفا صد رحمت

کچھ دن کرے صیاد کو اللہ جو مرا صید   کر دوں میں سبھی دام سے یکدم میں رہا صید

جس نے کی تحقیق ہر دم چشم دل سے یار کی   مرد حق ہیں اس جہاں میں ہے وہی صاحب شعور

زبان کی شیرینی اور گھلاوٹ چندا کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو اسکے سارے کلام میں جاری و ساری نظر آتی ہے اور پھر اسکا انداز بیان اتنا صاف اور سادہ ہوتا ہے کہ اسکے اکثر اشعار ایک بار پڑھنے کے بعد ذہن میں اس طرح جم جاتے ہیں گویا بہت پہلے سے یاد ہیں مضمون کی طوالت کے خوف سے یہاں اسکے چند شعر پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

ہو سکے ہے کب ترے چہرے کے ہمسر آفتاب   گو رکھے ہے نور کی خلعت کو در بر آفتاب

ان کو آنکھیں دکھا دے ٹک ساقی   چاہتے ہیں جو بار بار شراب

ساقی لگا کے برف میں مئے کی صراحی لا   آنکھوں میں چھا رہا ہے نشہ کا خمار خوب

پھر لو لگی ہے مجھ کو کس شمع رو کی ہے ہے
دل اندنوں رہے ہے کچھ بیقرار شب بھر

کعبۂ دل ہی سمجھ کر اپنا گھر !
اے بت نامہرباں رہ ایک رات

کیوں طبیب اب نہیں کرتا ہے علاج دل ریش
کیا خوشی آئی ہے تیرے جی کو یہ بیمار کی طرح

گرچہ قدموں سے ترے ظاہر میں ہوں ہر چند دور
جان و دل سے ہوں تصور میں مگر تیرے حضور

ملایا کر تو اسکی انکھڑیوں سے آنکھ کم نرگس
نہ کریوں دیدہ و دانستہ اپنے پر ستم نرگس

گویا کہ تازہ کفر کی وہ ابتدا کرے
دل کو جو ان بتوں سے کوئی آشنا کرے

تو نے کی شرط وفا مجھ سے ادا صد رحمت
دل مرا لے ہی لیا پھر نہ دیا صد رحمت

اے حضرت دل کیجیے نہ آہنگ خرابات
بگڑا ہے بہت ان دنوں کچھ رنگ خرابات

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو
لگ چلنا ایسے ویسوں سے دستور مت کرو

لٹوے بہا کے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
یہ راز عشق ہے اسے مشہور مت کرو

گر مرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم
کھول دے بند ہتیلی کو دکھا ہاتھوں کو

رہی ہے ہم کو کیفیت سے ان آنکھوں کی خوشیاری
چمن میں منت ساقی سے گزرے جام سے گزرے

چنداکی شاعری کی آخری اور پہلی خصوصیت اسکے کلام کی موسیقیت ہے۔ اس نے اپنے پورے دیوان میں گنتی کی چند بحریں استعمال کی ہیں۔ اور یہ سب بحریں ایسی ہیں جن کا موسیقی سے بہت قریبی تعلق ہے۔ وہ خود فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی اور اسکے دل و دماغ ہر وقت مترنم نغموں کی گونج سے معمور رہتے تھے اور جب کہ وہ خود ایک عورت، ایک شعر، ایک نغمہ تھی تو کس طرح ممکن تھا کہ اسکے بول اس صفت سے خالی ہوتے اسکی تمام شاعری شعریت اور موسیقیت میں ڈوبی ہوئی ہے معاملہ بندی اور چھیڑ چھاڑ کے مضامین بھی اسکے پاس آ کر ایک خاص موسیقانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں عاشقانہ رنگ اسکی شاعری پر چھایا ہوا ہے اور جب کہ عشق و محبت کے بیان کے ساتھ موسیقی اور ترنم خود بخود پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ چندا کی شاعری کیا کچھ سامان رقص و نغمہ اپنے اندر نہ رکھتی ہوگی اسکے دیوان سے کچھ اشعار منتخب یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ لفظوں کے انتخاب اور بیان کی

حسن وخوبی سے اس نے کس طرح اپنے ہر شعر کو ایک متحرک نغمے میں تبدیل کر دیا ہے۔

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا اے یار بےخبر تجھے اب تک خبر نہیں کب کا گذار ہو گیا کوچہ میں ماہ کا

عالم تری نگہ سے ہے سرشار دیکھنا میری طرف بھی ٹک تو بھلا یار دیکھنا ساقی ہے گرچہ بیشمار شراب خوشنما نیں سوائے یار شراب

شاید کہ میرے گھر میں وہ رشک ماہ آوے رہتا ہوں اسلئے میں امیدوار ہر شب

خود صید ہو گئے ہیں اب دام میں کسی کے کرتے تھے آپ باہم تاز و شکار ہر شب

شیشۂ دل کو دیا ہوں تیرے ہات چور یا ثابت ہو رکھو اپنے سات

غش کھائے ہے جی سنتے ہی گھبرائے ہی دل بھی بجتی ہے عجب لے سے نئے وچنگ خرابات

دلمیں میرے پھر خیال آتا ہے آج کوئی دلبر بے مثال آتا ہے آج !

سنگ رہ ہوں ایک ٹھوکر کے لئے تسپہ وہ دامن سنبھال آتا ہے آج

گرچہ گل کی سیج ہو تسپر بھی اڑ جاتا ہے خواب سر رکھے قدموں پہ تیرے جب مجھے آتا ہے خواب

مشک سے مطلب نہیں اسکو نہ عنبر سے غرض ہے جسے صبح ومسا گیسوئے دلبر سے غرض

ساغر کسی کی چشم کے پی کر شراب دل پھرتا ہے بیخودانہ سامست وخراب دل

روکتا ہوں جو اسے مجھ سے خفا رہتا ہے دل یہ میرا ترے کوچہ ہی میں جا رہتا ہے

گرچہ سب عیش مہیا ہے پر اس محفل میں خانہ آباد نہ تو ہوئے تو کیا رہتا ہے

دیکھا نہ آئینہ نے کبھی جس کو عمر بھر شکر خدا وہ ان دلوں ہم سے دوچار ہے

ہر روز جو یوں ہی ستم ایجاد کروگے دل عاشقوں کے سینکڑوں برباد کروگے

اوروں سے اگر دوستی رکھنے ہو نظاہر باطن میں یقیں ہے کہ ہمیں یاد کروگے ناشاد کئی دل ہیں نہ ملنے سے تمھارے ایسا کبھی ہوگا جو انھیں شاد کروگے

کچھ سمجھ کر ہی کیا اسنے تلون اے دل رحم پر صرف نہ جا اسکے ستمگار بھی ہے

غمزہ وناز وادا شیوہ ہے خوبوں کا مگر ہر سخن میں روٹھ جانا کو نسا دستور ہے

محمد صدیق قیس

از

سید اشفاق حسین صاحب

محمد صدیق قیس

قیس عہد آصف جاہ ثانی کے ممتاز شعراء میں سے تھے جب کہ دربار کی سرپرستی اور امرا و وزرا کی علم دوستی کی وجہ سے شعروشاعری کیلئے ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ اعظم الامرا ارسطوجاہ و امیر کبیر شمس الامرا اور راجہ چندولال کے دربار سے شعرا نوازے جارہے تھے۔ جو کام جہانگیر و شاہجہاں کے زمانہ میں وہاں کے امرائے عظام نے شعرا اور اہل کمال کی سرپرستی کیلئے کیا' وہی کام آصف جاہ ثانی کے عہد میں ان بزرگوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ دلی کی تباہی نے بہت سے شعرا اور اہل کمال کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ان میں سے زیادہ تو دربار اودھ کی طرف بڑھے اور کچھ حیدرآباد چلے آئے۔ دکن کے امرا نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان آنے والوں میں شاہ نصیر دہلوی اور مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند بہت مشہور رہیں۔ شاہ نصیر کو راجہ چندولال شاداں کے یہاں سے پانچ روپیہ یومیہ مقرر ہوا جو اس زمانہ میں ایک شاعر کیلئے بہت زیادہ تھا' جبھی تو شاہ نصیر نے اپنے شاگرد ذوق سے کہا تھا کہ "میاں ذوق! حیدرآباد جنت ہے جنت' تم بھی وہیں چلو" مگر ذوق سے دلی کی گلیاں نہ چھوٹیں۔ یہاں اس وقت شیر محمد خاں ایمان استاد الشعرا مانے جاتے تھے جو ارسطوجاہ کے مصاحب تھے۔ ان کے شاگردوں میں محمد صدیق قیس اور ماہ لقا بائی چندا نے کافی شہرت حاصل کرلی تھی۔

قیس حیدرآباد میں پیدا ہوئے' ان کے اکثر افراد خاندان ریاست میں وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمات پر مامور رہ چکے تھے۔ ان کے نانا محمد عاقل خاں نائک مخبرین کے افسر اور ماموں شیر محمد خاں ایمان ارسطوجاہ کے مصاحب تھے۔

قیس نے فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد موروثی وقائع نگاری و تاریخ دانی میں کمال حاصل کیا اور طبعی ذوق کی وجہ سے شعر کہنے لگے' فصاحت و صلہ افزا تھی' بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ راجہ چندولعل شاداں اور امیر کبیر شمس الامرا نے ان کی سرپرستی کی اور ہر دو نے دو دو روپیہ یومیہ مقرر کیا۔ فکر معاش سے آزاد ہوکر اپنا سارا وقت شعروشاعری کیلئے وقف کردیا۔ ریختہ کے ساتھ ریختی بھی کہی اور بہت تھوڑی مدت میں حیدرآباد کے اچھے شعرا میں شمار کیے جانے لگے۔ سنہ ۱۲۳۲ھ میں وفات پائی۔

اس عہد میں سب سے بڑھ کر مہاراجہ چندولال کے دربار میں شعر و شاعری کا ہنگامہ برپا تھا مہاراجہ خود شاعر تھے اور شعراء کی قدر و منزلت جانتے تھے۔ شاہ نصیر دو تین مرتبہ یہاں آچکے تھے، قیس کی حیات تک شاہ نصیر کا مستقل قیام حیدرآباد میں نہ ہو سکا۔ محفوظ بھی مہاراجہ کے درباری شاعر تھے مگر ان کے دربار میں قیس ہی کی شاعری کا اثر غالب تھا۔ خود قیس مہاراجہ کے دربار کے توسل کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

شاداں ہے قیس دولت شاداں سے رات دن　　سررشتہ جب سے اسکی ہے سرکار میں بندھا
الٰہی سکۂ اقبال یوں غالب ہو شاداں کا　　کہ جن و انس پر تھا نقش جیوں مہر سلیماں کا

امیر کبیر شمس الامراء بھی بڑے سخن فہم اور شعراء و اہل کمال کے سرپرست تھے۔ قیس نے اس دربار سے اپنے تعلق کا ایک شعر میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

قیس تمہارا نام تو یوں مشہور ہوا ہے خلقت میں　　فدوی شمس الامراء کے ہم سنتے ہیں کہلاتے ہو

اس زمانہ کے ماحول کے لحاظ سے شعراء کی ذہنیت کا یہ حال تھا کہ مطالب و معانی سے زیادہ اسلوب بیان و زبان کا خیال رکھتے تھے۔ شاہ نصیر کی روش کی طرف عام رجحان تھا باوجود اسکے قیس کی شاعری شاہ نصیر اور درباری اثر سے متاثر نہ ہو سکی ان کا رنگ میر اور درد کی شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ قیس کتابی شاعر نہ تھے وہ شاعر پیدا ہوئے تھے ان کے کلام سے انکی شخصیت اور ان کی شاعری کے ارتقاء پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی کہ عمر کا پتہ چل سکتا ان کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ عمر پائی تھی۔

یاد پیری میں جوانی کو نہ کر　　قیس وہ بھی تھا خیال خام سا

چونکہ قیس کی شاعری دربار کے الطاف و نوازش کی مرہون منت تھی اسلئے وہ ظاہری طور پر دربار کی فضا کا خیال رکھنے پر بھی مجبور تھے مگر ان کی روح اور ان کا دل شاعری کی حقیقی عظمت کا جویا تھا، انہوں نے صرف قصیدے کہہ کر لوازمۂ درباداری کی تکمیل کردی اور چونکہ دربار پیشکاری سے متوسل تھے، اس رعایت سے دیوان کا نام بھی پیشکاری رکھا۔ خود کہتے ہیں

جو دیکھتا ہے صاحبِ دیوان کہے ہے　　چھوٹا سا قیس خوب ترا پیشکار ہے

قیس کی غزلوں میں میر کا سوز و گداز، درد کا تصوف اور میر سوز کی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے! ان کا رنگ تغزل جدید بنا کے اس دور کی شاعری سے مختلف اور رفعت تخیل کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ان کے کلام میں اکثر ایسے نشتر ہیں جو ان کے ہم عصر شعرا کے کے یہاں نہیں مل سکتے۔ مثلاً

جاتا ہے سمند عمر کیدھر ۔۔۔ جس پر یارب سوار ہیں ہم
کسو کے کوئی ٹوٹے دل کو بتادے ۔۔۔ صفت یہ نہ دیکھی کسو شیشہ گر میں
دیکھا جو رات شمع نے داغ جگر کو قیس ۔۔۔ بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
تو جو پہلو میں نہیں دل بھی نہیں ۔۔۔ کس طرح دل کو کہاں بہلاؤں
کون آکر سما گیا دل میں ۔۔۔ جان تن میں نہیں سماتی ہے
حباب آسا ابھر مت بحر اس بحر ہستی میں ۔۔۔ بھروسہ کچھ نہیں یاں ایکدم کی زندگانی کا
روتے روتے ہوئی ہے صبح مجھے ۔۔۔ پوچھ لو حال میرا شبنم سے
کیا لخت دل کو دیکھتے ہو مردمان چشم ۔۔۔ بے دست و پا غریب مسافر ہے دور کا

غزل کے بعد قیس کے قصائد ہیں، جو کسی درباری شاعر کے کلام کا ضروری عنصر ہیں۔ ان میں بھی وہ اپنے معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ریختہ کے علاوہ انہوں نے ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان کو زبان پر ملکہ حاصل تھا اور طبیعت میں شوخی اسلئے بطور تفریح طبع انہوں نے ریختی میں بھی اچھے اچھے شعر کہے ہیں بیگمات شاہ جہاں آباد کے ایسے ٹھیٹ محاورے اور زبان استعمال کی ہے کہ رنگین اور انشا کی ریختی اور قیس کی ریختی میں امتیاز مشکل ہے۔ وہ تشبیہ و استعارے سے اپنے کلام کو جگہ جگہ رونق دیتے ہیں مگر اسمیں بھی خیال کی سادگی کو ملحوظ رکھا ہے ان کے یہاں ایہام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں حالانکہ اس دور کے شعرا کا یہ عام مذاق تھا ان کی شاعری لطافت بیان اور حسن خیال ہر حیثیت سے اپنے ہم عصروں کی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔

قیس کے یہاں اچھے اشعار کے ساتھ پست شعر بھی ہیں۔ اسکو اس دور کے ماحول اور مذاق عام کا نتیجہ سمجھنا چاہئیے۔ اگر ایک طرف انکی شاعری میں تغزل کے اعلیٰ نمونے ملیں گے تو دوسری طرف پست مثالیں بھی نظر آئیں گی! یہاں چند شعر انتخاباً درج کئے جاتے ہیں

مائل زلف پر پریدیاں جو ہوگا دوستو   سر برہنہ منہ پریشاں داغ بردل ہوئیگا
کچھ اذیتوں میں یہ صحبت ہے یار سے ہمکو   کبھو تو لطف ہوا اور کبھو عتاب ہوا
قیس سے کہتا تھا ایک بدمست اتنا کام کر   نشہ سے طاقت نہیں ہے مجھ کو پیالی تھام کر
جس وقت دیکھتا ہے مجھے وہ ستم شعار   پھیرے ہے انگلیوں کو وہ خنجر کے دھار پر
کریگا دھجیاں کب تک گریباں   کوئی دم کی تو فرصت دے ارے ہاتھ
نہیں کھلتا یہ عقدہ موج کیوں زنجیر رکھتی ہے   کوئی دیوانہ زلفوں کا ہے کیا محبوس دریا میں
گرم ایونہی رہیگا نالہ آتش فشاں   نام کو بھی پھر نہیں رہنے کا آثار قفس
کشتۂ نازک دماغاں ہوں صبا آہستہ رکھ   برگ گل تک بھی مرے مرقد کے اوپر سنگ ہے
تیرے کوچہ کے رہنے والوں کا   سنگ بالیں ہے خاک بستر ہے

عشق کی وارفتگی اور ذوق فنا ملاحظہ ہو کہ ایک عاشق صادق ماحول سے بے پروا ہوکر محبت کی دردآمیز لحیبیوں میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اسکی راتیں محبوب کے کوچہ میں بسر ہوتی ہیں جہاں بستر کی بجائے خاک اور سرہانے کے لئے پتھر ہوتا ہے۔

راہ عشق کی ایک منزل ایسی بھی ہے جہاں معشوق اپنے ظلم و ستم کے سارے حربے استعمال کرنے کے بعد جب عاشق کو اپنے دھن کا پکا اور ثابت قدم پاتا ہے تو فطری طور پر اسے کبھی اس پاک جذبہ کی بڑائی کا احساس ہوتا ہے اور وہ عاشق کی طرف نگاہِ التفات ڈالنے پر مجبور ہوتا ہے خوشگوار تعلقات بڑھتے ہیں۔ دوسرے لوگ معشوق کی اس مہربانی اور عاشق کی خوش قسمتی کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

دوست جب سے ہوا ہے تو میرا   دشمن جان یک زمانہ ہے

اس شعر میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ شاعر نے سارے زمانہ کی دشمنی کا حال بیان کرکے اپنے انتخاب کی داد چاہی ہے یہاں قیس کا معشوق ایک ایسا جمالی پیکر ہے جس کا تقرب حاصل کرنے کیلئے ایک زمانہ کو آرزو ہے، ایسے معشوق کے دوست ہو جانے کے بعد دشمنوں کی زیادتی ایک واقعہ ہے۔ اسکے بعد اپنے معشوق کی شہرت اور حسن کی یکتائی کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں

اسکے کوچہ میں تھا یہ ہنگامہ　　حشر سے بھی زیادہ کثرت تھی

عاشق جب عشق کی صعوبتوں کو جھیلتا اور راہِ محبت کی کڑی منزلوں کو طے کرتا ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں اسے اپنی سخت کوشی کا احساس ہوتا ہے تو ایک ہلکی سی مسرت اسکے غم خانۂ دل میں جاگ اٹھتی ہے اور وہ فخریہ انداز میں یوں کہتا ہے۔

زخم پر زخم داغ پہ ہیں داغ　　یہ ہمارا ہی دل ہے چھاتی ہے

وہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور راستہ کی دشواریوں کو یہ کہہ کر کم کرتا ہے۔

رنج و محنت ہو عشق میں تو کیا　　جان اپنی اگر سلامت ہے

میر کے رنگ میں قیس نے بعض بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

کیا لحنت دل کو دیکھتے ہو مردمانِ چشم　　بیدست و پا غریب مسافر ہے دور کا

انسانی ترقی کا سارا راز دل کی قوت میں مضمر ہے مگر کوچۂ عشق میں قدم رکھتے ہی یہی دل اتنا مجبور اور بےبس ہو جاتا ہے کہ اسکی بیچارگی پر ہمدردی اور قوت پر شبہ ہونے لگتا ہے اور ایسی گراں قیمت چیز کوڑیوں کے مول بک جاتی ہے۔

ہزار حیف وہ دل کوڑیوں کے مول بکا　　کہ جس کا ساری خدائی میں اختیار رہا

کہاں کا جیب کہ ہر کار تو کہاں ٹانکا　　جنوں کے ہاتھ سے باقی نہ ایک تار رہا

عشق کی وارفتگی اور جوشِ جنوں کو قیس نے کس والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب رونے سے کسی وقت فرصت ہی نہ ہو تو دیدۂ تر میں خواب کہاں۔ عاشق اپنی آنکھوں کی اس دریا دلی پر حیران ہو کر کہتا ہے۔

یک پل نہیں رہتے ہیں پانی سے جدا آنسو　　کم بخت یہ آنکھیں کیا پانی کے خزانے ہیں

معشوق کو نامۂ شوق بھیجکر عاشق جواب کے انتظار میں ہمہ تن اشتیاق بنجاتا ہے قیس نے اس کیفیت کو اسطرح بیان کیا ہے

چشم بر راہ گوش بر آواز　　منتظر بیٹھے نامہ بر کے ہیں

عشق کے بغیر زندگی بے مزہ اور محبت کی روشنی نہ ہو تو دل تاریک رہتا ہے۔

رہے یہ داغ محبت تک جگی ہے　　اسی کے دم سے گھر کی روشنی ہے

عاشق جب گریباں چاک کرتے کرتے تنگ آجاتا ہے تو کہتا ہے ۔

کریگا دھجیاں کب تک گریباں   کوئی دم کی تو فرصت دے ارے ہاتھ

ہاتھ سے تخاطب کس درجہ شاعرانہ ہے یعنی عشق نے اتنا مجبور و لاچار کر رکھا ہے کہ تیر دل تو بس کا ہوتا ہی نہیں مگر اب حالت یہ ہے کہ ہاتھ پر بھی اختیار نہیں رہا یعنی ہر چیز نذر عشق ہوگئی ۔ انتہائی بے کسی اور مایوسی کی حالت میں کہتے ہیں ۔

نہ مونس ہے کوئی نہ غم خوار ہے   مری بے کسی کا خدا یار ہے
گدا کو کرے شاہ یک آن میں   یہ قدرت تجھ ہی کو سزاوار ہے

جب میں دیکھوں ہوں ترے چشم کی گردش پیارے   یاد آتی ہے مری گردش ایام مجھے

یہاں گردش کی تکرار نے کتنا معنوی حسن پیدا کر دیا ہے ۔ بہار کی آمد پر جوش جنوں کی زیادتی کا حال ذرا قیس کے زبان سے سنیئے ۔ ہے جوش جنوں کل سے شاید کہ بہار آئی   ڈھیلے ہوئے جاتے ہیں ٹانکے بھی گریباں کے

دل کی بے راہ روی سے تنگ آکر کہتے ہیں ۔

عاجز ہوا اس دل کے میں اب ہاتھ سے یارو   گذرے ہیں اٹھاتے مجھے الزام ہزاروں

جہاں قیس کے کلام میں قنوطیت ہے وہیں شگفتگی بھی پائی جاتی ہے کہتے ہیں ۔

لے جاتے ہیں دل یونہی بس مفت میں ہنس ہنس کے   کیا قہر ہیں یہ کافر معشوق بنارس کے

اور کہتے ہیں ۔ زاہد جو بتوں کو تو کہتا ہے کہ پتھر ہیں   پتھر بھی اگر ہیں تو پتھر ہیں یہ پارس کے

اس شعر میں کتنا لطیف مزاح ہے ۔ زاہدوں کے اعتراض پر قیس کا جواب کتنا بلیغ ہے ، شاعر اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ بت پتھر کے ہوتے ہیں ، مگر ایسے پتھر کے کہ جب وہ پتھر ہاتھ آجائے تو زاہد بھی اپنا زہد و تقوی چھوڑ کر بت پرست بنجائے ۔ اور پھر لفظ پتھر کی تکرار ! سبحان اللہ ۔ قیس کے یہاں بے حجابانہ شوخی اور تیکھا پن بھی موجود ہے جو تغزل کی جان ہے ۔

قیس سے کہتا تھا ایک بدمست اتنا کام کر   نشہ سے طاقت نہیں ہے مجھ کو لیچل تھام کر
دیکھتے ہی دور سے وہ شوخ کہتا ہے مجھے   کس لئے ، کس واسطے ، کیوں ، کاہیکو آئے ہو تم

میں پوچھا آپ کسو سے بھی راہ رکھتے ہیں ۔۔۔ تو ہنس کے بولے یہ کیا بات واہ رکھتے ہیں

ذیل میں چند شعر دئے جاتے ہیں جس سے قیس کی حسن آفرینی اور مضمون آفرینی کا کمال ظاہر ہوگا، ان اشعار میں کہیں شوخی بھی جھلکتی ہے ؎ چمک ٹیکے کی اسکے اس قدر ہے ۔۔۔ خجل اب جس سے خورشید سحر ہے

صبح کو آوے تو آوے آسماں پر آفتاب ۔۔۔ شام سے جاتا رہا ہے ڈر کے مارے آپ کے

کسو کی کہیں زلف شاید کھلی ہے ۔۔۔ جو تاریک سارا زمانہ ہوا ہے

جو انوں کی ابرو سے کیا اسکو نسبت ۔۔۔ مہ نو تو بوڑھا پرانا ہوا ہے

پھینک دیکر ہاتھ سے بولا کہ دوڑو سانپ ہے ۔۔۔ دیکھ آئینہ میں اپنے زلف کی پرچھائیاں

کس کے زلفوں کی ہیں بلائیں رات ۔۔۔ ہاتھ اب تک مرے معطر ہیں

سحر کو چہرے سے دور اسکے جب نقاب ہوا ۔۔۔ بہت سا دل میں خجل اپنے آفتاب ہوا

یہ کس نے شب کو رویا اس قدر ہے ۔۔۔ جو اب تک شبنم آلودہ سحر ہے

اخلاق و موعظت قیس نے مسائل حیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عام شعرا کی طرح وہ بھی زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں بے فکری و فارغ البالی کے باوجود ان کی طبیعت حزن و ملال سے بھی خالی نہیں کہتے ہیں ؎

دنیا ہی ہے ایک سرائے غفلت ۔۔۔ کیوں دل تجھے خبر نہیں ہے

جو دم کٹے سو اسکو غنیمت ہی جان قیس ۔۔۔ یاں زندگی جو پوچھو ہے نقشہ سراب کا

زندگی کے اتار چڑھاؤ اور زمانہ کے انقلابات کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

کبھو بڑھتے ہیں اور کبھو گھٹتے ۔۔۔ یہی اسلوب ہیں زمانہ کے

دھوکے سے ادھر آگئے ہم سیر کو افسوس ۔۔۔ اس گلشن ہستی کا عجب رنگ ہے صاحب

نقادان حال کی نظروں میں اردو شاعری کا کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ابھارنے اور آگے بڑھانے کی قوت نہیں ہے برخلاف اسکے پیچھے پڑے رہنے اور زندگی کی جدوجہد سے بیزاری کی تعلیم دی گئی ہے اس سے قوم میں جمود پیدا ہوا

اور افراد کی قوت پرواز سلب ہو کر رہ گئی۔ متقدمین کی یہ کمزوری ان کے ماحول کا نتیجہ تھی وہ جس دور سے گذر رہے تھے یا جن مشکلات سے انھیں دوچار ہونا پڑا اس کا اقتضا یہ تھا کہ شگفتگی کی بجائے حزن اور قنوطیت ان کی شاعری کا جزو ہو کر رہ گئی۔ یہ چیز سب سے زیادہ میر کے حصہ میں آئی اور جن لوگوں نے میر کی تقلید کی ہے وہ اس سے کیونکر بچ سکتے؟ اس رنگ کے شعر بھی قیس کے یہاں پائے جاتے ہیں مثال کے لئے ایک شعر کافی ہے ؎

حباب آسا ابھر مت بے خبر اس بحر ہستی میں　　　بھروسہ کچھ نہیں یاں ایکدم کی زندگانی کا

مسائل زندگی کی گہرائیوں میں پہنچ کر شاعر مقصد حیات اور منزل مقصود کا پتہ لگانا چاہتا ہے وہ جتنا غور کرتا ہے اتنا ہی مقصد سے دور ہوتا جاتا ہے اور سوائے حیرت کے اسے اپنی جستجو کا کچھ حاصل نہیں ملتا آخر گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے ؎

جاتا ہے سمند عمر کیدھر　　　جس پر یارب سوار ہیں ہم

قیس کے نزدیک لطف زندگی جوانی ہی سے عبارت ہے۔

جب تلک عالم جوانی ہے　　　حاصل لطف زندگانی ہے

یہاں لوگ تھوڑے سے کچھ رہ گئے ہیں　　　عدم کی طرف کو سدھارے بہت ہیں

دیکھ کر گور سلیماں کو کل ایک عبرت ہوئی　　　جس جگہ تعویذ تھا وہاں نقش پائے مور ہے

جو نوشتہ میں لکھا ہے وہ کبھو مٹتا نہیں　　　سامنے تقدیر کے تدبیر بھی مجبور ہے

نام گر چاہے نوائے قیس ہنر پیدا کر　　　کوئی دنیا میں نہیں چیز ہنر کے مانند

اٹھ گیا آنکھوں سے پردہ جس گھڑی پندار کا　　　ہر در و دیوار سے دیکھا میں جلوہ یار کا

عشق حقیقی کی انتہا وہاں ہوتی ہے جب عقل اور پندار کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ یہی عاشقی کی معراج ہے اور یہیں سے من و تو کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے، دل کی تاریکی دور ہو جاتی ہے اور آنکھوں پر سے وہ ہلکا سا پردہ جو پندار کی وجہ سے پڑا ہوا تھا اٹھ جاتا ہے تو ہر ذرہ سے اسکی خدائی کا جلوہ آشکار اور ہر سمت سے نور مجسم کی کرنوں کا ظہور ہوتا ہے اور یہیں انسانیت مکمل اور نگاہوں میں سورج کی کرنوں کی سی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف اسی ذات کا حسن جھلکتا نظر آتا ہے

کعبہ و دیر کی خصوصیت اٹھ جاتی ہے۔

بستے ہیں اسی سے کعبہ و دیر　　کس جا پہ وہ جلوہ گر نہیں ہے

باوجود درباری شاعر ہونے کے قیس کی شاعری میں ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں جس سے فقر اور دنیا سے بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔

جب پوست کو جھٹک کر کاندھے پہ دھر لیئے ہم　　کیا فخر اپنے آگے تاج و سریر کا ہے

ہستی سے عدم کو کوچ کرنا　　اتنا تو بڑا سفر نہیں ہے

تولائے اہل بیت قطب شاہی عہد کے شعرا کی طرح اس دور کے شعرا نے بھی تولائے اہل بیت کو اپنی شاعری کا ایک ضروری جزو سمجھا ہے، ایمان، قیس، چندا اور ان کے دیگر ہم عصر شعراء کا کلام اسکے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے قیس کہتے ہیں

تھام لے قیس کو اب گردش آفات سے تو　　یا علی تیرے سوا کوئی مددگار نہیں

نہ فکر ہستی ہے اسکو نہ ہے غم محشر　　نثار دل سے جو فرزند بوتراب ہوا

قیس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ رزمیہ اشعار بھی کہے ہیں اور اس جوش اور عقیدت مندی سے کہے ہیں کہ الفاظ کی شان و شوکت اور روانی نے انکے اشعار میں میر انیس کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ تلوار کی تعریف سے متعلق جو تعلی کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس بول رہے ہیں۔

برش کا تری تیغ کے جب لکھوں میں مضموں　　خامہ سے ٹپکنے لگے دودی کی جگہ خوں

اور پرچۂ قرطاس بھی ہو جائے گلگوں　　دریا ہو لہو کا تو ہر ایک مصرعہ موزوں

حضرت عباس کی شان میں فرماتے ہیں ؎

بے شک ہے تولا ریب ہے گنجینۂ اسرار　　تو بحر ولایت کا بھی ہے گا در شہوار

جس وقت کہ خورشید قیامت ہو نمودار　　ہم سایہ علم کا ہو مرے سر پہ علم دار

نیزے کی تعریف۔ نیزے کا وہ عالم ہے ترے قبلۂ عالم　　خورشید قیامت کا ہو جس نیزے کا پرچم

دیکھے خطہ محور تو نہ پھر مار سکے دم　　وہ پھل ہے کہ پیغام قضا جس سے ہے توام

یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر نفیس سارے اصناف سخن کو چھوڑ کر مرثیہ ہی میں طبع آزمائی کرتے تو دکن میں بھی ایک میر انیس پیدا ہو چکا ہوتا۔

ریختی ریختہ کے بعد ریختی ایجاد ہوئی اور اسکے ایجاد کا سہرا ایک دکنی شاعر ہاشمی کے سر ہے۔ شمالی ہند میں رنگین اور جان صاحب نے اپنا سارا زور شاعری ریختی ہی میں صرف کر دیا۔ مطالب و معانی کے لحاظ سے یہ ہماری شاعری کا گندہ عنصر ہے ہندی شاعری میں عشق کا اظہار صنف نازک کی طرف سے ہوا ہے ریختہ گو شعرا نے اپنی دانست میں فارسی کی کامیاب نقل کی تھی کہ ایران کی امرد پرستی ہندوستان میں بھی جلوہ گر نظر آنے لگی تھی پھر شاید خیال کیا کہ فارسی کی طرح ہندی کی تقلید بھی مشکل نہیں ہے اور اس طرح ریختہ سے ریختی پیدا ہوئی۔ لیکن اردو شاعر رفتہ رفتہ ایسے غلط راستہ پر پڑ گئے کہ اس میں ابتذال کے سوا کچھ رہا ہی نہیں اس میں شک نہیں کہ اسکی وجہ سے عورتوں کی زبان اور محاوروں کا ایک دفتر ہاتھ آگیا مگر ابتذال اور گندہ مضامین سے یہ ہنر، عیب نظر آنے لگا۔ دکن کے ریختی گو شعرا میں نفیس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دلی اور لکھنو کی عورتوں کی زبان اور محاورات کا جس خوبی سے استعمال کیا ہے یہ ان کی قادر الکلامی پر دال ہے۔ بعض الفاظ تو ایسے استعمال کیے ہیں جو صرف قلعہ معلی کی بیگمات یا لکھنو کے زنانی محلات میں بولے جاتے تھے۔ مثلاً قلعہ معلی کی بیگمات دھوبن کو اجلی کہتی تھیں اسی طرح اٹھون کا میلہ بھی لکھنو کی خاص چیز ہے۔

یہاں نفیس کی ریختی کا کچھ نمونہ دیا جاتا ہے جس سے ان کی زبان اور محاوروں پر قدرت اور ریختہ گوئی کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ٹھیک ہیں مونڈھے تو اس کرتی کے لیکن اپنا — تنگ ہوتا ہے گلے میں سے گریبان ددا
کون یہ ہیکڑا نگوڑا اتنے کوٹھے کے کھڑا — گھورے ہے جو چھتی کو مرے دیکھ کے حیران ددا

سر میلے میں نہ پوشی اتاری تھی جوبن نے — اجلی نے اسے دھو کے اری لائی جھمیلا

اکدن تو مرے گھر شب مہتاب میں رہ جا — اس بات کا مدت سے ہے ارمان دوگانہ
قامت پہ یہ برستی ہے قیامت تری ولی — اس چاند سے مکھڑے کے میں قربان دوگانہ

میلے کو میں اٹھوں گے گئی کون ہے کہتی
جو جھوٹ کہے دیکھ لے قرآن دوگانہ

اری قیس کے میں تو جاتی ہوں گھر کو
مرے ساتھ چل تو بھی مہمان آ جا

غرض دیکھ کر تو بھی خوش ہو گئی دلہیں
عجب طور کا ہے وہ انسان آ جا

دو چار برس کو پھر دکھلاؤں گی باجی
ہو گی یہ جوانی میں طوفان میری کوکا

کاہیکو پہنوں گی باجی میں تمھاری انگیا
ایک سے ایک مرے پاس ہے بھاری انگیا

نوکری کرنی ہے منظور تو سیدھی کر تو
ورنہ ان نخروں سے ہوں میں ترے بیزار اصیل

طوطیاں دیکھ جیسے ہاتھ لگیں ملنے کو
قیس نے تو مری دھانی وہ رنگائی پشواز

شام ہونے آئی ہے کب قیس کے پہنچو گی گھر
کل سے کہتی ہوں کہ انا جلد لا ری چوڑیاں

راحت افزا اسے یہ کہو ائیو گلشن بو بو
ہاتھ دھونے کو مری لائیو بیسن بو بو

کیا میں کروں گی لیکے تری ہلکی اوڑھنی
لا دے وہ ودا مجھکو جھلا جھل کی اوڑھنی

دوگانہ تو کیا ہے کسو کے بھی گے
اری قیس کا کر نہ مذکور باندی

قسم ہے علی جی کی کہتی ہو تو لیا تجھسے
کروں گی تری ہڈیاں چور باندی

قصاید قیس نے کل چھ قصیدے کہے جن میں سے ایک نعتیہ ہے دو مہاراجہ چندولال کی مدح میں اور ایک ایک شمس الامرا اور محتشم الدولہ کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ فرزند رشید الدین خاں بہادر کی تسمیہ خوانی کی تہنیت میں بھی کہا ہے۔ قصیدہ نعتیہ کے تشبیب کے اشعار یہ ہیں۔

فلک پہ دیکھتا ہوں میں جو کہکشاں کی بہا
پڑا ہے گردن مینا میں موتیا کا ہار

نہ کیوں ستاروں سے ہو چرخ اطلسی کی بہا
لکھا ہے ابری زرکار پر خط گلزار

بچشم غور تو خط شعاع کو دیکھ اے دل
خدا ہی جانے یہ کس کا ہے جادۂ رفتار

کہاں ہے دانۂ شبنم پیالہ میں گل کے
دھرے ہیں کاسۂ یاقوت میں در شہوار

شفق سے نیچۂ خور ہے نہ کچھ حنا آلود　　کہ صبح نکلی ہے رکھ سر پہ چہرۂ گلنار
خیال دل کو یہ آتا ہے دیکھ پروین کو　　گیا ہے بھول کسو نے یہ طرۂ دستار
ہزار رنگ کے دیکھے ہیں باغ دہر میں گل　　سوائے ماہ کے دیکھا نہ کوئی گل خار

قیس نے قصائد میں سودا تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، ان کی تشبیہوں میں کس قدر استادانہ رنگ تشبیب میں اس طرح گلفشانی کرنے کے بعد اس طرح گریز کی ہے۔

کمیت خامہ کو جلدی سے پھیر کر اے قیس　　شروع یہاں سے تو کر وصف احمد مختار
گئے ہیں رات جو معراج کو شفیع امم　　کئے حصول ملاقات ایزد مختار
کہا خدا نے محمدؐ سے اے حبیب مرے　　میں خرقہ دیتا ہوں لے اسکو احمد مختار
بزرگی ہے تو علی کو ہے بعد پیغمبر　　غلط ہے جھوٹ ہے ناحق ہے ہیچ کی تکرار
جو شان مرتضوی تھی سو میں کیا تحریر　　کہ ہے وہ قوت بازوئے احمد مختار

متعدد شعر نعت و منقبت حضرت علی میں کہنے کے بعد ختم یوں کیا ہے۔

خموش رہ تو یہاں سے کلام کر موقوف　　بس آگے جائے ادب ہے نہ کیجیو تکرار

قصیدۂ مدح۔ مہاراجہ چندو لال کی تشبیب کے اشعار ہیں۔

آج گلشن میں ہے باد سحری نافہ کشا　　دم عیسیٰ سے فزوں تر ہے دم باد صبا
شاخ جو خشک تھی ہیں اسنے گل تر پھوٹے　　گوش گل تیز ہے اور دیدۂ نرگس بینا
حوض کے گرد ہے یوں لالۂ احمر کی بہار　　جس طرح کاسہ گوہر پہ ہو تحریر طلا
فی المثل سنگ پہ گر کاسہ یاقوت گرے　　نقش پڑ جائے ہے ازبسکہ ملائم ہے ہوا
رخ پہ گر باد بہاری کے اٹھے دست نگار　　سبز ہو جائے وہیں پنجۂ گلگوں پہ حنا
آسماں رشک گلستاں سے ہے ایسا پر خوں　　گر زمیں شفق ہو تو یک بار فلک جائے سما

کم نہیں بیضۂ قمری سے حباب لب جو
بچہ آتا ہے نکل چلتی ہے جب باد صبا

اتنے میں شیشہ کو ساقی نے ہلا مستی میں
ہاتھ میں ساغرے بھر کے مجھے کہنے لگا

ہاں کوئی مطلع رنگین غزل کر تو رقم
کہ جسے سن کے کہے مرغ چمن صل علی

پشت لب سے نہ تری سبزۂ خط ہے پیدا
درج یاقوت کو یہ قفل زمرد ہے لگا

ساغرے پہ گرے عکس دہن جب تیرا
ہر حباب مئ گلگوں سے ہو غنچہ پیدا

دیکھ کر سرمہ کا دنبالہ تری آنکھوں میں
کتنا افسوس ملے رشک سے صفاک قضا

گریز یوں کی ہے ۔

فائدہ کیا ہے غزل گوئی سے تجھکو اے قیس
چھوڑ یہ مشغلہ تو وصف کیا کر اس کا

ہے جو اسکندر دوراں کا وزیر اعظم
جھکے ہے سایۂ الطاف میں عالم جلتا

کون وہ یعنی مہاراج کہ ہے چندولال
شرق سے غرب تلک ہے دو جہاں میں یکتا

کوکب برج شہادت قمر اوج جلال
معدن لطف وکرم گوہر دریائے سخا

کیا کہوں وصف کفِ جود و سخا کا تیری
ماہ سے ماہی تلک کہتے ہیں یوں صبح ومسا

آج وہ ہے تری سرکار کہ چشم بد دور
پھالہ بردار جلو میں تری حاتم ہوگا

اس قدر ہے تری میزان عدالت مشہور
کاہ اور کوہ میں کچھ فرق نہیں تنکے کا

خاتمہ کیا ہے ۔

ختم کرتا ہے قصیدہ کو دعائیہ پہ قیس
کہیں آمین ملک باب اجابت ہے کھلا

یا الٰہی رہے روشن یہ چراغِ دولت
جب تلک مہر کی قندیل فلک پر ہے ضیا

اس گھرانے کے جو اعدا ہیں سروں سے انکے
نجدا ہو وے کبھو سایۂ شمشیر قضا

قصیدہ درمدح شمس الامراء ۔

کیا نخل دعا نے دوستو کس کے ثمر پیدا — ہوئی گویا کف بیضائے موسیٰ سے سحر پیدا
عبادت خانۂ مشرق سے رہبان فلک نکلا — رخ پر نور سے ہے جس کے سجدہ کا اثر پیدا
ہمائے آسماں کا جلوۂ پرویز رنگیں ہے — شعاع نور قدسی سے کئے کیا بال و پر پیدا
مبارک باد کی ہے دھوم رمضان عالم میں — کیا ہے زہرہ اظہر نے وہ آہنگ تر پیدا
بھرا ہے ہر قدح لالہ کا اتنا شبنم تر سے — کہ ہوں جوں حصہ یاقوت میں عقد گہر پیدا
ترانے گا رہی ہیں بلبلیں یوں شاخ گلبن پر — کہ ہر ہر کے ترنم میں ہے آہنگ دگر پیدا
غلط حاتم کا شہرہ ہے جہاں میں حاتم دوراں — کیا اس نے زمانہ میں یہ کب گنج و ہنر پیدا
سخاوت کا تری بہتا ہے دریا سطح گردوں پر — ہر اک انجم کے سر پر ہے حباب تاج زر پیدا
نہ ہو کیوں شمس الامرا شاد خلقت عہد میں تیرے — کہ شادی نے کیا ہے خانۂ شادی میں گھر پیدا

خاتمہ ہے -

قصیدہ کو دعا پر ختم کر قیس ہنر پرور — کہ محمل سے اجابت کے ہے لیلائی اثر پیدا
بحق پنجتن اب گلشن امید سے تیرے — قیامت تک الٰہی ہو درخت بارور پیدا



NAWAB MOHAMMAD ABUL FAKHR, FAKHRUDDIN KHAN, IMAM JUNG II
KHURSHID-UD-DOWLA, KHURSHID-UL-MULK, SHAMS-UD-DOWLA II,
SHAMS-UL-MULK II, SHAMS-UL-UMRA BAHADUR II,
AMIR-E-KABIR I.

مہاراجہ چندو لال شاداںؔ

از

مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب



" Pictorial Hyderabad."

مہاراجہ چندولال بہادر شاداں

مہاراجہ چندولال شاداںؔ

جب حضرت آصف جاہ اول دکن میں تشریف لائے تو خاندان راجہ ٹوڈرمل کے ایک رکن رکین کو بھی ساتھ لیتے آئے جو اپنے تدبر، فراست اور حسن انتظام کے باعث محمد شاہ کے دربار میں عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے جب دکن پہنچے تو نظامت کروڑگری کی خدمت سے سرفراز ہوئے اور تادم مرگ اسی عہدہ پر مامور رہے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ عہدہ ان کے فرزند رائے لچھمی رام کے تفویض کیا گیا۔ گو نواب میر نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں چند اسباب کی بنا پر انہوں نے ملازمت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن جب نواب رکن الدولہ عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے تو وہ پھر بحال کر دیئے گئے اور تاحیات یہی خدمت انجام دیتے رہے۔

رائے لچھمی رام کے پانچ فرزند تھے۔ ۱۔ نانک رام۔ ۲۔ نارائن داس۔ ۳۔ رگھوناتھ داس۔ ۴۔ بھوانی داس۔ ۵۔ موہن لال۔

چونکہ نانک رام خلف اکبر تھے اسلئے انہی کو موروثی عہدہ ملا۔ دوسرے فرزند رائے نارائن داس نے برہان پور میں سکونت اختیار کی اور وہیں یہ (چندولال) ۱۱۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ لیکن کم عمری میں باپ کی دائمی مفارقت کی وجہ سے اپنے چچا رائے نانک رام کے آغوش حفاظت و تربیت میں پرورش پائی۔ چچا نے ایسا محبت آمیز اور مربیانہ برتاؤ کیا کہ انکے دل سے باپ کی مفارقت کا داغ بہت جلد مٹ گیا اور وہ اپنے عم زاد بھائی لکھپت رام کے ساتھ تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔

جب چندولال سن شعور کو پہنچے تو انکی ذہانت اور فراست کا حال سن کر نواب شمشیر جنگ نے ان کو اپنے تعلقہ کی کارپردازی پر متقرر فرما دیا۔ اس طرح ایک عرصہ تک شمشیر جنگ اور بدیع الزماں ناظم کروڑگری کی ماتحتی میں ان کو کام کرنے کا موقع ملا۔ پھر نور محمد ناظم کروڑگری کے دور حکومت میں سبزی منڈی کی خدمت محرری پر علاقہ کروڑگری میں ان کو ترقی دی گئی چونکہ یہ طبعاً فیاض تھے ان کی سخاوت کے افسانے مشہور ہونا شروع ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز حضرت بخشی بیگم صاحبہ محل حضرت

غفران مآب کے سمع ہمایوں تک پہنچا تو انہوں نے ان کو طلب کیا اور بیلے کی خدمت عطا کی اسی دوران میں قسمت کی یاوری سے سنہ ۱۲۱۲ھ میں مشیر الملک کی سفارش پر پیشگاہ خسروی سے ان کو راجہ بہادر کا خطاب سرفراز ہوا اور ساتھ ہی ساتھ مواضع کڑپہ گنجی کوٹ وغیرہ کے انتظام کی غرض سے چار ہزار پیدل و چار ہزار سوار کی معیت میں قلعہ سدوٹ کی مہم پر بھیجے گئے اور وہ نہایت ہی خوبی کے ساتھ سرکشوں کو مغلوب کر کے کامیابی کے ساتھ واپس ہوئے اسکے کچھ ہی دنوں بعد شمس الامرا بہادر کی نظر فیض اثر ان پر پڑی اور انہوں نے جمعیت پائیگاہ کا کام ان کے سپرد کر دیا چنانچہ راجہ چندو لال نے اس خدمت کو بھی نہایت ہی عمدگی سے انجام دیا۔"

سنہ ۱۲۱۴ھ میں راجہ لکھپت رام کے انتقال کی وجہ سے نظامت کروڑگری کی خدمت پر راجہ چندو لال کا تقرر کر دیا گیا اور ہر اچھے موقع پر نظر انتخاب انہی پر پڑتی رہی اور یہی وجہ تھی کہ انکی ترقی نظامت کروڑگری تک محدود نہیں رہی نواب شمس الامرا بہادر کی سفارش پر حضرت مغفرت منزل سکندر جاہ بہادر نے ان کو افواج آصفی کی خدمت پیشکاری سے افتخار بخشا یہ میر عالم کی مدار المہامی کا زمانہ تھا اور راجہ چندو لال کی قابلیت و دیانت ہی کا نتیجہ تھا کہ مدار المہام وقت نے انہیں کو اپنا معتمد علیہ بنا لیا۔ میر عالم کے انتقال کے بعد منیر الملک صدر المہامی پر فائز ہوئے تو اس وقت بھی چندو لال ملکی و مالی معاملات میں مدار المہام وقت کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

اس زمانے میں ان کا اقبال بلندی پر تھا، سنہ ۱۲۳۵ھ میں سکندر جاہ بہادر نے انکو مہاراجہ کا خطاب دیا، نوبت جھالر دار پالکی سے مفتخر فرمایا اور انعام میں ایک کروڑ روپیے نقد علیحدہ مرحمت ہوئے جب مہاراجہ ہی کی کوشش سے صاحبزادہ مبارز الدولہ بہادر قلعہ گولکنڈہ سے بلوا لیے گئے تو اس مسرت میں دہ ہفت ہزاری منصب جلیلہ سے بھی سرفراز فرمائے گئے جب نواب سکندر جاہ بہادر نے انتقال فرمایا اور ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ رابع تخت نشین ہوئے تو انہوں نے سنہ ۱۲۴۵ھ میں اپنے جلوس کی خوشی میں مہاراجہ بہادر کو راجہ راجایاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور جس قدر قرضہ انکے ذمہ تھا وہ سب معاف کر دیا گیا اور کئی مرتبہ خود بہ نفس نفیس راجہ راجایاں کی قیامگاہ پر تشریف لا کر عزت افزائی فرمائی۔

سنہ ۱۲۴۷ھ میں نواب منیر الملک کا انتقال ہوا تو پھر ایک بار ان کو ہر لیے بہار پر نظر انتخاب پڑی اور عنان وزارت

راجہ راجایان مہاراجہ چندولال بہادر کے مبارک ہاتھوں دیدی گئی۔

مدارالمہامی کی خدمت انہوں نے نہایت مستعدی، جفاکشی اور دیانت سے انجام دی۔ انکی ان تھک مصروفیتوں کی داد نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی دینے لگے، اکثر موقعوں پر رزیڈنٹ نے بھی انکی تعریف کی ہے۔

۱۲۵۸ھ میں مہاراجہ بہادر وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوئے اور ایک سال بعد بروز شنبہ، ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ ۸۶ سال کی عمر پاکر انتقال کیا، لیکن انکے کارناموں اور ادبی خدمات کو بقائے دوام حاصل رہیگا۔

مہاراجہ چندولال نے بہت ہی معمولی درجے سے ایک اعلیٰ درجے تک ترقی کی لیکن تواضع اور انکسار میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ خود صاحب علم و فضل تھے اور ہمیشہ اہل علم ان کی صحبت میں رہتے تھے وہ کم ظرفوں کی صحبت سے بے زار تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں

ماہی ہو اگر گندی تو پانی کرے گندہ　　　مجلس میں نہ رکھے اسے جو ہووے شرناک

مہاراجہ کی فیاضی حیدرآباد تو کیا تمام ہندوستان میں آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ انکی سخاوت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ بچپن سے لیکر، جب ان کو صرف ایک روپیہ میوہ خوری کیلئے ملتا تھا، آخر دم تک جب وہ وزیر اعظم ہو گئے تھے انکی فیاضی کا وہی حال تھا اسلئے اگر یہ کہا جائے کہ فیاضی ان کی فطرت ثانی تھی تو بیجا نہ ہوگا وہ خود بھی فرماتے ہیں۔

دینے والے کو بجز داد و دہش کب چین ہے　　　خوش بہت ہوتا ہے جس دم اسکو سائل مل گئے

مہاراجہ چندولال کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی تھی، شاداں تخلص کرتے تھے اور شاعروں کی سرپرستی اور امداد میں تاریخ ادب اردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتے انکی داد و دہش کا شہرہ سنکر دور دراز مقامات سے صاحبان علم و فضل کے ساتھ ساتھ شعرائے باکمال بھی حیدرآباد پہنچ گئے تھے شاہ نصیر اور شاہ حفیظ وغیرہ انہی کی طلب پر حیدرآباد آئے تھے اور دہلی کے آخری ملک الشعرا استاد ذوق اور لکھنو کے استاد ناسخ کو بھی انہوں نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی مگر ذوق نے یہ شعر لکھکر معذرت چاہی:۔

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن　　　کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑکر

تقریباً ہر روز رات شب میں انکے یہاں مشاعرہ ہونا اور شعرا کا کافی مجمع رہنا، ان کو شعر و سخن سے دلچسپی ہی نہ تھی

بلکہ وہ شعراء و علماء کی بڑی قدر کرتے تھے اور ہر ایک کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے گرد تین سو سے زاید شعراء جمع ہو گئے تھے اور مولف "تذکرہ شعرائے دکن" لکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کی تنخواہیں مقرر تھیں اور کسی کی تنخواہ سو سے کم یا ہزار سے زائد نہ تھی۔ اسی سے انکی داد و دہش اور شعراء کی قدردانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے درباری شعراء علماء و فضلاء سے چند باکمالوں کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں جس سے اس امر کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ چندولال نے اردو ادب کی کیا خدمت کی۔ اور کیسی کیسی ہستیوں کو اپنے اطراف جمع کر لیا تھا۔

شاہ نصیر، شاہ حفیظ، غلام ضامن اکرم، ملا محمد علی ساغر، میر مفتون، میر حسین علیخاں ایما، حافظ تاج الدین مشتاق، ذوالفقار علی خاں صفا، خواجہ ہمت علی خاں ہمت، حکیم شفائی خاں، میر امجد علی خاں، مروان علی خاں، حکیم عباس علیخاں، حکیم یادگار علی خاں، ملا محمد فائض، حکیم مرتضیٰ خاں، میر باقر، مرزا محمد طاہر ظہیری، مرزا عابد علی بیگ خاں ظہور وغیرہ وغیرہ۔ شاداں کے دونوں اردو دیوانوں کی تاریخ ظہوری نے کہی ہے۔

پہلے دیوان کی تاریخ :— یہ دیوان دفتر ہے توحید کا
۱۲۳۹ھ
دوسرے دیوان کی تاریخ :— تاریخ اسکی کیوں نہ ہو دیوان بے نظیر
۱۲۴۳ھ

شاداں کا کلام قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعیات پر مشتمل ہے لیکن جو خوبیاں انکی غزلوں میں پائی جاتی ہیں قصیدہ اور مثنوی وغیرہ میں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی ہی کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدے دو تین سے زیادہ نہیں لکھے اور مثنویوں کا بھی یہی حال ہے۔

ان کا کلام پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انکی شاعری اکتسابی یا فنی نہیں ہے، بلکہ وہ فطری شاعر تھے، انکو شعر و سخن کا صحیح ذوق تھا۔ کسی شاعر کا کلام اسکے جذبات و کردار کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ خصوصیت شاداں کے کلام میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ انکا کلام ہر جگہ انکے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاداں کے کلام میں فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ محاسن اگر اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ انکے کلام کا مقابلہ کسی استاد سخن سے کیا جائے تو اسکا واحد سبب یہی ہے کہ انھوں نے ہر جگہ نہایت ہی سادگی کے ساتھ اپنے خیال کو کامیابی سے ادا کیا ہے اور انکا مقصد اپنے ذوق کی تکمیل کرنا تھا

نہ کہیں انہوں نے فلسفہ و حکمت کی گتھیاں سلجھانے کی سعی کی ہے، نہ کہیں زندگی و موت کے حل طلب معموں کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ سچے جذبات کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ خود بخود مل جاتے ہیں۔ یہی رنگ شاداں کے کلام میں ہر جگہ نظر آئیگا۔ الفاظ کے تکلف اور صناعی میں پڑکر انہوں نے اپنے اصلی رنگ کو نہیں چھوڑا۔ انکا مقصد اپنے ذوق کی تکمیل کرنا تھا، "جو دل میں تھا وہی زبان پر آ گیا" اسپر بھی صدہا شعر ایسے ہیں جو ہر طرح شاعرانہ محاسن کے حامل ہیں۔

اب ہم ان کے نمونہ کلام سے یہ ثابت کریں گے کہ انکی شاعری کس قدر ان کے کردار و جذبات کی آئینہ دار ہے۔

شاداں ایک مذہب پرست اور صوفی منش انسان تھے چنانچہ انکے کلام میں تصوف کا رنگ جگہ جگہ جھلک پڑتا ہے۔

پاؤں پر میرے قناعت کی لگی ہے مہندی   تو جو کہتا ہے مجھے دوڑ تو میں جاؤں کہاں

انہوں نے خود بھی جفاکشی اور محنت سے ترقی کی ہے اور اسی کی تلقین کرتے ہیں۔

تو بتدل اپنے کو نہ کر چھوڑ کے گن کو   بے کار پڑا رہتا ہے لکڑا جو ہو گھن کا

فرماتے ہیں کہ جو لکڑی بیکار پڑی رہتی ہے اس میں گھن لگ جاتا ہے اور پھر وہ کسی کام کی نہیں رہتی۔ تو بھی بے کار نہ رہ اور خود کو ذلیل و خوار نہ کر!

انکا کلام پند و موعظت سے بھرا پڑا ہے جہاں کہیں موقع ملتا ہے نصیحت کی دو چار باتیں کہہ جاتے ہیں۔

نہ بھٹکے گا نہ بھولے گا وہ رستہ   براہ راست جو کوئی چلے گا

جوہری کے سامنے جوہر کھلے تو قدر ہو   راز دل اسنے نہ کہہ تو جن کے سینے تنگ ہیں

مرغ بے ہنگام کو کرتے ہیں دور   بات ہوتی ہے بھلی ہنگام پر

جو کرتا ہے محنت وہ پاتا ہے راحت   جو پیسے ہے آٹا وہی چھانتا ہے

لالچ ہے بری چیز خبردار ہو شاداں   جان اپنی گنواتی ہے مگس میٹھے کی لالچ

مت مکر جو کہ بات سچی ہے   منہ سے مت کر جو بات کچی ہے

نص قرآن پہ عمل کیجے   بار جو کہہ گیا سو بچی ہے

دنیا کی بے ثباتی کا کس خوبی سے اظہار کیا ہے :—

شکل ہستی سراب کی سی ہے   بے ثباتی حباب کی سی ہے

شاداں کے کلام میں ہر جگہ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ وہ سچے بادشاہ پرست تھے، وفاداری کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ اگر پورے کلام سے ایسے اشعار علیحدہ کر لئے جائیں جو حضرت سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کی مدح میں کہے ہیں تو ایک چھوٹا سا دیوان تیار ہو جائے یہاں صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

شاہ دکن کی ذات ہے حاجت روائے خلق   اک میری کیا ہر ایک کی حاجت روا ہوئی

سکندر رسا نہ دیکھا ہم نے سلطاں   جہاں کو کر رکھا ہے جس نے بستاں

دیکھا نہ کوئی سلطاں تم سا نہ سکندر   برتر تمھارا رتبہ ہے کیقباد و جم سے

مثال سد سکندر رشتہ سکندر کی   رہے جہاں میں سدا استوار سالگرہ

جو دور فلک میں نظر کر کے دیکھا   نہیں کوئی شاہ سکندر کا ثانی

جس کا ہے نام شام سے لے روم تا عجم   ایسا ہے بادشاہ ہمارے دکن کے بیچ

شاداں ہر ایک ملک سے آتی ہے خلق یاں   ہے کس طرح کی سیر ہمارے وطن کے بیچ

آخر میں عاشقانہ رنگ کے چند اشعار نقل کر کے یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے :—

ہے کسی کے عارض روشن سے شرمائی ہوئی   پردۂ فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع

ہوتا ہے کون عاشق ناشاد کی طرف   سارا جہاں ہے اس ستم ایجاد کی طرف

میٹھی باتیں کر لے اپنے یار سے   میں تجھے کہتا ہوں سن لے پیار سے

دوسرے سے کیا تجھے اب کام ہے   کام رکھ تو اپنے اک دلدار سے

زاہد و آجائے جب ماہ صیام   ڈرتے رہئے مست اور سرشار سے

اپنی الجھن تجھ سے شاداں کیا کہوں   دل ہے الجھا طرۂ طرار سے

کیا کہئے رات کیسی کٹی اُس کے پیار میں ‏ کس کس مزے کے لطف تھے بوس و کنار میں

سو سو طرح سے لیتے تھے بستر پہ کروٹیں ‏ گذری تمام رات ترے انتظار میں

ہشیار ہو پیارے اب وقت صبح آیا ‏ غفلت میں مست مت ہو یہ کیسی مستیاں ہیں

تمھارے ایسے کہیں بدگمان تم تو ہیں ‏ گمان ہوتا ہے پر تم کو ہے گمان نیا

دیکھ رفتار تری کبک بھی گم کردے چال ‏ قد و قامت سے ترے سرو کی رعنائی کیا

گلبدن دیکھ تجھے غنچہ ہوا ہے دل تنگ ‏ آگے عارض کے ترے گل کی ہے رعنائی کیا

چھپ کے اسکو دیکھنا چاہیں تو دیکھیں کس طرح ‏ دیکھنے دیکھے نہ کوئی ہم کو ڈر یہ بھی تو ہے

بو سے لینے ہی سے پژمردہ ہوئے جاتے ہو ‏ رشک گل اتنی بھی نازک بدنی خوب نہیں

دردِ سر دیکھ کے کتنوں ہی کا مٹ جائیگا ‏ اپنے ماتھے کو تو جس وقت تلک سے بھر دے

آنکھ یوں بیٹھ کے ظالم پس چلمن مارے ‏ تیر جیسی کہ صف جنگ میں ارجن مارے

ابر چھایا ہے مزے کا ہے سماں ‏ ہاتھ سے میرے یہ ساغر پیجے

جز تمھارے نہیں مقصد کچھ اور ‏ تم سے جو مانگتے ہیں سو دیجے

جو مانگ سر پہ ترے میری جاں نکل آئی ‏ اسی کے دیکھنے کو کہکشاں نکل آئی

کہاں ہے چال صبا کی ترے چلن کی سی ‏ نہیں ہے غنچے میں تنگی ترے دہن کی سی

جو تماشائی ہے زلفِ یار کا ‏ وہ نہ گلشن میں پئے سنبل گیا

جب کہ رکھتا تھا زمیں پہ پاؤں وہ وقتِ خرام ‏ چشم و دل زیر قدم تھے کب زمیں پر پاؤں تھے

رنگ مسی میں نہاں ہیں اس طرح وہ لعل لب ‏ ابر میں مہتاب اور پردے میں جیسے راز ہے

ہے کام یہاں عاشق صادق کا وگرنہ ‏ اٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بارِ محبت

سیر کو جاوے ہے جب سروِ خراماں میرا ‏ غنچے سب پیار سے لیتے ہیں بلائیں چٹ چٹ

آتا ہے کس ادا سے بت نازنیں مرا
کرتا ہے مہر و مہ کو خجل مہ جبیں مرا

جلوۂ حسن تیرا کیا کہئے
جس نے دیکھا وہ بس نشانہ تھا

ہم تو مشتاق دید تھے صاحب
اپنا منہ ہم سے کیوں چھپانا تھا

آتش رخ پر سپند آسا ہے دل عشاق کا
جان سے قربان ہیں رخسار کا تل دیکھ کر

ساقیا جلد آ تو محفل میں
بن ترے دور جام ہے موقوف

آسماں پر ہے دماغ اس کا غرور حسن سے
کیا رسائی ہو کسی کو اس بت مغرور تک

روز و شب تجھکو صورت نرگس
مہر و ماہ دیکھنے نکلتے ہیں

مست کرتا ہے اک نگاہ میں تو
کب تجھے دیکھ ہم سنبھلتے ہیں

جس نے دیکھی نرگس شہلا تری مدہوش ہے
کہہ نہیں سکتا مثال آئینہ خاموش ہے

یہ ماہ جبیں گرمی صحبت نہیں سہتے
شبنم کی طرح ٹپکے ہے پوشاک سے پانی

اب شکل دکھا حجاب مت کر
سو جاں سے ترے نثار ہیں ہم

جھٹکے بھی تو چھوڑیں گے نہ تجھکو
دامن کے ترے غبار ہیں ہم

قابل نظارہ ہے اس ماہ طلعت کا بناؤ
زلف یوں چہرے پہ ہے جوں ماہ اور ہالا بھی ہے

تجھے جو نافرماں ہوئے سب اعذار
کیا جمائی تو نے مسی کی دھڑی

لعل میں آیا نظر نیلم کا رنگ
جب جمائی لب پہ مسی کی دھڑی



(عمل ناخن تمیز)

NAWAB NASIRUDDAWLA BAHADUR

نواب ناصرالدولہ بہادر آصف جاہ رابع

تیسرا دور

سنہ ۱۲۲۵ھ سے سنہ ۱۳۰۱ھ تک

اس دور میں نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث سنہ ۱۲۴۴ھ کے بعد نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع سنہ ۱۲۷۳ھ اور نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس سنہ ۱۲۸۵ھ اور ان کے وزراء و امراء مثلاً مہاراجہ چندو لال شاداں سنہ ۱۲۶۱ھ اور نواب فخر الدین خاں شمس الامراء سنہ ۱۲۷۹ھ اور ان کے فرزندوں نے بے نظیر سرپرستیوں کی وجہ سے حیدرآباد کو اردو ادب کا مرکز بنا دیا۔ یہ دراصل فیض سنہ ۱۲۸۳ھ اور ان کے شاگردوں کا عہد تھا جن پر ایک مبسوط تذکرہ قلمبند کیا جا چکا ہے جس کے قلمی نسخے اسوقت محفوظ ہیں۔ اس دور کے شعراء میں فیض کے علاوہ تمیز، باقی، فیاض، عصر اور ناجی کے متعلق اس مجموعہ میں تفصیلی مضامین شامل ہیں لیکن اس زمانہ میں حیدرآباد میں سو سے زیادہ ممتاز شعراء موجود تھے۔ میر حسین علیخاں ایماں سنہ ۱۲۳۰ھ۔ میر بہاء الدین حسین خاں عروج سنہ ۱۲۳۰ھ۔ میر عباس علیخاں احسان سنہ ۱۲۳۰ھ۔ میر عباس علیخاں کافی سنہ ۱۲۳۰ھ۔ اور میر سجاد علیخاں سجاد سنہ ۱۲۴۰ھ۔ وغیرہ اس دور کے اوائل کے مشہور شعراء ہیں۔ بعد کے شاعروں میں حافظ غلام محمود محمود سنہ ۱۲۸۶ھ۔ شاہ معین الدین خاموش سنہ ۱۲۸۶ھ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک سنہ ۱۲۹۱ھ۔ اور محمد روشن خاں روشن سنہ ۱۳۰۰ھ کے علاوہ افتخار علی شاہ وطن۔ حکیم مظفر الدین خاں مزاج۔ محمد محسن محسن، حفیظ الدین یاس، سچولال تمکین، سیتل پرشاد خرم، میر احمد علی قاضی، بہاری لال رمز اور دیگر متعدد تلامذہ فیض شامل ہیں جن کے حالات اور نمونۂ کلام "تذکرہ تلامذہ فیض" مولفہ میر احمد علی عصر میں موجود ہے۔ حیدر علی حیدر، فیاض الدین مرد اور عبداللہ حسینی افسر بھی انہی کے معاصر ہیں۔

اسی زمانہ میں حیدرآباد میں متعدد ایسے شعراء بھی موجود تھے جو یہاں کی قدردانی سخن سے مستفید ہونے کیلئے دور دراز

مقامات سے آئے تھے اور جن میں سے بعض تو یہیں رہ پڑے اور حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ جو شعرا اس دور میں وارد حیدرآباد ہوئے ان میں حسب ذیل مشہور ہیں۔ شیخ حفیظ ۱۲۴۲ھ۔ مرزا علی رضا مجنون ۱۲۵۲ھ۔ عیسیٰ خاں آفاق ۱۲۵۳ھ۔ شاہ نصیر ۱۲۵۴ھ شیخ وزیر علی مسرت ۱۲۵۷ھ۔ حیدر بیگ خاکی ۱۲۵۰ھ۔ ذوالفقار علی خاں صفا ۱۲۶۱ھ۔ حبیب اللہ ذکا ۱۲۹۱ھ۔ میر احمد علیخاں شہید ۱۲۹۲ھ۔ میر سرفراز علی صفی ۱۲۹۳ھ۔ سید غلام حسین قدر ۱۳۰۱ھ۔ اور میر کاظم علیخاں شعلہ ۱۳۰۴ھ وغیرہ۔

یہ پچہتر سال اردو شاعری کے عہد زرین سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں دکن کے علاوہ شمالی ہند میں بھی متعدد اعلیٰ پایہ کے شاعر موجود تھے مثلاً انشا ۱۲۳۳ھ۔ مصحفی ۱۲۴۰ھ۔ نظیر ۱۲۴۶ھ۔ رنگین ۱۲۵۱ھ۔ ناسخ ۱۲۵۴ھ۔ ممنون ۱۲۶۰ھ نسیم لکھنوی ۱۲۶۰ھ۔ آتش ۱۲۶۳ھ۔ مومن ۱۲۶۸ھ۔ وزیر ۱۲۷۰ھ۔ ذوق ۱۲۷۱ھ۔ نسیم دہلوی ۱۲۸۱ھ۔ رشک ۱۲۸۴ھ۔ آزردہ ۱۲۸۵ھ۔ غالب ۱۲۸۵ھ۔ شیفتہ ۱۲۸۶ھ۔ انیس ۱۲۹۲ھ۔ دبیر ۱۲۹۲ھ۔ اسیر ۱۲۹۷ھ۔ منیر ۱۲۹۸ھ اور بحر ۱۳۰۰ھ وغیرہ۔

حافظ میر شمس الدین محمد فیض

از

مرزا سرفراز علی صاحب
سابق نائب مدیر مجلۂ عثمانیہ۔ مدیر الموسی

حافظ میر شمس الدین محمد فیض

وطن کی قابل ہستیوں کی قدر و منزلت، اُن کے کارناموں کا مطالعہ اور اُنکی یاد کو قائم رکھنے کا اہتمام ہر زندہ قوم کے پسندیدہ وظائف میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔ مغرب والے بڑے سلیقہ اور احتیاط سے اس گتھی کو سلجھا لیا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک لمحہ کیلئے بھی ذہنی افلاس اور علمی بے مائگی سے سابقہ نہیں پڑتا۔

حیدرآبادی قومیت تاریخی دور سے گذر رہی ہے، ایسے تابناک زمانہ میں فیض جیسے باکمال بزرگ کے کارناموں کو نظر انداز کر دینا انتہائی بے پروائی ہوگی۔ ان کا نام حافظ میر شمس الدین ہے۔ ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ تاریخ ولادت "وجود مظہر کل" (۱۱۹۵) سے ظاہر ہوتا ہے۔

دہلی کے دور آخر کے ممتاز ترین شعراء غالب، مومن، ذوق اور شاہ نصیر نے اسی زمانے میں وہاں اپنی بساط شاعری بچھا رکھی تھی۔ اور یہاں ان کا طوطی بول رہا تھا۔

فیض کے جد امجد مولوی میر رحمت اللہ حضرت آصفجاہ ثانی کے عہد میں دہلی سے حیدرآباد آئے۔ یہاں کی فیاضیاں افسانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس کسی نے ادہر کا رخ کیا، یہیں کا ہو رہا۔

میر رحمت اللہ بھی اس فضا سے کیونکر بچ سکتے، یہیں کے ہو رہے اور بارگاہ خسروی سے ایک گرانقدر منصب بھی حاصل کیا

میر امیر الدین انہیں کے فرزند ہیں جو حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد ایلچ پور (برار) میں مقیم ہو گئے۔ یہاں اُن کے قیام کی مدت تقریباً آٹھ، نو سال معلوم ہوتی ہے۔ فیض کی عمر دو یا تین سال کی ہوگی جب اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد چلے آئے۔ یہیں اُنھوں نے تعلیم پائی ذہن خداداد تھا۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا یہ معمولی بات نہ تھی۔ اسی طرح جلد جلد علوم متعارفہ پر عبور حاصل ہوتا گیا عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ناخن سے خوشنما نقش و نگار اور ایسے خوبصورت حروف بناتے تھے کہ اچھے اچھے خوشنویس دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے۔ اُن کا ایک

ایرانی نژاد ملا فاتی خطِ ظفر کا ماہر تھا' یہ اس سے اس فن کو سیکھنا چاہتے تھے اور وہ آمادہ نہ ہوتا تھا۔ آخر بلا تعلیم چند ہی روز میں آپ ہی آپ اس فن میں ایسی مشاقی اور مہارت حاصل کی کہ وہ بھی ان کے نقوش ناخن دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ ان کا بہترین مشغلہ درس و تدریس اور ورد و وظائف تھا' رات دن' عقیدت مندوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ صاحب طریقت بھی تھے مریدین اور عقیدت مندوں کے ساتھ شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ نواب شمس الامراء اور ان کے فرزندوں کے علاوہ حکیم مظفر الدین مزاج' منشی حبیب اللہ ذکا' قربان علی بیگ سالک' محمد فیاض الدین خاں فیاض' میر احمد علی عصر' حفیظ الدین یاس' لالہ گردھاری لال سرور' لالہ نلی پرشاد نشاط' رائے جادو رائے خلق اور لالہ رتن لال مست وغیرہ ان کے شاگردوں کی فہرست میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ جس طرح مسلمان معتقد تھے اسی طرح ہندو بھی!

باوجود عقیدت مندوں کی کثرت اور دنیوی عظمت کے ان کا عزیز مشغلہ تصنیف و تالیف رہا ہے فارسی اور اُردو کے ضخیم دیوان کے علاوہ' طریق الفیض شرح عوامل۔ شمس النحو۔ شمس الصرف۔ شمع منظومہ صرف۔ رسالہ ناسخ و منسوخ رسالہ عروض و قافیہ۔ مفید الاحکام حلت و حرمت۔ خزانۃ الامثال۔ اصطلاحات اُردو۔ جدول نصف النہار فیض جاری ان کے قابل قدر یادگار ہیں ان میں سے بعض کتب طبع ہوئے اور اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔ شاعری کا چسکہ فطری تھا اور اس فن میں اپنے دور کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ حافظ تاج الدین مشتاق (شاگرد خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ) سے فنِ سخن میں تلمذ تھا۔ فیض کی ذات سے دکن میں شاعری نے خوب رونق پائی ان کی علمی قابلیت شاعری سے بالاتر ہے اور شاعری شعرائے ہم عصر سے بلند تر۔ غزلیں خوب کہتے تھے اخلاق و تصوف کی چاشنی سے ان کا کلام اور بھی زیادہ پرتاثیر ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں!

خاکساروں کو فیض کافی ہے	بستر خاک اور ردائے فلک
رنج و ملال فکر تہی سے ہوا نصیب	آشوب مجھ کو سایۂ بالِ ہما ہوا
خلعت بادشہی خلعتِ عُریانی ہے	سر و سامان مرا بے سر و سامانی ہے

دولتمندوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اُن کے نزدیک نہایت سنگین اخلاقی جُرم ہے ؎

اے گدا بیجا ہے شکوہ اہلِ ثروت سے سمجھے	عرض کرنا مطلبِ دل' موجب آزار تھا

خود دار آدمی اپنی جان اور مال کے مقابلے میں بھی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتے ۔

لحاظِ گردشِ تقدیر ہے عالی دماغوں کو
خیالِ بندشِ دستار ہے جب تک مرا سر ہے

محبت کی اندھیر نگری میں بہت کم پاسِ وضع کا التزام کیا جاتا ہے۔ لیکن فیض اپنی خود داری کو اپنے محبوب کے ہاتھ تک بیچنا نہیں گوارا کرتے ۔

صدقے ہم اس کلام کے اس بول چال کے
لیکن حضور بات کریں منہ سنبھال کے

میں خوشامد کروں خدا نہ کرے
اے بتو آن بان والا ہوں

اپنی روح کو آلائشوں سے پاک کرنے کے بعد انسان خود آپ اپنی پرستش کرنے لگتا ہے۔ فیض اس حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

رہا کرتے تھے پہروں محوِ نظارے میں ہم اپنے
سراپا ہو رہے ہیں اب تو اپنا آپ درپن ہم

فاطرِ ہستی نے انسان کو سراپا جستجو اور ہمہ تن استفہام بنا کر پیدا کیا ہے کبھی وہ عقل کی باریک بیں عینک سے حسنِ مطلق کی کنہ معلوم کرنے کا ناکام مشغلہ اپنے سر لے لیتا ہے اور کبھی حواس باطن کے ذریعہ اپنی اصلیت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ فیض کے دیوان میں بھی اُن کے ذوقِ آگہی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ۔

پھرتا ہوں بھٹکتا ہوا پر نہیں ملتا
ہے وہ نگھرا اس کا مجھے گھر نہیں ملتا

حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

حال سُنیے اُن کے قرب و بُعد کا
جان سے نزدیک تن سے دور ہیں

مردودِ خلائق ہیں کہ مقبولِ خدا ہیں
اب تک نہیں معلوم ہمیں کون ہیں کیا ہیں!

چھان ڈالی جہان کی مٹی
نہ ملا آج تک سراغ اپنا

آیا عدم سے میں جو سوئے گلشنِ وجود
شوقِ نظارۂ چمن ماسوا ہوا

میر تقی میر کی طرح فیض بھی مسئلہ جبر و اختیار پر روشنی ڈالتے ہوئے انسان کو مجبورِ محض قرار دیتے ہیں ۔

کیا کہیں حال اپنا یا معبود ہم عبدیت کے سبب ہیں معذور ہیں
ہے ترقی و تنزل کا یہ کھیل کل تھے مختار آج ہم مجبور ہیں

محبت انسان کے حوصلہ میں بلندی پیدا کر دیتی ہے اور وہ محبوب پر تن، من، دھن لٹا دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتا، مرزا غالب اس منزل سے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں، وارفتگانِ شوق کی فدا کاریاں ملاحظہ ہوں کہ کس خوبی سے ایک ایک لفظ لذتِ فنا کی داد دے رہا ہے ؎

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

فیض کی روح بھی ان ہی جذبات سے معمور نظر آتی ہے ؎

ہے لوٹنے کی جائے نہیں بچ کا محل تو نے مجھے لہو میں ٹٹایا تو کیا ہوا

عشق کی ابتدا میں انسان کو اپنی ذاتی وجاہت کا بھی خیال رہتا ہے، مدارج الفت کے طے کرنے میں یہ اہتمام جائز سہی لیکن پائدار نہیں ہو سکتا، غالب کا ایک شعر ہے ؎ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
فیض بھی اپنے محبوب سے اسی التفات کے طلبگار نظر آتے ہیں اور عجیب پر لطف حسنِ طلب کے ساتھ ؎

قہر کی چشم سے دیکھو دیکھو مجھ پہ ہوگا نہ اثر جادو کا

کلام میں سادگی اور دلکش اندازِ بیان، اچھے شاعر کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیات ہیں۔ اگر انسان کی سمجھ بوجھ اور قوتِ بینائی روح کے تابع نہ ہوتی تو نہیں الفاظ کی ظاہری شان و شوکت اور بے تہوں کی طرح حقائق سے دامن بچا کر ہٹ جاتے ہیں کوئی عذر نہ تھا، آنکھیں روح کی ترجمان ہیں اور دماغ اسکی گہرائیوں کا پیراک، اللہ تعالیٰ کی ان بے بدل نعمتوں کو غلط طریقے پر استعمال میں لانا اپنے آپ پر صریحی ظلم کرنا ہے۔

اپنی گردن سے زندگی کا جوا اتار پھینکنے کے بعد انسان کو رنگ آمیز آسودگی میسر آجاتی ہے۔ زمانہ کی زہرہ گداز سفاکیاں اسکا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں، اب وہ ذاتِ باری کے سوا کسی اور کے سامنے ہاتھ جوڑنے سے بے نیاز ہے۔ شاعر دنیا کی سرد مہریوں سے تھک تھکا کر کسی ویرانے کی طرف نکل پڑتا ہے، یہاں کا ہیبتناک اور سونا منظر اسکے دل کی بربط کو

ایک غمگین مضراب سے چھیڑ دیتا ہے، دنیاوی نقوش اسکی آنکھوں کے آگے دھیمے پڑ جاتے ہیں اور وہ ایک سرمدی خاموشی میں کھو جاتا ہے دھرتی ماں کی آغوش ابدی سکون کو اپنے ساتھ لیے ہوئے اپنے وفا کیش مہمانوں کو تھپک تھپک کر سلاتی نظر آتی ہے اور نیند کے ماتے کروٹ تک نہیں بدلتے اس کیفیت کو چند الفاظ کے آب و رنگ سے اس طرح موزوں کیا گیا ہے ؎

کیا ہی آرام کی جگہ ہے گور — پاؤں پھیلائے یار سوتے ہیں

انسان کی ہستی خلائق میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور بالاتر ہے، اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین فرشتے بھی اسکے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتے خود کائنات کا پیدا کرنے والا اسے اپنا نائب قرار دیتا ہے، اسکی حیران کن ریاضتیں اسکے قدسی الاصل ہونے کی روشن دلیل ہیں لیکن یہ سب کچھ اس گھڑی تک جب تک کہ وہ انسانیت ہی کے قالب میں ملبوس ہو، اسنے اپنے آپ کو بامِ آدمیت سے گرایا اور ساری شیخی کرکری ہو گئی۔

فیض جیسے صوفی منش بزرگ بہت جلد اس راز سے واقف ہو جاتے ہیں چنانچہ کس ماہرانہ انداز میں بنی نوع انسان کی دکھتی رگ پر انگلی دھری ہے ؎

ملتا نہیں ہے، ڈھونڈھے جہاں میں — انسانِ کامل عنقا ہوا ہے
اک بینی و دو گوش نہیں معنیٔ انساں — انسان جسے کہتے ہیں وہ لوگ جدا ہیں
نہ حقارت سے دیکھ انساں کو! — جلوہ گاہ صفات و ذات ہے یہ

زندگی اور زندہ دلی، ایک دوسرے کے لوازم ہیں۔ ایجینیئن یا تخیل سماجی ترقی کا درسِ ابجد ہے، اسکے بغیر دورِ حاضر کی حیرت انگیز ایجادات کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ وہ انسان جو سدا کے سوگوار ہیں دنیا میں کسی کام کے نہیں ہوتے اگر ظرافت جو سگوتیا نہ اور بذلہ ل نہ ہو ہمارے خوابیدہ جذبۂ عمل کو جگا دیتی ہے فیض کے حسب ذیل شعر ذوقِ صحیح کیلئے ایک دلخوش کن گدگدی کا کام دیتے ہیں ؎ زاہدانِ خشک کی ملمع کاریوں کا نقشہ ملاحظہ ہو ؎

معلوم علم غیب ہے اللہ کو حضور — ہم عاشقوں کے سامنے گپ شپ نہ ماریئے
چاٹ احمقوں کو دیجئے حور و قصور کی — شیخی ہمارے آگے نہ جھوٹی بگھاریئے

کہدو یہ زاہدانِ تنزیبت پناہ سے — اک دن خمار خانۂ الفت میں آئیے

سنیں پند گویوں کی کیا واہیاتیں — نہیں یاد ان کو ٹھکانے کی باتیں

کبھی ذکر کوثر، کبھی فکر جنت — کیا کرتے ہیں پینے کھانے کی باتیں

سچ تو یہ ہے کہ جنابِ واعظ — جھوٹی شیخی بگھارتے ہیں

یہ عمّامہ والوں کی میخانہ میں — قضا را سواری اگر جائے گی

کرامت سے رندانِ بےباک کی — گناہوں کی گٹھری اتر جائیگی

نمازیں پڑھیں ہم نے میخانہ میں — گو چند روزے قضا ہو گئے

فیض کے کلام میں دہلوی اسکول کا رنگ زیادہ نمایاں ہے، میر کی طرح ان کے یہاں بھی رطب و یابس، دونوں کی کمی نہیں۔ انسان شکل وصورت میں دید و زیب ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک حسین دل بھی اپنے پہلو میں رکھے اُجلا لباس جلد کی سیاہی کو دور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کسی زبان کی شاعری میں صرف الفاظ کی نزاکت خراش اور موسیقیت ہی پر زور دینا اصل مقصد سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ جس طرح جاندار بے احتیاطی اور لاپروائی کے باعث جان کھو بیٹھتے ہیں یا بسا اوقات عناصر میں ناقابلِ تلافی اختلال پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی بدعنوانیاں اور عامیانہ جذبات کی تخلیق قومی شاعری کے حق میں زہر کا کام دیتی ہے۔

اُردو میں یہ وبا دربار اودھ سے پیدا ہوئی اور اس نے ملک کے چپے چپے کو متاثر کردیا۔ شاعر ہر زمانہ میں اپنے وقت کا ترجمان ہوتا ہے، فیض چونکہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن اور بڑھاپا کٹ گیا، بہت کم اس رجحان کے زیر اثر آسکے لیکن انکا دیوان ایسے اہتمام سے بے نیاز بھی نہیں کہا جاسکتا۔ لفظی اور معنوی خوبیوں کا ایک کثیر انبوہ انکے پانچ سو پچاس صفحے کے ضخیم دیوان میں موجود ہے پھر بھی چار پانچ سو شعر ضرور ایسے نکل آئینگے جو اوصاف صنعت گری سے معمور ہیں اور یہ صفات ان کی بالغ نظری اور فن دانی کو ثابت کرتی ہیں مثلاً!

ہو رہے ہیں بتوں کے دیوانے — کیا نہیں ہوگیا خدا جانے! (صنعتِ تضاد یا طباق)

مبتلا لرزہ کی بیماری میں ہر فوارہ ہے   کس قدر آب ہوا اس باغ کی ناکارہ ہے   (حسن تعلیل)

گلستاں ہے داغوں کا جس کے مرادل   وہ مجھ سے گلستان پڑھا چاہتا ہے   (تجنیس تام)

گیسو عارض دکھارہے ہو   کافر مومن بنا رہے ہو   (لف و نشر مرتب)

عہد پیری میں نہیں داغ جوانی کام کا   صبح کو لے نور ہے جلوہ چراغ شام کا   (لف و نشر غیر مرتب تجنیس تضاد)

بتِ غنچہ لب پھر ہنسا چاہتا ہے   خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے   (مراعات النظیر)

خط سبزہ، دہن غنچہ، ہے قد سرو، ہے رخ گل   عالم ہے سراپا میں ترے، چارچمن کا   (تنسیق الصفات)

رخصت اے صبح وطن وحشت ہوئی!   شام سے پھر تلوے کھجلانے لگے   (صنعت طباق)

پڑے ہیں تین کانٹے ہم نے جب پھینکا ہے پو بارا   کیا ہے تین تیرا، تم نے جب چوسر بچھائی ہے (تنسیق الاعداد)

اظہار کمال کیلئے صنائع، بدائع کا استعمال اعتدال سے ہو تو برا نہیں معلوم ہوتا، فیض نے بھی بڑی حد تک اس بات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور وہ اس دُھن میں شعر کے معنوی حُسن کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ محاورے کا صحیح استعمال زباندانی کی کسوٹی ہے۔ ان سے کلام میں جتنا کچھ بھی لطف پیدا ہو جاتا ہے اُس کا احساس تو صرف ارباب نظر ہی کر سکتے ہیں۔ کسی زبان میں محاوروں کی تشکیل کی پابندی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ ٹکسالی زبان سے تو یہی مراد ہے کہ وہ موجودہ سوسائٹی کی طبیعت کے عین مطابق ہو۔ چند جامع الفاظ کا یہ مرکب معنوی بلاغت کی بہترین مثال ہوا کرتا ہے، اسکے حرکات و سکنات تک معنی خیز ہوتے ہیں جس طرح ریاضی کے مختصر ضابطوں میں بڑے بڑے اعداد کی سمائی ہو جاتی ہے، ادب کی یہ چھوٹی چھوٹی موجیں اپنے دامن میں بڑی بڑی دریاؤں کی وسعت رکھتی ہیں۔ فیض کے کلام میں اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں یہاں نمونتہً چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اس بت کے نہیں خوف سے قرآن بغل میں   پھرتا ہوں دبائے ہوئے ایمان بغل میں

کو نیچے جاسوس کے اُسنے کاٹے   اپنے کوچہ میں جو آتا دیکھا

منہ کی کھائیگا ایک دن اے فیض   آئینہ ان کے منہ چڑھا نہ کرے

بیٹھے ہیں وہ جو آگ بھبوکا بنے ہوئے   میرا بھی جی اُنہی کی شرارت سے جل گیا

کیوں اہلے کھلے اب نہیں پھرتے ہو باغ میں — سرو بھی تو رشک سے مٹی میں گڑ گیا
چھوائے جس نے ناک چنے مجھ کو رات بھر — چھاتی پہ دن دہاڑے مری مونگ دل گیا
غم شیریں میں جو جو کوہکن نے رنج جھیلے ہیں — بہت سے پاپڑ ایسے عاشقی میں ہم نے بیلے ہیں
اونے پونے لو یہ ہے مفلس کا مال — بیچتے ہیں دل سر بازار ہم
بوٹی بوٹی میں اسکی چھل بل ہے — ابھی اٹھتی ہوی وہ کونپل ہے
انوکھی وضع ہے اس نوجواں کی — چلن ٹکسال باہر، چال بانکی
ساتھ ہے گور میں بھی وحشت عشق — بوکھلائے سے کفن میں ہیں ہم
برآمد بام پر وہ ماہ پارا ہو نہیں سکتا — ہمارے بخت کا اونچا ستارا ہو نہیں سکتا
سمجھتا ہوں عصا پیری میں اسکے قد موزوں کو — ضعیفی میں گذارا لے سہارا ہو نہیں سکتا
عہد پیری میں ہوی زائل حرارت عشق کی — دن نکل آیا چراغ اس گھر کا ٹھنڈا ہو گیا

فطرت پرست شاعر کبھی اپنے آپ کو زندگی کی مصنوعی مورتوں پر نثار نہیں کرتا۔ محبوب کی تلاش، اسکی خوشنودی اور اس پر سو جان سے نثار ہو جانا، یہ ہے وہ کنج فراغت جس کو پالینے کے بعد اسکی روح مطمئن ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایسے حیات بخش اسباب اسکے لئے مہیا ہو سکیں تو اسکا ماحول بھیانک نظر آتا ہے، فیض اس رمز سے آگاہ ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

جب سے وہ یار اپنے پاس نہیں — دل ٹھکانے نہیں، حواس نہیں

اس شعر میں نہ فلسفہ ہے اور نہ ریاضی کا کوئی لاینحل مسئلہ، لیکن احساسات کی ایسی بولتی چالتی تصویر نہ تو ایک سائنس داں تیار کر سکتا ہے اور نہ کوئی سیاس، محبوب کی مفارقت میں سنجیدگی اور یکسوئی کا ذکر ہی کیا، انسان اس مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد خود فراموش سا ہو جاتا ہے، طبیعت پر اداسی چھا جاتی ہے، دل رہ رہ کے امنڈ آتا ہے اور ہوش پر سلیتو کی ظاہری چارہ سازیوں کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔

اس قسم کا محاکاتی رنگ فیض کے ہاں جگہ جگہ پایا جاتا ہے جسکی چند مثالیں یہ ہیں ؎

مرض ہو گیا عشق کا آپ کو
اثر کیا کرے گی دوا آپ کو!

ہو رہے ہیں بتوں کے دیوانے
کیا ہمیں ہو گیا خدا جانے!

باہم اربابِ تمنا کو جدا کرتا ہے
فلک تفرقہ انداز یہ کیا کرتا ہے!

کہو مت ہم سے مجنوں کی کہانی
یہ قصہ ہے ہمارے روبرو کا

ان پریزادوں کے کوچہ میں تماشے کی جگہ
جو تماشہ دیکھنے آیا تماشہ ہو گیا

کہوں قبلہ و کعبہ کیا آپ کو
سلامت ہی رکھے خدا آپ کو

کیا کہیں تم سے شبِ غم ہم پہ کیا کیا ہو گیا
دل پگھل کر بہہ گیا، پانی کلیجا ہو گیا

باغ بھولا ہے زمانے کی ہوا بدلی ہے
تو بھی پوشاک بدل، گل نے قبا بدلی ہے

یار نے ہم سے رہ و رسم وفا بدلی ہے
اس پہ کیا دوش زمانہ کی ہوا بدلی ہے

سینہ میں پنہاں دل کیا ہوا ہے
دشمن بغل میں پیدا ہوا ہے

وحدت سے جلوہ کثرت نے پایا
قطرہ سے دریا پیدا ہوا ہے

سوئے عدم ہم جاتے ہیں تنہا
رستہ یہ اپنا دیکھا ہوا ہے

زمانہ نے بہت کم کسی کے ساتھ وفا کی ہے۔ بنے بنائے گھر آن کی آن میں بگڑ کر رہ جاتے ہیں، ابھی پلک تک جھپکنے نہیں پاتی کہ زندگی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اسی پستی کا دوسرا رخ انتہائی عروج ہے۔ مغلیہ سلطنت کے ہیبتناک کھنڈر اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ فتح پور سیکری کی ہنگامہ آرائیاں، اکبر کے نورتن، دربارِ خاص اور دربارِ عام کے زرق برق سب ہی فنا کے سیلاب میں بہہ گئے۔ اور انکی داستانیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں۔ جہاں آباد میں کیسے کیسے اہلِ کمال پیدا ہوئے، فیض آباد اور اودھ کی راجدھانی میں کیا کیا رنگ رلیاں نہ ہوئیں لیکن ان سب کا انجام درسِ عبرت کے سوا اور کچھ نہیں! دیکھنے والے یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن اپنی چھوٹی تمناؤں اور ذاتی فائدے کی خاطر دنیا کے معاشی، سیاسی اور سماجی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ "بقائے اکمل" کا نظریہ نہایت تیزی کے ساتھ انسانی دماغ پر مستولی ہوتا جا رہا ہے۔ ذاتی مفاد

اور جلبِ منفعت ذہنی کاوشوں کا محور بنے ہوئے ہیں۔ فیض نے زمانہ کے ایسے ہی رجحانات کو دیکھ کر آج سے کچھ کم سو برس پہلے شعر و سخن کے پیرایہ میں جو پیشین گوئیاں کی ہیں اسکی صداقت سے ذرا بھی انکار نہیں ہو سکتا ؎

کہیں تم سے کیا ہم زمانے کی باتیں　　کرے ہے ٹھکانے لگانے کی باتیں
مجھے اب کے لوگوں پہ آتا ہے رونا　　جو سنتا ہوں اگلے زمانے کی باتیں
اور ہی رنگ کا زمانہ ہے　　اپنی پرچھائیں سے ڈرا کیجے!

آخری شعر کا ثانی مصرعہ کس قدر بے ساختہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔

فیض زیادہ تر غزل ہی کہتے رہے اُن کے کلام میں دوسری اصنافِ سخن کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن بہت کم پیغمبرِ اکرم خلفائے راشدہ پنجتن پاک اور بزرگانِ دین کی مدح میں متعدد قصیدے لکھے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎　تعظیم مری کیوں نہ کرے خلق خدا کی　　ہوں فیض گدائے درِ سلطانِ مدینہ

اس طرح بعض رباعیوں میں بھی پیشوایانِ دین کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ فارسی اور ریختی گو شعراء نے اس صنف سے زیادہ تر پند و موعظت ہی کا کام لیا ہے اور یہی اثر فیض کی رباعیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ دیوان کے آخر میں دو مخمس اور ایک مثلث بھی درج ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے چند بند نقل کئے جاتے ہیں ؎

مخمس۔

نہ پڑھو تم کبھی حکایتِ عشق　　نہ لکھو تم کبھی حکایتِ عشق
نہ کہو تم کبھی حکایتِ عشق　　نہ سنو تم کبھی حکایتِ عشق
ہے بہت رنج کی تعب کی بات

نہیں اچھی ہے بیت بے موقع　　نہیں موقع کی بیت بے موقع
ہارے بد سے جیت بے موقع　　ہے کہ خوب بات بیت بے موقع
بات اگر ہے تو ہے ادب کی بات

مثلث

واہ واہ، کیا تم نے بات اچھی کہی
عشق میں گر سکھ نہیں، دکھ ہی سہی
کچھ تو ہووے دگی کے واسطے

ہم نے مر مر کر کیا ہے امتحاں
مر گئے پر رشتہ ناتا ہے کہاں
ہیں یہ سارے جیتے جی کیواسطے

خود بخود رزاق پہنچاتا ہے قوت
فیض کیوں کرتا ہے اتنی کاکلوت
ایک دم کی زندگی کیواسطے

تاریخ گوئی بھی شعراء کا ایک لطیف مشغلہ رہا ہے، اس فن میں کمال یہی ہے کہ مادہ تاریخ سے واقعہ کا اظہار ہو غالباً اس فن میں خاص مہارت تھی اُن کے دیوان میں رباعیات سے تاریخی قطعات زیادہ ہیں اور ایک سے ایک بہتر ا

تاریخ تخت نشینی نواب افضل الدولہ بہادر۔ رئیس حیدرآباد دکن فیض ہے نواب افضل الدولہ بہادر
۱۲ ھ ۴ ۳

تاریخ ولادت حضرت غفران مکاں۔

دیا حق نے پسر شاہِ دکن کو
جواں دولت، جواں طالع، جواں سال

لکھا یوں فیض نے سال تولد
ہوا پیدا ہمایوں بخت و اقبال
۱۲ ھ ۸۳

ہوا فرزند جب شاہِ دکن کو
سروراں کو ہوا ایک لخت پیدا

سر اعدا لگے پامال ہونے
ہوا جب زیب تاج و تخت پیدا

کہا اے فیض میں نے سال تاریخ
ہوا لائق، ہمایوں بخت پیدا
۱۲ ھ ۸۲

شاعر کی وطن پرستی ضرب المثل ہو چکی ہے، دیس کی ہوائیں وہ نہایت جوش سے گیت گاتا ہے، اپنے ملک میں بیرونی مفاد کی پرورش اور غیر متعلق اشخاص کی حیاسوز دست درازیاں اسکے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہیں فیض ممالک محروسہ ہی میں پیدا ہوئے، دکن میں تعلیم پائی۔ دکن کے دربار سے تعلق رہا اور دکن ہی کے دامن خاک میں آسودہ ہیں، یہی وجہ ہے جو انکے کلام میں دکن کے بعض محاورے بھی جذبۂ وطن کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد دکن میں ہیں ہم چمن سے اپنے وطن میں ہیں ہم شعرائے ہند کے سب فیض جنھیں کہتے ہیں حیدرآباد دکن خاص وطن ہی انکا
رشکِ فردوس چمن ہے اپنا حیدرآباد وطن ہے اپنا۔ فیض حضرت ابراہیم علیشاہ قدس سرہ کے مرید اور خلیفہ تھے صاحبِ طریقت
بھی تھے ابتک انکا سلسلۂ خلافت جاری ہے اور مزار (بیرون لال دروازہ) زیارت گاہ خلائق ہے۔ ان کو اپنے مرشد سے خاص
عقیدت تھی کہتے ہیں ؎ کیا لکھوں میں وصف ابراہیم کا ہے وہ مراۃ احمد بے میم کا

کیا بتاؤں فیض میں اپنا پتہ ہوں چرن بردار ابراہیم کا

کشف کیونکر ہو نہ جائے حال فرش و عرش کا فیض ابراہیم کے ہم کفش برداروں میں ہیں

ابتک دیوان فیض کے تین مختلف نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے ایک قلمی ہے اور دو مطبوعہ۔ حکیم منور الدین خاں
علاج فیض کے چہیتے شاگرد تھے۔ انہوں نے عماد الدین خاں محمد وصف اور ضیاء الدین احمد خاں فرزندان فیض سے اجازت
حاصل کرکے نواب فیاض الدین خاں مشرف جنگ کے مرتبہ "دیوان فیض کو ۱۳۰۰ھ میں طبع کرایا تھا" دیوان کے سرورق پر اس کی
تاریخ طباعت یہ درج ہے ؎ اسم و تاریخ این مرقع فیض شمع فیض است یا مرقع فیض
۱۳۰۰
اس کا حجم تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات ہے جن میں سوا سو کے قریب صفحات فارسی کلام سے معمور ہیں۔ اسکے ابتدا
میں علاج نے "سراپا در صنعت دیوان" کے عنوان سے اپنی ایک نظم درج کی ہے جسکے صرف دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

گلشن زمین شعر ہے گلہائے فیض کا جو بحر ہے وہ شبنم ہے دریائے فیض کا

وہ گلستاں ہے یہ کہ صبا کا نہیں گذر یہ وہ بہار ہے کہ خزاں کا نہیں عبور

خواجہ جمال الدین نے بھی ایک دیوان بڑی تقطیع اور اوسط درجے کے کاغذ پر مطبع احمدی حیدرآباد دکن میں طبع کرایا
تھا صفحات کی تعداد دو سو چھبیس ہے دیوان پر سنہ طباعت درج نہیں اسلئے ان دونوں میں کسکو تقدیم حاصل ہے واضح نہو سکا
فیض کا انتقال انہتر ۶۹ سال کی عمر میں ۱۳ رجب ۱۲۹۳ھ پنجشنبہ کی شب میں ہوا۔ حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاج نے جو فیض کے ممتاز شاگردوں
میں تھے۔ تاریخ وفات بہت خوب کہی ہے! سنہ سالِ وصالِ او بوحدت باللہ وجود مظہر کل
۱۲۹۳

معظّم الملک نواب بدرالدین خاں تمیز

از

نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب

بی۔اے (عثمانیہ) سابق صدر بزمِ اردو

جامعہ عثمانیہ



(عمل ناخن تمیز)

معظم الملک نواب بدرالدین خاں تمیز

نواب بدرالدین خاں کے والد حیدرآباد کے مشہور صاحب علم وفضل اور سخن فہم امیر کبیر محمد فخرالدین خاں امام جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا تھے جن سے نواب نظام علیخاں بہادر نے ۱۲۱۵ھ میں اپنی صاحبزادی حضرت بشیر النسا بیگم صاحبہ کا عقد کرکے خاندان پائیگاہ کی ہمیشہ کیلئے عزت افزائی کی۔ شمس الامرا بہادر کا ذوق علم وفضل اور ارباب شعر وسخن کی قدر افزائی اس زمانہ میں ضرب المثل تھی۔ ہمارے خاندانی کتب خانے میں متعدد شاعروں کے کلیات اور مجموعے ایسے موجود ہیں جو نواب فخرالدین خاں بہادر کی سرپرستی میں مرتب کئے گئے تھے۔ ان کو خود بھی تصنیف وتالیف کا ذوق تھا ریاضی وہندسہ اور ہیئت وفلکیات انکے خاص موضوع تھے چنانچہ ان علوم سے متعلق انہوں نے بیسیوں کتابیں خود بھی لکھیں اور لکھوائیں جن کا ہم نے اپنے مضمون "نواب شمس الامرا بہادر کے علمی کارنامے" (مطبوعہ سالنامہ بزم اردو) میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

انہوں نے ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔ انکے پانچ فرزند تھے جن میں تیسرے نواب سلطان الدین خاں بشیر الملک (متوفی) سرآسماں جاہ اعظم الامرا کے والد تھے۔ اور چوتھے فرزند نواب بدرالدین خاں رفعت جنگ معظم الدولہ متخلص بہ تمیز تھے جو حیدرآباد میں ۲۵ صفر ۱۲۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔ انکے والد نے خاندان کی روایات کے مطابق انکی ابتدائی تعلیم وتربیت کے لئے خاص اہتمام کیا چنانچہ صغر سنی ہی میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ علوم متداولہ کے ساتھ فنون سپہ گری میں بھی انکو خاصی مہارت حاصل تھی

بچیس سال کی عمر میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے انکو رفعت جنگ معظم الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۲۹ سال کی عمر میں ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ کو انکا عقد نواب علی اللہ خاں حیدر الدولہ کی صاحبزادی سے ہوا اس تقریب میں انکے والد نواب شمس الامرا بہادر نے اپنے شایان شان دعوتیں منعقد کیں۔ اسکے سات سال بعد جشن نوروز ۱۲۵۶ھ میں معظم الملک کا خطاب ملا۔ انکے قدیم کاغذات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ والد کے خطاب "شمس الامرا" کی مناسبت سے ممکن تھا یہ بھی مہر الامراء یا معظم الامرا کے خطاب سے سرفراز ہوتے!

نواب محمد بدرالدین خاں نہایت پابند مذہب تھے چنانچہ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ انہوں نے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ یہ خصوصیت خاندان پائیگاہ میں غالباً سب سے پہلے انہیں کو حاصل ہوئی تھی۔ اگرچہ اس خاندان کے اسلاف کیلئے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں ہونے کی وجہ سے مذہبی جوش اور احکام شرعیہ کی پابندی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔

نواب بدرالدین خاں ۲۴ رمضان ۱۲۶۱ھ کو حج کے لئے روانہ ہوئے تھے ۱۲۶۲ھ میں جب واپس ہوئے تو نواب عمدۃ الملک اور اقتدار الملک دونوں بھائیوں نے آصف نگر تک انکا استقبال کیا۔ حج کے آٹھ سال بعد ربیع الاول ۱۲۶۹ھ میں انکا انتقال ہوا اور خاندانی مقبرہ میں مدفون ہیں۔ افسوس ہے کہ انکی کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ صرف ایک صاحبزادی یادگار تھیں جو عنفوانِ شباب میں انتقال کر گئیں۔

نواب بدرالدین خاں اپنے خاندان کے اکثر افراد کی طرح علم دوست اور علم پرور بزرگ تھے شعر و سخن سے بھی خاص ذوق تھا تمیز تخلص کرتے تھے انکا مکمل کلیات موجود ہے جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں۔

تمیز کا ذوق سخن انکے والد نواب فخرالدین خاں امیر کبیر کی سخن سنجی اور ان کے درباری شعراء کی صحبت کا نتیجہ تھی انکے دربار سے ملک اور بیرون ملک کے اکثر شاعر وابستہ تھے۔ نواب آصف جاہ کے بعد حیدرآباد میں یہی ایک قدردان سخن ہستی تھی جسکی امداد و سرپرستی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ چنانچہ ہمارے خاندانی کتب خانہ میں کئی شاعروں کے ایسے دواوین و کلیات اور مثنویاں موجود ہیں جن کو امیر کبیر نے چھپوایا تھا یا جو ان کے نام پر معنون ہیں یا انکی فرمائش پر مرتب کی گئی ہیں۔ ان شاعروں میں سے بعض کو امیر کبیر پچیس پچیس روپے یومیہ دیا کرتے تھے چنانچہ ایمان۔ قیس۔ فیض۔ آفاق۔ شہرت۔ ہمام وغیرہ اسی دربار کے متوسلین تھے۔ امیر کبیر کے بعد مہاراجہ چندو لال نے بھی شاعروں کی قدردانی کی ہے۔

نواب بدرالدین خاں کو اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کا چسکا تھا چنانچہ وہ خود لکھنے کے علاوہ اپنے والد کے متوسل شعرا سے فرمائش بھی کیا کرتے تھے کہ ان کے مطالعہ کے لئے اپنے کلام کے خاص خاص حصے مرتب کر دیں چنانچہ بعض کتابیں ایسی موجود ہیں جو ان کی فرمائش پر مرتب ہوئی تھیں۔ انہوں نے انیس ۱۹ سال کی عمر میں آفاق دہلوی سے ریختی میں ایک دیوان مرتب کرایا تھا جس کا قلمی نسخہ ہمارے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے جس کے آخر میں لکھا ہے کہ:-

"الحمد للہ والمنۃ کہ دیوان ریختیات تو تصنیف حسب فرمائش محمد رفیع الدین خاں صاحب و محمد بدر الدین خاں صاحب الخاطب یعنی صاحبزادہ صاحبان والا قدر نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر .... بتاریخ ہفدہم شہر رجب المرجب ۱۲۳۹ھ روز جمعہ بوقت نماز ظہر و ساعت سعید و آوان حمید بخیر و خوبی باتمام رسید"

ذوق شاعری کے علاوہ ان کو تالیف و تصنیف سے بھی دلچسپی تھی جن میں سے ایک "تمیز اللسان" فارسی کا رسالہ ہے جس کے موضوع اور ترتیب کے متعلق خود مصنف ہی کے دیباچہ سے معلومات حاصل ہوتی ہیں جس کا اقتباس یہ ہے۔

"اما بعد می گوید ذرۂ کمترین محمد بدر الدین المتخلص بہ تمیز ایں رسالہ مشتمل بر لغات عربی و فارسی و ترکی و ہندی است برائے مطالعہ طالبان اختلاف السنہ در حیز تحریر برآورد "تمیز اللسان" نام نہاد و بر یک مقدمہ و ہشت باب و یک خاتمہ ترتیب دادم۔ مقدمہ در بیان چگونگی زبان ترکی۔ باب اول در بیان مصادر۔ باب دوم در بیان ماضی۔ باب سوم در بیان مضارع۔ باب چہارم در بیان اسم فاعل۔ باب پنجم در بیان امر۔ باب ششم در بیان نہی۔ باب ہفتم در بیان نفی۔ باب ہشتم در بیان علامت جمع۔ و خاتمہ در بیان ضمائر و بہائم و دواب و طیور و وحوش و حشرات وغیرہا۔

انکی دوسری کتاب نہایت اہم ہے۔ اس کا تاریخی نام "وقائع معظمہ" ہے۔ یہ ۱۲۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس کتاب میں خاندان آصفیہ کے شجرے نہایت تلاش اور صحت سے درج کیے ہیں اور ساتھ ہی خاص خاص افراد خاندان کے مختصر سے حالات زندگی اور خطابات کی تفصیل وغیرہ بھی لکھی ہے۔

یہ ایک ایسی اہم کتاب ہے جس کی مدد کے بغیر خاندان آصفیہ کی کوئی تاریخ مکمل اور مستند نہیں ہو سکتی۔ اس میں مختلف خطابوں اور ناموں کو اس طرح واضح کر دیا ہے کہ آئندہ حیدرآباد کے مورخ خطابوں کی یکسانیت کی وجہ سے ایک شخصیت سے خلط ملط نہ کر سکیں گے۔ انہوں نے بہت سی ایسی باتیں قلمبند کر دی ہیں جو ہر شخص کی دسترس اور معلومات سے باہر ہیں انہوں نے اسکی ترتیب میں اپنے والد محمد فخر الدین خاں اور بھائی نواب رفیع الدین خاں کی وسعت معلومات اور تاریخ دانی سے یقیناً فائدہ اٹھایا ہے ان کے علاوہ حافظ میر شمس الدین فیضی اور میر عبد اللطیف حکیم (جو اسی پائیگاہ سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی تحریک یا ایما پر تمیز نے اس اہم کام کو شروع کیا تھا) نے بھی اس کام میں انکی مدد کی ہو گی کیونکہ یہ ایک ایسا بڑا اور اہم کام تھا جس کی

تکمیل ایک شخص سے ناممکن تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"اما بعد ضعیف العباد محمد بدر الدین خاں بہادر المخاطب معظم الدولہ خلف امیر کبیر شمس الامرا بہادر دام ظلہ و اقبالہ بہ تحریر این سطور کہ در ذکر حسب و نسب مغفرت مآب آصف جاہ اول و اولادش عشائر و اقارب نواب مذکور بہ سعی بسیار و تلاش بیشمار آنچہ کہ بدریافت رسید بہ پاس خاطر مولوی میر حافظ شمس الدین فیض و میر عبد اللطیف حکیم پرداختم۔ در عہد امنیت مہد آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہ و زاد عمرہ و اجلالہ کہ بہ دو واسطہ نبیرہ مغفرت مآب اند در ماہ ربیع الاول سنہ ۱۲۵۲ھ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و دو ہجری بہ یک اصل و سہ فرع ترتیب داد موسوم بہ شجرۂ آصفیہ و دیگر نام این رسالہ کہ مادۂ تاریخ است وقائع معظمہ"۔

جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہے مصنف نے کتاب کو ایک اصل اور سہ فروع پر مرتب کیا ہے۔ اصل میں حضرت خواجہ شیخ عالم بہادر (جد اعلیٰ خاندان آصفجاہی) کے حالات اور اُن کے اجداد کے نسب نامے شامل کئے گئے ہیں۔ ۱

حضرت خواجہ شیخ عالم سمرقند کے مشائخ کبار سے تھے، اور حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی علیہ الرحمہ سے ارادت رکھتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے "خواجہ بہاؤ الدین" اور "خواجہ عابد" اور ایک صاحبزادی "فاطمہ بیگم" تھیں۔ شجرہ کے "سہ فروع" انہی تینوں حضرات سے متعلق ہیں۔ فرع اوّل میں فاطمہ بیگم صاحبہ کی اولاد کی تفصیل ہے۔

فرع دوم میں خواجہ بہاؤ الدین کی آل و اولاد کا مفصل نسب نامہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ بہاؤ الدین کے دو لڑکے تھے، جن میں بڑے "محمد امین خاں" اور چھوٹے "محمد عابت خاں" تھے۔

محمد امین خاں سنہ ۱۱ھ میں سمرقند سے ہندوستان آئے، منصب و خطاب سے ممتاز ہوئے، اور اپنے چچیرے بھائی "خان فیروز جنگ" آصف جاہ بہادر کے والد کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۱ھ میں حضرت خلد مکان عالمگیر نے اُن کو "صدارت کل" کی خدمت اور "چین بہادر" کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ سنہ ۱۱۲۳ھ میں صوبہ دار مراد آباد مقرر ہوئے، اور سنہ ۱۱۲۶ھ میں خطاب "اعتماد الدولہ نصرت جنگ" سے افتخار پایا۔ اور محمد شاہی دور میں وزیر الملک کے خطاب، اور خدمت وزارت سے ممتاز ہوئے۔ لیکن چار ماہ بعد ہی وفات پائی۔ ۲

ابن خاں کے ایک صاحبزادے "محمد فاضل" تھے۔ محمد شاہ نے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے وزارت سے کنارہ کش ہونے کے بعد انہی کو اعتماد الدولہ میر قمر الدین حسین خلیج خاں بہادر نصرت جنگ (ثانی) کے خطابات جلیلہ اور خدمت وزارت سے انکی عزت افزائی کی یہ اپنے بخت کی یاوری و خوش نصیبی کے باعث احمد شاہ بادشاہ کے عہد تک تقریباً (۲۵) سال مہمات وزارت کو سرانجام کرتے رہے۔ بالآخر "احمد شاہ درانی" کے مقابلہ و معرکہ میں توپ کے گولہ سے ہلاک ہوئے۔

خواجہ بہاؤ الدین کے چھوٹے صاحبزادے محمد رعایت خاں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے خواجہ عابد کی لڑکی یعنی اپنی چچیری بہن سے شادی کی۔ فرخ سیر بادشاہ نے انہیں "استقامت جنگ" کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ اور ۱۱۳۲ھ میں خود حضرت آصف جاہ اول نے بھی ظہیر الدولہ کا خطاب سرفراز فرمایا تھا۔ مبارز خاں صوبہ دار حیدرآباد کی لڑائی میں حضرت مغفرت مآب کی معیت میں ۱۱۳۶ھ میں لڑتے ہوئے جان دی۔

خواجہ شیخ عالم کے بڑے لڑکے خواجہ بہاؤ الدین کی اولاد کے ذکر کے بعد ان کے چھوٹے لڑکے یعنی حضرت "خواجہ عابد قلیچ خاں" کی اولاد کے متعلق اس کتاب میں تفصیل سے حال مندرج ہے۔

خواجہ عابد ۱۰۶۵ھ میں ہندوستان تشریف لائے، اور شاہجہاں کی ملازمت اختیار کی ۱۰۷۰ھ میں خاندانی خدمت "صدارت کل" سے افتخار پایا ۱۰۸۱ھ میں صوبہ دار ملتان مقرر فرمائے گئے۔ ۱۰۹۰ھ میں "قلیچ خاں" کے خطاب سے سرفراز ہوئے اسکے دو سال بعد ہی یعنی ۱۰۹۲ھ میں صوبہ دار "ظفرآباد بیدر" بنائے گئے۔ تقریباً پانچ چھ سال بعد ۱۰۹۷ھ میں شہنشاہ عالمگیر کے ہمراہ محاصرۂ قلعہ گولکنڈہ میں شہید ہوئے۔ ان کو تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں کے حسب ذیل نام ہیں۔

۱۔ میر شہاب الدین غازی الدین خاں فیروز جنگ ۔ ۲۔ میر حامد خاں صلابت جنگ معز الدولہ

۳۔ میر عبد الرحیم خاں قسور جنگ نصیر الدولہ۔

میر شہاب الدین غازی الدین خاں فیروز جنگ کے حالات اکثر تاریخوں میں تفصیل سے ملتے ہیں، اسلئے یہاں ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تولد ہوئیں۔

صاحبزادہ کا نام میر قمر الدین تھا جو بعد میں چین قلیچ خاں بہادر نظام الملک فتح جنگ آصف جاہ اول کے خطابات سے

سرفراز ہوئے اور دکن کی عظیم الشان سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔

خواجہ شہاب الدین کی لڑکیوں کے نام حسب ذیل تھے۔

۱۔ احمدی بیگم جو سعد اللہ خاں وزیر اعظم کے پوتے عابد اللہ خاں سے بیاہی گئیں۔ ۲۔ ہمشیرہ بیگم یہ مبارز خاں صوبہ دار حیدرآباد کے فرزند عماد الملک حامد اللہ خاں سے اُن کے والد کے قتل کے بعد بیاہی گئیں۔

حضرت خواجہ عابد کے دوسرے صاحبزادے میر حامد خاں صلابت جنگ معز الدولہ تھے۔ اُن کو محمد شاہ بادشاہ نے "خانِ دوران" کا خطاب بھی مرحمت فرمایا تھا۔ ۱۱۳۴ھ میں اپنے بھتیجے (حضرت آصف جاہ اول) کے ہمراہ دکن آئے اور حیدرآباد کی صوبہ داری پر مقرر ہوئے۔ ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا۔ اور حضرت خواجہ بندہ نواز علیہ الرحمہ کی درگاہ شریف کے باہر دفن ہوئے۔

حضرت خواجہ عابد کے تیسرے لڑکے عبد الرحیم خاں تھے جو ۱۱۲۵ھ میں نصرت جنگ اور ۱۱۳۶ھ میں نصیر الدولہ کے خطاب اور برہانپور کی صوبہ داری سے سرفراز ہوئے۔ یہیں ۱۱۶۵ھ میں انتقال کیا۔

مذکور الصدر اصحاب خاندانِ آصف جاہی کے اہم ارکین ہیں ان کی آل اولاد کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ انمیں اکثر بزرگوں کے حالات عام تاریخوں میں دستیاب نہیں ہوتے۔ اسی لئے یہاں مختصر سے واقعات لکھ دیے گئے ہیں، تاکہ معلومات میں اضافہ کے ساتھ "شجرۂ آصفیہ" کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

ان بزرگوں، اور ان کی آل و اولاد کے بعد حضرت آصف جاہ اول کی حسب ذیل اولاد کا تفصیل کے ساتھ شجرہ درج کیا گیا ہے۔

۱۔ میر محمد پناہ امیر الامراء غازی الدین خاں فیروز جنگ (ثانی) برادر حقیقی ناصر جنگ جن کو نواب شہید کے انتقال کے بعد صوبہ داری دکن کے فرمان کے ساتھ خطاب نظام الملک بھی ملا تھا۔ ۲۔ نواب میر احمد خاں ناصر جنگ نظام الدولہ۔ ۳۔ میر محمد خاں صلابت جنگ امیر الممالک آصف الدولہ۔ ۴۔ میر نظام علیخاں بہادر اسد جنگ۔ ۵۔ میر محمد شریف خاں شجاع الملک شجاع الدولہ بسالت جنگ جو ۱۱۷۱ھ میں نواب صلابت جنگ بہادر کے ولی عہد بھی مقرر ہوئے تھے۔ ۶۔ میر مغل علیخاں ہمایوں جاہ ناصر الملک سیف قلیج خاں بہادر ہمایوں جنگ۔

لڑکیوں میں :— ۱۔ پہلی صاحبزادی خیر النساء بیگم تھیں، جو متوسل خاں رستم جنگ بن حفیظ اللہ خاں بن سعد اللہ خاں (وزیر اعظم شاہ جہاں بادشاہ) سے بیاہی گئیں۔ ان ہی کے بطن سے ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ پیدا ہوئے۔ ۲۔ دوسری بادشاہ بیگم تھیں جو نواب ناصر جنگ کی حقیقی ہمشیرہ تھیں۔ ۳۔ صاحبزادی مکرمہ بانو بیگم المعروف کالی بیگم۔ ۴۔ چوتھی نجستہ بانو بیگم عرف خاں بہادر صاحبہ۔ ۵۔ پانچویں حسنہ بیگم۔ ۶۔ اور چھٹی مہ بانو بیگم تھیں۔

نواب بدر الدین خاں تمیز نے اس تالیف میں اس امر کا بھی التزام کیا ہے کہ سنہ ہجری کے ساتھ ساتھ شاہان مغلیہ کے سنہ جلوس بھی مطابقت کیلئے درج کر دئے ہیں۔ چونکہ تمیز کی اس اہم کتاب سے بہت کم اصحاب واقف ہیں، اسلئے یہاں اسکی نسبت مختصر سی معلومات درج کر دی گئی ہیں۔

نواب بدر الدین خاں خود لکھنے کے علاوہ دوسرے مصنفین و مولفین کی بھی قدر افزائی کیا کرتے تھے چنانچہ بعض کتابیں انکے نام پر معنون بھی کی گئی ہیں جن میں سے ایک "انوار بدریہ" ہے جسکے دیباچہ میں لکھا ہے :—

"جاننا چاہیے کہ وہ نسخہ جو اقلیدس میں مذکور ہیں اگرچہ کثرت فوائد میں بہتر از شکل عروس ہیں لیکن معانی میں باوجود نزاکت ایسے قلیل الالفاظ کہ جن کا سمجھنا مبتدیوں کو نہایت دشوار بلکہ منتہیوں کو بھی اسلئے ان کو اس ذرۂ بے مقدار شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس مع اشکال عددی ترجمہ کیا تا فوائد سے ان کے خاص و عام متمتع ہوں اور موسوم بہ انوار بدریہ کر کے بطریق تحفہ خدمت بابرکت میں نواب معلے القاب ثریا رفعت و گردوں قباب معظم الملک معظم الدولہ محمد بدر الدین خاں بہادر ..... کے گذرانا۔ باللہ التوفیق و بہ نستعین"

تصنیف و تالیف کے تذکرہ کے بعد ہم نواب بدر الدین خاں تمیز کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ افسوس کہ ان کے کلام یا تصنیفات یا دیگر قلمی تحریرات (جو ہمارے کتب خانہ میں موجود ہیں) سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ انکو اپنے والد کے درباری شعراء میں کس سے تلمذ حاصل تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر میر شمس الدین محمد فیض سے انکے خاص روابط تھے چنانچہ مشہور ہے کہ فیض خطاطی کے بڑے ماہر تھے اور ہمارے خاندانی کتب خانہ میں نواب بدر الدین خاں کیلئے اتارے ہوئے خطاطی کے مرقعے موجود ہیں جن میں سے ایک اختتام پر فیض کا ایک قطعہ تاریخ درج ہے جو ممکن ہے تو قطعہ تاریخ

اپنے قلم سے لکھا ہو کیونکہ وہ اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے۔ اس قطعہ کی تصویر اس مضمون کے ساتھ شامل ہے۔

جب خط ناخن میں تمیز نیض کے شاگرد تھے تو کیا عجب ہے شعر و سخن میں بھی انہیں سے مشورہ کرتے ہوں۔ انکے کلام میں اگرچہ بعض جگہ شخصی اشارے بھی موجود ہیں مثلاً اپنے اور اپنے خاندان کے مرشد مولانا شاہ رفیع الدین قندھاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

تب سے اسکے اور بھی رتبہ ہوا آئین کا — جب سے بدرالدین ہوا بندہ رفیع الدین کا
یک نگاہ لطف سے جسکے ہے عالم فیض یاب — ہے تصور دلکو اس کی چشم فیض آگین کا
دو جہاں کی بادشاہی ہم کو حاصل ہوگئی — منہ سے نکلا اس کے ایسا حرف اک تسکین کا
دین و دنیا کے ہیں مالک پیر و مرشد اے تمیز — حامیٔ روز جزا ہے کون اس مسکین کا

ایک اور جگہ اس امر کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ انکے والد کے پیر و مرشد ہیں ممکن ہے اس وقت تک خود تمیز ان کے مرید نہ ہوئے ہوں چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

قبلہ و کعبہ کے میرے پیر و مرشد جو کہ ہیں — ہووے کیا اوصاف مجھ سے اس رفیع الشان کا

اپنے مرشد کے ذکر کے علاوہ انہوں نے خاندانی سلسلہ کے بعض بزرگوں کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

یہ عرض ہے تمیز کی یا حضرت عمر — دولت کا ہو خیال نہ کچھ جاہ کا خیال
ہر دم بہ تندرستی و صحت تمام عمر — دل کو مرے بندھا رہے اللہ کا خیال
ہے لقب جس کا شکر گنج اسم ہے شیخ فرید — دم بدم ورد زباں ہے نام اس سلطان کا

انکے علاوہ تمیز نے اپنے ہم عصر شعرا مثلاً انشا اور ہمدم وغیرہ کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام شخصی اشاروں کے باوجود اپنے استاد کا ذکر تعجب ہے کہیں نہیں کیا۔ ایک شعر البتہ ایسا ملتا ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں ؎



(عمل ناخن تمیز)



(عمل ناخن تدیز)

کسی کا شعر میرے شعر سے بہتر نہ ہووے گا ۔۔۔ خدا کا فیض ہے جاری میں یہ دعویٰ کروں کیونکر

"فیض جاری" حضرت فیض کے ایک رسالہ کا بھی نام ہے جس کو نواب شمس الامرا بہادر نے خاص اہتمام سے چھپوایا تھا۔

تمیز کے کلام میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور ترجیع بند بھی موجود ہیں۔ اردو شعراء کے عام دواوین کے برخلاف دیوان تمیز میں اکثر غزلوں پر یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ کس شاعر کی غزل کے جواب میں یا کس مشاعرہ کی طرح پر لکھی گئی ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے یہ دیوان بہت دلچسپ اور تاریخی اشارات کی بنا پر نہایت مفید بن گیا ہے۔

تمیز نے ان تمام شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں جو انکے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے مثلاً میر، سودا، انشاء، ناسخ، نصیر اور شاہ سراج وغیرہ۔ اس طرح ہم عصروں مثلاً ذوق، شاداں، ہمدم، آفاق، طپش وغیرہ کی غزلوں کے بھی جواب لکھے ہیں ایک غزل پر لکھا ہے "درجواب مرزا ابوظفر ولیعہد فرزند کلاں اکبر بادشاہ از دہلی آمدہ" اس غزل کا مطلع ہے

باغ میں کوئی بھی بلبل نہ گل اس رنگ کھلا ۔۔۔ اسکے ہنسنے سے مرا غنچۂ دل تنگ کھلا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کی اس زمین کی غزل انکے ولیعہدی کے زمانے میں کہی گئی تھی۔ مرزا سلیمان شکوہ کی ایک غزل کا بھی جواب لکھا ہے جس کا ایک مصرع یہ ہے۔ "سو بار گھر میں آیا سو بار گھر سے نکلا"۔

تمیز نے میر کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں جو بالکل میر ہی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً۔

گزیست اس طرح کی بس از مرگ ہر میا ۔۔۔ تا سب کہیں یہ روز کوئی نیک مرد تھا

گزار جبکہ چمن میں وہ نونہال کیا ۔۔۔ خرام ناز سے ہر گل کو پائمال کیا

دہان یار کی کی ہمسری جو غنچہ نے ۔۔۔ صبا نے مار طمانچے منہ اسکا لال کیا

کبھو نہ ایک بھی اسکے اثر کیا دل پر ۔۔۔ اگرچہ ہجر میں نالے ہزار سال کیا

جتنا کہوں میں اتنا اسے کہہ پیام پر ۔۔۔ اپنی طرف سے اور نہ اک دو سخن ملا

تمیز کی شاعری کا محور غزل گوئی ہے، دیگر اصناف سخن مثلاً قصیدہ و رباعی کی طرف انکی طبیعت کم مائل رہی ہے اکثر غزلیں سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں باوجود قافیہ اور ردیف کی دشواریوں کے بہترین شعر کہے ہیں جنکے چند نمونے ذیل میں

درج کئے جاتے ہیں ۔

شب اس نے ہات سے میرے جو یک ایاغ لیا ۔۔۔ تو ہم نشین کہوں کیا بصد دماغ لیا
کمر کا اسکی سرِ مو نشاں نہ ہات آیا ۔۔۔ بہت سا چشم تصور نے گو سراغ لیا
قاتل نے ابروؤں سے لیا کام تیغ کا ۔۔۔ بدنام مفت ہی میں ہوا نام تیغ کا
کون کرتا ہے یہاں عیش و طرب کا چرچا ۔۔۔ بزمِ عشاق میں ہے رنج و تعب کا چرچا
بے سلیقہ نظر آیا جسے دیکھا ہم نے ۔۔۔ اٹھ گیا محفل عالم سے ادب کا چرچا
بیمار تری آنکھیں جیسی کہ ازل سے ہیں ۔۔۔ ایسا ہی میں ان کا ہوں بیمار ہمیشہ کا
جل جانے کا کچھ میرے اندیشہ نہ کر ہرگز ۔۔۔ لا جام کہ ہوں ساقی میخوار ہمیشہ کا
دل لیکے تمیز اس نے جو ترک کیا ملنا ۔۔۔ میں جانتا ہوں ہے وہ عیار ہمیشہ کا
ستاتی ہے مرے دل کو بتوں کی جا و درد وکر ۔۔۔ شب فرقت میں نکلے ہے جگر سے آہ رہ رہ کر
تمیز ان روزوں کیا تو نے لگایا ہے کہیں دل کو ۔۔۔ لبوں پر آئے ہے کیوں نالہ جانکاہ رہ رہ کر
شعلۂ غم نے دیا جی کو بہ عطیس شمع نمط ۔۔۔ آہ پر دود ہے ہمرا نفس شمع نمط
آنکھوں میں تری سرمہ کی تحریر نہیں تیر ۔۔۔ قتل دل عاشق کو یہ شمشیر ہے بہتر
اے چارہ گرو درد ہے کچھ اور دوا کچھ ۔۔۔ تقدیر پہ رکھو یہی تدبیر ہے بہتر

فارسی مصادر اور ترکیبوں کی جا و بیجا آمیزش سے اس دور کے قابل شعرا احتراز کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ وہ زبان اردو پر کافی قدرت رکھتے تھے۔ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے کسی دوسری زبان کا سہارا نہیں ڈھونڈتے تھے تمیز بھی اس اصول کے پابند تھے انکے دیوان میں ایک شعر ہے جس میں لفظ سوختن نظم ہوا ہے اور لطف سے خالی نہیں ہے۔

آتش عشق لگی سر سے تمیز اپنے مگر ۔۔۔ سوختن کی ابھی جی کو ہے ہوس شمع نمط

اگرچہ تمیز کی طبیعت سنگلاخ زمینوں کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتی ہے مگر جہاں جہاں مترنم بحروں میں

طبع آزمائی کی ہے محاورات اور روزمرہ کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ روانی اور سلاست بیان کی چند مثالیں یہ ہیں ؎

تھا حسن ماہِ کنعاں مشہور خلق لیکن ۔۔۔ عالم ہی اور کچھ ہے اے رشکِ حور تیرا
اللہ رے لطافت اللہ رے نزاکت ۔۔۔ پھبتا ہے ہر طرح سے تجھ کو غرور تیرا

بتوں کے کوچہ کی کچھ بات ہی نرالی ہے ۔۔۔ زمیں ہے واں کی نئی اور آسمان نیا

صنم صبح شکر خدا آن نکلا ۔۔۔ جو کچھ اپنے جی میں تھا ارمان نکلا
سمجھتے تھے ہم تو بہت دل کو دانا ۔۔۔ تمیز آہ بیکس یہ نادان نکلا

اس چشم مست کو ہم میخانہ جانتے ہیں ۔۔۔ اور گردشِ نگہ کو پیمانہ جانتے ہیں
ہم آشنائیوں کا دم مارتے ہیں جنکی ۔۔۔ وہ آجتک بھی ہم کو بیگانہ جانتے ہیں

اپنے عاشق کے دل کو تھام تو لو ۔۔۔ اسکے ہاتوں سے کوئی جام تو لو
قتل کو میرے کہتے ہو منہ سے ۔۔۔ ہاتھ میں تیغ بے نیام تو لو
بے حیا غیر کھائیگا دشنام ۔۔۔ تم بھلا اب سے میرا نام تو لو

ان کے کلام میں نہ تو تعقید لفظی ہے نہ تعقید معنوی چھوٹے چھوٹے جملے مصرعوں میں اس حسن سے لائے ہیں جس سے شعر میں معنوی خوبیوں کے ساتھ موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو بغیر پختہ مشقی کے حاصل نہیں ہو سکتی ؎

خوبان دہر کو میں جب خوب دیکھتا ہوں ۔۔۔ محبوب کو میں اپنے محبوب دیکھتا ہوں

مجھے قتل کیں لے سب انکی آنکھیں ۔۔۔ غضب ہیں غضب ہیں غضب انکی آنکھیں
اڑا لے گئیں دیکھتے دیکھتے دل ۔۔۔ عجب وہ نگاہیں عجب انکی آنکھیں

۲ شعراء نے اصناف سخن سے مختلف عنوانات کا کام لیا ہے۔ مسدس مرثیہ کے لئے، مثنوی مسلسل واقعات اظہار کیلئے رباعی حکمت و تصوف کیلئے۔ مگر غزل میں جامعیت ہے جس کا ہر شعر ایک خاص خیال کا حامل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ غزل ہی مرغوب خاص و عام چلی آتی ہے۔ جتنا رواج غزل نے پایا اتنی ہی اس میں مشکلیں بھی ہیں سب سے پہلے اسکی ضرورت ہے کہ

ہر شعر میں تغزل کا رنگ رہے اور مضامین کی نوعیت سے الفاظ کا انتخاب ہو اور جب تک محاورات کے برمحل استعمال پر قدرت نہ ہو اشعار میں تغزل کا رنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تمیز کے دیوان میں حسن و عشق کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں اور زبان کی سلاست محاورات کی برجستگی کی وجہ سے بہت پر لطف اور پرکیف نظر آتے ہیں ؎

وہ لیکے دل کو جو خواہانِ جاں ہوئے تمیز — گناہ ایسا تو اس نے کسی سے نہ ہوا

موے کے بعد بھی گریاں غم فراق میں ہیں — رواں کب آب ہمارے فرار سے نہ ہوا

ہمارے سینہ پہ داغ پہ نگاہ کرو — نہ جاؤ سیر کو تم سوئے گلستاں ہر روز

وفا کا لفظ ہوا کم جفا کی مشق بہت — وفا جفا کا مرے آگے جب حساب ہوا

ہم سے رکھتا ہے وہ حجاب بہت — کیوں نہ دیجے اسے شراب بہت

دیکھیے جی پہ کیا گذر جائے — دل لگا کرنے اضطراب بہت

آیا نہ آج وہ تو نکل جاؤں گا میں کل — آتی ہے دم بدم یہ صدا اپنے جی سے آپ

کرتے نہیں ہو ہم سے ملاقات کیا سبب — غیروں کے حال پر ہے عنایات کیا سبب

نکالا اس بت قاتل نے امتحان نیا — کہ مارا جائے ہے ہر روز یک جوان نیا

ادھر خنجر کو قاتل دیکھتا تھا — ادھر سینے میں میں دل دیکھتا تھا

کلام میں حسن اور ندرت پیدا کرنے کی دھن میں شعرائے ہند صنائع بدائع، ایہام اور تشبیہ و استعارہ کی طرف متوجہ رہے ہیں خصوصاً لکھنوی سکول نے اس کو زیادہ فروغ دیا اب کچھ عرصے سے شاعری کی ہوا کا رخ بدلتا جا رہا ہے اور بہت سی صنعتیں تقویم پارینہ ہو گئی ہیں۔ تعجب ہے تمیز کے دیوان میں صنعت گری کی مثالیں نہیں ملتیں اگر کچھ ہیں بھی تو اغلاق کی وجہ سے بجائے عیب ہنر میں داخل ہو گئی ہیں ؎

دشت میں قیس رہا کوہ میں فرہاد رہا — میں بگولے کی طرح عشق میں برباد رہا

جامہ زیبی نے تری گھیر رکھا ہے عالم — دو دو دامن سے ہوئی گردش دوراں پیدا

اس میں اسیر جس کا ہوا دل ہوا قتیل | جو ہر نہیں، بچھا ہے عجب دام تیغ کا
نہ ہوا ساتھ ترے مجھ کو میسّر سونا | اتنا کھوٹا نہ تجھے سیم بدن جانا تھا

ابتدا میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ "رباعی" مسائل حکمت و تصوف کے لئے وضع ہوئی ہے۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ بعض شعراء غزل میں بھی ایسے مضامین بیان کرتے رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں وہی شعراء کامیاب رہے ہیں جو خانقاہ نشین تھے یا صاحب حال!!

تمیز کے سوانح حیات اور ان کے حالات گرد و پیش سے واقف ہونے کے بعد ان کے دیوان سے اس قسم کے اشعار دستیاب ہونے کی کیونکر توقع ہو سکتی ہے، چند شعر جو ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں اس سے اور کچھ نہیں تو ان کا مذہبی جوش، عقاید، استغنا اور خود اعتمادی کا پتہ چلتا ہے۔

نہیں اختیار جہاں کچھ اے غافل | سب پتے ہی ہے دم قدم کا بھروسا
بے ثباتی جہاں دیکھ لگا دل کہنے | میں نے دنیا کو غلط اپنا وطن جانا تھا
یاں جلوہ یار کا ہے عیاں پھر عیاں نہیں | دیکھو تو ہر نظر سے نہاں پھر نہاں نہیں

اس سلسلہ میں زیادہ شعر نہیں ملے، نہ تو کوئی ایک آدھ شعر ایسا بے معنی ملا، جس سے تصوف کے عنوان میں اضافہ ہو سکتا!

تمیز کی شاعری کی اہم خصوصیت عاشقانہ رنگ ہے تمام شاعری شعریت اور رنگ تغزل میں ڈوبی ہوئی اور حشو و زوائد سے پاک ہے، کہیں کہیں اس دور کے مروجہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو آج متروک ہیں جس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ؎

دو لنے ہیں وہی اب اس پری کے | میں جن جن کو کہ عاقل دیکھتا تھا
جس شخص نے پایا ہو مزہ خلوت دل کا | کب بھائے اسے دہر کی محفل کا تماشا
جن دنوں دل کسو پہ عاشق تھا | کیا زمانہ مرے موافق تھا

یارب ہمارے انکے صفائی کبھو تو ہو
غیروں سے ہے جو صلح لڑائی کبھو تو ہو

نالۂ آتش فشاں پھر لب تلک آنے لگا
شعلۂ غم تن بدن میں آگ بھڑکانے لگا

نہیں تجھ میں کچھ بوئے الفت ذری
کر اے بے مروت مروت ذری

ٹک دیدۂ انصاف سے قمری تو نظر کر
سرو اچھا ہے کہ یا وہ بت طناز ہے اچھا

نشہ بن کچھ نہیں ہے سیر چمن
سامنے شیشے کے مبہم لام تو ہو



آصف جاہ خامس

نواب میر تہنیت علیخاں فتح جنگ نظام الملک افضل الدولہ مغفرت مکاں ۱۲۷۳ھ ۱۲۸۵ھ

راجہ محبوب نواز ونت باقی

از

غفور احمد صاحب مجددی



شبیہ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت بھا درباقی

راجہ محبوب نواز ونت باقی

اب سے پہلے جب تعصب و تنگ نظری کی گھٹاؤں نے ہندوستان کے مطلع کو غلیظ نہیں کیا تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششیں ایک ایسے ادب کی تیاری میں مرکوز تھیں جو دونوں قوموں کے آرا و افکار کا آئینہ اور اتحاد و اتفاق کا مظہر کہا جا سکتا ہے۔ سنجیدہ اور سلامتی پسند ہستیاں معاملہ کو اس کے اصل رنگ میں صداقت اور حق کی نظر سے دیکھتی تھیں اور کبھی مذہب قومیت کی آڑ میں انتشار و نفاق کا سبب نہیں بنتی تھیں۔ اسی روش کے بزرگوں میں سے راجہ محبوب نواز ونت باقی تھے۔ ان کا سارا خاندان مسلمانوں سے شیر و شکر رہا اور یہ وسیع النظر، بلند مشرب اور مخلص انسان تھے۔ تعصب و تنگ نظری کی ہوا تک ان کو نہیں چھو سکی! مسلمانوں کے مذہب، معاشرت، تمدن، اوضاع و اطوار سے بالکلیہ واقفیت رکھتے تھے اور اپنے کو اس رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ فارسی، اردو اور ساتھ ہی ہندی کے بلند پایہ ادیب تھے ان کے ادبی کارنامے ہر طرح قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔

ان کا نام گردھاری پرشاد ہے، محبوب نواز ونت خطاب اور باقی تخلص۔ یکم رجب ۱۲۴۴ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے والد کا نام نرہری پرشاد اور رائے دولت رائے جد اعلیٰ تھے جو حضرت نواب آصف جاہ نظام الملک کے ہمراہ دکن آئے کچھ زمانہ اورنگ آباد میں رہے پھر حیدرآباد آ گئے اور شاہی اکرام کے سایہ میں زندگی بسر کی۔ خاندان کے اکثر افراد صاحب جاہ و مناصب گزرے ہیں جو نہ صرف دولت و امارت سے ممتاز تھے بلکہ علوم و فنون سے بھی بہرہ ور تھے۔ باقی کے والد سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور صاحب تصانیف بھی۔

گردھاری پرشاد بڑے بیٹے تھے۔ تعلیم و تربیت کا خاص لحاظ رکھا گیا۔ فارسی کی تعلیم محمد علی صاحب عاشق سے حاصل کی اور فارسی اشعار کی اصلاح بھی انھیں سے لیتے تھے اردو سخنگوئی میں حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ اکثر جگہ اردو غزلیات میں ان کے فیض کا اقرار کیا ہے ؂

دکن سے جائیں کیوں ہندوستان ہم　　　میسر فیض صاحب سے ہیں استاد

حضرتِ فیض کا سب فیض ہے باقی پہلے — نہ سخن گوئی تھی ایسی نہ زباں دانی تھی

محمد علی صاحب عاشق کے متعلق ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

عاشق استادِ کاملِ باقی شد — زاں مایۂ عشق حاصل باقی شد
از مصقلہ ذکر و ز تربیت فکر — آئینہ معرفت دل باقی شد

ذہانت اور جودت طبع کے باعث نوعمری ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی اور عنفوان شباب یعنی تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں سرکاری خدمت میں منسلک ہوگئے نواب رونق علیخاں شاہ یار الملک نے ان کے جوہر قابل کو تاڑ لیا اور انھوں نے نواب کی ایک قابل قدر خدمت یہ انجام دی کہ بعض غلط فہمیاں جو فوج اور نواب کے درمیان پیدا ہوگئی تھیں دور کرادیں۔ اس سے خوش ہوکر نواب نے ۱۲۶۷ھ میں اپنے یہاں سررشتہ داری فوج پر پانسو روپیہ ماہانہ پر مقرر کیا۔ نواب موصوف خود شعرو سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ لہٰذا باقی نہ صرف اپنی قابلیتوں بلکہ سخن گوئی اور حسن مذاق سے بھی نواب کی خوشنودی کا سامان مہیا کرتے رہتے تھے ۱۲۷۹ھ میں نواب مختار الملک نے فوج باقاعدہ کی ترتیب کا کام ان کے سپرد کیا۔ انھوں نے کنوز التواریخ میں ایک تفصیلی نظم اس واقعہ کے متعلق لکھی اور اس کام کے انجام اور فوج کی ترتیب کی تاریخ یہ نکالی۔

سال استادش بگو فوج وغا باقاعدہ

اس کام کے صلہ میں اُن کو صدر سررشتہ داری فوج باقاعدہ پر سرفراز کیا گیا۔ ۱۲۸۰ھ میں جمعیت نظام محبوب کا قیام ہوا تو اس کی سررشتہ داری بھی اُن کو ملی۔ اسکے علاوہ کئی اور اعلیٰ خدمتیں بھی ان کے سپرد کردی گئی تھیں جن کو باحسن وجوہ انجام دیتے تھے۔ نواب سالارجنگ اول نے اتالیق و مقرب شاہی مقرر کیا۔ اس خدمت کو انھوں نے نہایت تندہی اور خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ اعلیحضرت غفران مکاں کی رسم تسمیہ ۱۲۸۶ھ اور رسم علی بند ۱۳۰۱ھ کی تقاریب میں شاندار جلسے اپنے یہاں منعقد کئے جو ان کے خلوص اور وفاداری کے جذبات کو ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت غفران مکاں کو اسی وجہ سے ان پر اعتماد خاص تھا اور اکثر اہم کاموں کے لئے ان کو ہی منتخب کرتے تھے۔ اسکے علاوہ امرا دربار کے مشترک معاملات بھی اکثر باقی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے۔ ۱۳۰۱ھ میں دربار حکمرانی کے وقت راجہ بہادر کا خطاب معہ لوازمات عطا کیا گیا

نواب عماد السلطنت مدارالمہام وقت کی تحریک پر روشن چوکی اور عماری کی سرفرازی ہوئی۔ ۱۳۱۲ھ میں جشن سالگرہ کے موقع پر راجہ محبوب نواز ونت کے خطاب سے عزت افزائی ہوئی۔

چودہ سال کی عمر میں انکی پہلی شادی ہوئی۔ ۱۲۹۱ھ میں بیوی کا انتقال ہوگیا چھ لڑکوں اور لڑکیوں میں سے صرف ایک لڑکی اور ایک فرزند رائے کیشو پرشاد باقی رہے تھے۔ رائے کیشو پرشاد ۱۳۰۵ھ میں ہاتھی سے گر کر فوت ہوگئے۔ دوسری بیوی سے باقی کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں تولد ہوئیں جن میں سے راجہ نرسنگھ راج اور راجہ محبوب راج اور تین لڑکیاں باقی رہیں۔ وہ اکثر اولاد کی دائمی مفارقت کی وجہ سے مغموم رہتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام خصوصاً فارسی اشعار میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے بقائی کے مضمون بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۲۳ صفر ۱۳۱۴ھ کو نتھہ اکادشی کے روز (جو ہندوؤں کے یہاں خاص متبرک دن ہے) باقی کا انتقال ہوا۔

جیسا اوپر مذکور ہوا وہ مذہب کے پابند، بلند نظر اور وسیع المشرب شخص تھے۔ تصوف سے خاص لگاؤ تھا اسکے ساتھ ہندو دھرم کے احکام کے پیرو اور سخت پابند تھے۔ مذہبی ذوق وشوق میں انہوں نے بڑے بڑے دیول بنوائے جاتراؤں کا آغاز کرایا، نو مرتبہ زیارت کے لئے بنارس گئے، بزرگوں اور فقرا سے ملاقات اور ان سے فیض حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ سری بھائی سکرانند سرسوتی مرتاض سے عقیدت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے سال ان سے ملنے بنارس جاتے تھے۔ دو مثنویاں شمع منور فارسی، اور بیتی چرتر اردو سوامی جی کے حالات میں لکھی ہیں۔ حضرت حسین شاہ ولی قدس سرہ سے بھی، جن کی درگاہ محلہ کبوتر خانہ میں واقع ہے، خاص عقیدت تھی۔ ہر سال شاندار طور پر ان کا عرس کرتے تھے۔

خیراتی کاموں اور داد و دہش میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ ۱۲۷۵ھ میں کیشو گیری کے دیول کی شاندار تعمیر اطراف وجوانب کی آبادانی اور اسکے متعلقہ کاموں میں ہزاروں روپیہ صرف کردیا تین ہزار روپیہ سالانہ اسکے لئے مقرر کئے۔ ایک مرتبہ مزید چودہ ہزار روپیے اس دیول کے نذر کئے۔ اسکے علاوہ پندرہ بیس دیولیں اور بھی تعمیر کرائیں۔ ۱۳۰۳ھ میں بمقام مرزاپور زائرین کی سہولت کے مدنظر ایک گھاٹ تیار کرایا۔ اپنے مقطعہ میں ایک تالاب پندرہ ہزار روپیہ کے صرفہ سے بنوایا اور باقی ساگر نام رکھا۔ بزرگان دین کے نیازات شاندار پیمانہ پر کرتے تھے۔ رمضان میں روزہ داروں کی افطار کا انتظام رہتا تھا۔

وہ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے۔ لباس میں ہمیشہ یکساں روش قائم رکھی۔ قدیم لباس جامہ نیمہ دوگلہ وغیرہ پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ رزیڈنٹ بہادر نے دربار انگریزی کے موقع پر کہا "راجہ صاحب آپ یہ لباس کیوں پہنتے ہیں، یہ تو ہماری لیڈیوں کا لباس ہے" انہوں نے برجستہ جواب دیا "صاحب یہ لیڈیوں کا لباس نہیں بلکہ آپ کے مرشد اور رہنمایان دین یعنی پادریوں کا لباس ہے"۔

وہ موسیقی، خطاطی اور ریوٹ میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ سجنت وپز کے طریقوں سے بھی بڑی واقفیت تھی۔ مشغلہ کے طور پر اپنے ہاتھ سے کھانے پکاتے اور اعلیٰحضرت غفران مکان، نواب سالار جنگ، اور دوسرے امراء و معززین کی خدمت میں بھیج کر خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف میں مصروف رہنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ روزانہ صبح چار بجے سے سات بجے تک اور اکثر اوقات راتوں کو اسی کام میں مشغول رہتے تھے۔ تصانیف کی جملہ تعداد اکتیس[31] ہے، جن میں فارسی نظم کی بیس[20]، فارسی نثر کی تین اردو نظم و نثر کی چار اور ہندی بھاشا کی چار کتابیں ہیں۔

فارسی نظم :- ۱۔ پیرایہ عروض۔ ۲۔ یادگار باقی :- (فارسی غزلیات کا دیوان) ہے۔ ۳۔ قصائد باقی ۴۔ بہار عام۔ ۵۔ مثنوی صنائع بدائع۔ ۶۔ پرنس نامہ۔ ۷۔ تہنیات باقی۔ ۸۔ ضرب الامثال۔ ۹۔ مکتوبات منظومہ۔ ۱۰۔ زمزمہ باقی۔ ۱۱۔ بھاگوت شریف۔ ۱۲۔ رامائن مسیحا۔ ۱۳۔ رباعیات بابرکات۔ ۱۴۔ رباعیات مناجات باران رحمت ۱۵۔ باقی نامہ۔ ۱۶۔ باغ رزاق۔ ۱۷۔ مثنوی شمع منور۔ ۱۸۔ منشآت باقی۔ ۱۹۔ کنوز التواریخ۔ ۲۰۔ کلام متفرقات۔

فارسی نثر :- ۱۔ افضل التصحیح (فارسی کا لغت) نوشتۂ عاقبت :- (سفر نامہ ہے جس میں اکیس سفروں کا تذکرہ ہے) گلکنڈہ، دہلی، آگرہ، متھرا، بنارس، امرتسر، بمبئی، ناسک، مدراس وغیرہ کے حالات سفر بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ مہابھارت :- یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ تھا۔ اصل کتاب کے اٹھارہ پربوں میں سے دو پرب ختم ہوئے تھے کہ انتقال ہو گیا۔

اردو نثر و نظم :- ۱۔ بیتی چرتر۔ سوانح عمری سوامی بھاسکر انند سرسوتی۔ ۲۔ تصنیفات سیاقی باقی ۳۔ لقا باقی



" Pictorial Hyderabad."

راجہ نرسنگ راج بہادر

(دیوان اردو) ۴۔ درد باقی و درد ساقی:۔ اس کتاب میں خواجہ درد کی تقریباً دو سو فارسی رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعیوں میں کیا گیا ہے۔ خواجہ درد کی رباعیاں انہوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ بھوپال سے منگائی تھیں۔ یہ خود صوفی منش تھے۔ درد کی یہ رباعیاں تصوف سے مالامال تھیں لہذا ان کو بہت پسند آئیں۔ ترجمہ کے ساتھ اصل رباعیاں بھی شائع ہوئی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ انکے صاحبزادے راجہ نرسنگھ راج عالی نے (جنہیں شعر و سخن کا بھی ذوق ہے اور شاعر بھی ہیں) ۱۳۲۲ء میں شائع کرایا ابتدا میں مصنف کے حالات بھی دئے ہیں اور سوانح کی حد تک ہمارے معلومات اسی سے ماخوذ ہیں۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل ہے۔ علاوہ درد کی رباعیوں کے ترجمے کے خود باقی کی سوا سو فارسی اور چار اردو رباعیاں بھی کتاب کے آخر میں شامل کی گئی ہیں۔

ہندی بھاکا:۔ ۱۔ تیرتھ مال بھجنوں کا مجموعہ۔ ۲۔ شنبھو پران۔ ۳۔ کیشو پران۔ ۴۔ بھاگوت سار۔

باقی کو فارسی سے جو ذوق اور لگاؤ تھا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ان کی تصانیف کا جو تہائی حصہ فارسی زبان میں ہے اور اسمیں بھی نظم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کتابوں سے فارسی معلومات کی وسعت، استادانہ رنگ اور پختگی کے انداز کا پتہ چلتا ہے۔ موقع نہیں کہ انکی فارسی کے متعلق زیادہ لکھا جائے اور انکے کارناموں پر اس ضمن میں بالتفصیل روشنی ڈالی جائے۔ فی الحال نثر و نظم کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے فارسی قابلیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ حمد میں لکھتے ہیں:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم گوئی   مفتاح گنج راز ایمان کو جوئی

باقی نام ذوالجلال لم یزل ولایزالی است کہ ابدالاباد باقیست۔ و ابتدائے ابتدائش و انتہائے انتہائش کسے را معلوم نیست۔

حیدرآباد کا ذکر کرتے ہیں:۔ باقی با دفتر خندہ بنیاد حیدرآباد کہ بہ یاوری تقدیر قسمت خداداد و اتفاق مولاد منشا گردید اضعف العباد گردھاری پرشاد باقی درین مینو سواد افتاد۔ بہ فضل و بہ برکت شہر کہ نام مبارک حیدر کرار محمود بلاد است و رشک روم و بغداد

خود کو مخاطب کر کے نصیحت کرتے ہیں:۔ باقی سراسر خانی مسرت داد کہ در نماز پنجگانہ بہ بارگاہ یگانہ سجدۂ شکرانہ نمائی نہ کہ از مستی پخبر نہ دستار رنگین آرائی و بہ کلاہ زرین و تاج مرصع سر خم تشم و تکلف بر آسمان تکبر فرسائی حقیقت داد کہ منا بدرہ

جمال وحدت و تماشائے قدرت سازی نہ کہ نگاہ بد و نظر حسد بر چہرۂ پردگیان عفت و عصمت و خوبرویان نیکو صورت بہ نیت فاسد اندازی

باقی نامہ کے خاتمہ پر حمد میں ایک غزل لکھی ہے۔ کتنی لطیف، شستہ اور سلیس ہے ؂

ہمہ عالم فناست اے باقی   نیست موجود غیر حے باقی   ہمہ تن خالیم چو نے باقی   نیست جز استخوان و پے باقی

از دوئی درگزر ہمہ او ہیم   نیست در ما بغیر وے باقی   غیر حق کل من علیہا فان   باقیا نیست ہیچ شئے باقی

نعت کی یہ غزل اس قدر مقبول ہوئی کہ مولوی غلام امام شہید اکثر مجالس میلاد کا افتتاح اس غزل سے کیا کرتے تھے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:—

نخست اول بہ اخفا آفریدند   ازاں پس دین و دنیا آفریدند   برب کعبہ ابروئے خوشت را   برائے سجدۂ ما آفریدند

نشد از سرمہ مازاغ محتاج   کہ چشمان تو شہلا آفریدند   جمالت بہر عالم حسن یوسف   فقط بہر زلیخا آفریدند

سراپائے ترا مدحت چہ سازم   کہ از نورت سراپا آفریدند   مرا باقی زبہر وصف آن گل   برنگ مرغ گویا آفریدند

پند و موعظت ان کے کلام کا خاص رنگ ہے۔ ایک غزل میں فکر آخرت اور یاد الٰہی پر زور دیتے ہیں:—

پاں بہ دنیا خیال دیں ہم دار   حفظ آن کن لحاظ ایں ہم دار

آفرینش تمام گو از تست   یاد آفاق آفریں ہم دار

در مکان جہاں کہ می مانی   باقیا خاطر مکیں ہم دار

اپنی آزاد مشربی کا ذکر کتنی خوبی سے کرتے ہیں:—

نے کافر بدکیشم و نے کافر دینم   آزادۂ عشقم نہ چنانم نہ چنینم

خوانی اگرم عاشق بے کینہ ہمانم   دانی اگرم بندۂ دیرینہ ہمینم

جائے کہ بود پردگی حسن مکانم   آنجا کہ کند جلوہ گری عشق مکینم

چند متفرق اور منتخب اشعار:—

ہست محراب حرم ابروئے تو   کعبۂ ارباب ایماں کوئے تو   منت بے جا ز رضواں کے کشم   ہست فردوس بریں پہلوئے تو

افسوس ہست، نیست کسے رازدانِ دل　　سازم چہ با مجاز فروشاں بیان دل
باید کہ دل دوپارہ بداری ز دردِ عشق　　پیوندِ حرف نیست ازیں رو میانِ دل

ملکہ وکٹوریا کے دربار دہلی کے متعلق جو اشعار کہے ہیں اس سے شاعر کی آزاد منشی معلوم ہوتی ہے بجائے زمین آسمان کی تعریفیں کرنے کے کتنی دو ٹوک بات کہی ہے :—

کوئیں بر شنیدم شہنشاہ شد　　دلم زیں حقیقت نہ آگاہ شد
شہنشاہ بودن شنیدن مشکل است　　اگر بہر ہند است بے حاصل است
شہنشاہ را تاج بخشی سزا ست　　زنشاہاں اگر باج گیر درواست
دراں وقت ایں نام با نافی است　　وگرنہ فقط لفظ بے معنی است

خواجہ درد کی رباعیوں کا ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اصل کی لطافت ترجمہ میں بعینہ موجود رہی اور اردو کی خصوصیات طرز ادا کی خوبی اور بندش کی چستی کا بھی خیال رکھا گیا ہے :—

درد

حمد المنزہ عن یسمٰی باللہ　　فی الخلق وحدتہ والکان سواہ
مرآۃ جمالہ جمیع الاکوان　　فی الکون لمارئیت الا ایاہ

زد شعلہ چو حسن ولفروزش خوانند　　گل کرد چو نار عشق سوزش خوانند
خلق است عبارت ز ظہور خالق　　خورشید چو جلوہ کرد روزش خوانند

مارا نبود گزر دراں کوکہ توئی　　تو ہر سو و کس نرفتہ آں سو کہ توئی
گو آئینہ وجہ تو باشد ہمہ خلق　　نتواں دیدن ترا ازاں رو کہ توئی

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم　　گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسید تم منظور است　　پیوستہ بروں ز خویشتن می آیم

ہر چند کہ بر لب است حرف خنداں　　دل گشت نکشید لیک طرف خنداں
چوں گل ہمہ مشق سینہ چاکیہا بود　　عمرے کہ نمودہ ایم صرف خنداں

باقی

اس پاک کو حمد نام ہے جس کا خدا　　پایا ہے خلق میں وحدت اسکے سوا
ہے اسکے جمال کا جہاں آئینہ　　دنیا میں نہ دیکھا مگر اسکو دیکھا

چمکا جب حسن دلفروز اسکو کہیں　　بھڑکا جب عشق نار سوز اسکو کہیں
ہے خلق عبارت ظہور خالق　　خورشید کرے جلوہ تو روز اسکو کہیں

جس کوچہ میں تو ہے نہیں واں اپنا گزر　　ہر سو گیا ہے تو وہاں گیا کوئی اے بشر
سب خلق تیری ذات کا گو آئینہ ہے　　جو منہ ہے ترا دیکھ نہیں سکتی نظر

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں　　بھولا ہوا راستہ ہے گھبراتا ہوں
شعلہ کی طرح کہیں پہنچا ہوگا　　یوں آپ سے باہر جو نکل آتا ہوں

گو لب پہ رہا ہمیشہ حرف خنداں　　دل کو نہ ہوا میل بہ طرف خنداں
مشق شل وہ گل کے سینہ چاکی کی　　جو عمر کہ ہم نے کی ہے صرف خنداں

باقی کی اپنی رباعیاں بھی درد کی رباعیوں کا نقش ہیں۔ تنوطیت، یاس و حسرت کا ایک دریائے بے پایاں امنڈ رہا ہے
طرز ادا اور ادائے مطلب بھی خواجہ درد کا سا ہے۔ یہ رباعیاں معرفت و موعظت سے بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ دنیا کی بے ثباتی کا ایسا گہرا نقش سامعین کے قلب پر بٹھانا کہ زندگی ناکامی و مایوسی کا مرقع بن کر عمل کی روح کو فنا کر دے قومی نقطہ نظر سے کوئی اچھا کارنامہ نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس زمانہ کے صوفیا اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

تا در ہوس وجود ہستی ہستی
ہموارہ تو در نفس پرستی ہستی
موجود شناسی و عدم در نیستی
از روز ازل ہر آنچہ ہستی ہستی

احوال جہانیاں بدیدیم بسے
ہر کس دل خود بستہ بفکر ہوسے
اخلاق و محبت بدلے باقی نیست
افسوس کہ نیست در زمانہ کسے

اردو دیوان "بقائے باقی" کے نام سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوا۔ منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی راجہ صاحب کے پاس ملازم تھے ایک روز اتفاق سے راجہ صاحب کا مجموعہ کلام انکی نظر پڑ گیا۔ انہوں نے نہایت اصرار کے ساتھ اسکو شائع کرنے کی اجازت چاہی۔ اس واقعہ کو افق نے ایک قصیدہ میں نظم کیا ہے۔ اور ساتھ ہی راجہ صاحب کی سوانح حیات بھی بیان کی ہے۔ یہ قصیدہ دیوان اردو کے شروع میں درج کیا گیا ہے۔ یہ دیوان ۲۰۹ غزلوں، ایک مخمس اور ۱۶ سلاموں پر مشتمل ہے۔

اردو غزلوں میں متاخرین شعرائے لکھنو کا رنگ غالب ہے، شعر کی ظاہری شکل، الفاظ کی رنگینی، بناوٹ، مناسبات لفظی اور زبان پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی کم ہے۔ محاورے اور روزمرہ بہت خوبی سے ادا کئے ہیں۔ شوخی و ظرافت کا رنگ بھی جھلکتا ہے اگرچہ بعض مقام پر انتخاب الفاظ اچھا نہیں اور طرز ادا عامیانہ ہے۔

شستگی، سلاست اور برجستگی باقی کے کلام کے اہم اجزا ہیں مثلاً چھوٹی بحر کی غزل میں کیسے صاف اور سلیس شعر کہے ہیں۔

بام پر یار کا جلوا دیکھا
طور پر نور کا شعلا دیکھا
دل میں دنیا کا تماشا دیکھا
موجزن کوزہ میں دریا دیکھا

قاصد اتنا ہی تو کہہ دیجیو ہم سے
خط کو پڑھوا کے سنا یا دیکھا
راہ میں کل وہ ملا تھا یا نہ ملا
مری جانب کو نہ اصلا دیکھا

ہوش کی لیجئے ادھر تو دیکھو
کیا منہ پھیر کے دیکھا نہ دیکھا
جس نے دیکھا وہ ترے ہے آنا کو
باقی عنقا کو ہے گویا دیکھا

حسب ذیل شعروں کی برجستگی قابل داد ہے:۔

آپ نے لطف سے آنسو تو نہ پوچھے ہوتے
دیکھتے دیدۂ پر نم یا دیدۂ تر کیا کرتا

کہہ رہا ہے دلِ شیدائے شراب — ہائے خم، ہائے سبو، ہائے شراب

ناوک کا تیر ہے نگہ خشمگیں نہیں — ہے تیغ آبدار یہ چینِ جبیں نہیں

پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر — دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

حباب آسا ہے اپنا دم لبوں پر — کوئی دم میں اِدھر ہے یا اُدھر ہے

بعض جگہ ایک دو لفظ ایسے لائے ہیں کہ پورے شعر میں جان پڑ جاتی ہے مثلاً اس شعر میں لفظ "دوچار"

سب ہے مفتونِ چشم و زلف و خط و خال یار پر — سینکڑوں نے جان کھوئی ہے انہیں دوچار پر

اس شعر میں "بھولے سے" کا لفظ ـ یاد دلواتا ہے تیرا حسن حسنِ حور کو — تجھ کو خالق نے مگر بھولے سے انساں کر دیا

چند الفاظ کا اجتماع ایک مصرعہ میں بڑی خوبی اور صفائی سے کیا گیا ہے ـ

دل میں میرے بھرے ہیں اب باقی — آرزو، شوق، مدعا، مطلب

زوال میں نہیں باقی کوئی کسی کا شریک — رفیق، دوست، پسر، اقربا، غلام، عزیز

کاٹے کھاتے ہیں غمِ ہجرِ صنم میں باقی — شمع، سیارے، ستارے، شبِ دیجور، چراغ

روزمرہ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے ـ میں نے جب دردِ دل کہا بولے — بس جی بس چپ رہو ہوا معلوم

میں جو گھر اس کے گیا غیر سے بولا وہ صنم — اُن سے پوچھو اجی کیوں آئے ہیں کیا کہتے ہیں

کیا لب و لہجہ ہے کیا تقریر ہے — کیا زباں چلتی ہے فر فر دیکھئے

محاوروں کا استعمال برمحل اور خوب ہے ـ

ترکی ہو جائے گی تمام اپنی — سرِ توسن جو تو چڑھا اے دوست

پھر یادِ ذقن دکھا رہے ہو — پھر ہم کو کنوئیں جھنکا رہے ہو

مجھ کو جو ستو، رلا رہے ہو — الٹی گنگا بہا رہے ہو

ٹھگ سے ہیں زاہد نہیں ہیں اب باقی — ایسے بڑھ کر نہیں کوئی نٹ کھٹ

کیا آپ کا سر پھرا ہے واعظ — مستوں کا جو سر پھرا رہے ہو

آجکل مشق ہے شمشیر زنی کی ان کو — کاش ہم پر بھی کریں صاف وہ تلوار کے ہاتھ

مناسبات ورعایاتِ لفظی پر زور دینا قدیم دبستانِ شعر کے متبعین کے یہاں باعثِ حسن و خوبی سمجھا جاتا ہے۔ باقیؔ کا کلام بھی ان چیزوں سے خالی نہیں مثلاً حسبِ ذیل شعر میں "پتلیوں" کے لفظ میں ایہام رکھا گیا ہے۔ پتلیوں کا ایک مفہوم خوبصورت پانی بھرنے والیاں ہیں اسکی مناسبت سے پانی بھرنے کا ذکر کیا ہے پھر آنکھوں کی پتلیوں کے لحاظ سے آنسو کو پانی قرار دیا اور نتیجۃً آنکھوں کو پنگھٹ ؎

پتلیاں بھرتی رہتی ہیں آنسو　　میری آنکھیں ہیں یا کہ ہے پنگھٹ

ایک شعر میں معشوق کو سحرِ خوبی کہا، سحر کی مناسبت سے پاٹ کا لفظ یاد آیا۔ پھر پاٹ کا ایک استعمال کپڑے کے پاٹ کیلئے بھی ہے۔ ان تمام مناسبتوں کا خیال کرکے یہ شعر کہا ؎

بہے اس سحرِ خوبی کی جدائی میں سرشک ایسے　　کہ گویا پاٹ ہے دریا کا ہر اک پاٹ دامن میں

ایک اور شعر میں "پاؤں" کا لفظ ضلع جگت کے طور پر استعمال کیا ہے پھر اسکے ساتھ ہی ہاتھ کا ذکر کیا۔ ہاتھ کے ساتھ "ہاتھ آنا" اور "ہاتھ مارنا" دو محاورے یاد آگئے ؎

چوم لوں پاؤں جو اس عہد شکن یار کے ہاتھ　　ہاتھ آیا نہ کبھی جب سے گیا مار کے ہاتھ

حسنِ ادا باقیؔ کے کلام کی خاص چیز ہے۔ ان کا استادی رنگ اس سے ثابت ہے۔ خیالات اکثر فرسودہ ہیں لیکن پیرایہ بیان لطیف اور دلچسپ ہے۔ شاعر کا بڑا کمال بھی یہی ہے کہ پرانے اور پامال مضامین کو اس طرح نظم کردے کہ خاص لطافت پیدا ہوجائے یہ لطافت بعض وقت ندرت کی حد کو پہنچ جاتی ہے:—

یہ تو چلتی ہے مری محفل میں　　کون کہتا ہے نہیں پائے شراب　　گر اس کی نہیں آتی نظر تک　　نظر ابھی نہیں جاتی کمر تک

آمد شدِ نفس پہ ہے موقوف زندگی　　باقیؔ حباب دار مرا تن ہوا پہ ہے　　کٹتی ہیں زلف و رخ کی فرقت میں　　راتیں محنت سے دن مصیبت سے

آکر بلائے حشر مرے سر پہ ٹل گئی　　پر شام ہجر کی نہ ابھی ایک پل گئی　　اور بھی دشنام سنیے چھیڑ کر　　لذتِ قند مکرر دیکھیے

ہے عکس گلن جو آنکھ میں رخ　　ساغر میں ہے آفتاب کا رنگ

ایک شعر میں ایسا اچھوتا طرز اختیار کیا ہے کہ پڑھیے اور لطف اٹھائیے ؎

یہ کس آشوبِ جاں کی رہگزر ہے　　کہ نقشِ قدم اک چشمِ تر ہے

کلام میں ظرافت کا حصّہ بھی کافی ہے۔ اگرچہ اس کا دائرۂ عمل زیادہ تر حضرت زاہد تک محدود ہے اور متعدد جگہ پیرایہ کرخت ہے۔ انتخاب الفاظ میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے جسکی وجہ سے ابتذال پیدا ہو گیا ہے تاہم لطیف اور شستہ مذاق کے بہت سے شعر مل جاتے ہیں

جس نے دیکھا دہن جاناں کو | باقی عنقا کو ہے گویا دیکھا
کفر ہے خال رخ جاناں کو کہتے ہیں ہلال | شاعروں نے جھوٹ ہندو کو مسلماں کر دیا
قد ہے طوبیٰ، رخ ہے جنت، لب ہیں خم ہائے بہشت | حسن نے تجھ کو سراپا باغ رضواں کر دیا
یا عصا، یا شانہ، یا تسبیح، یا مسواک ہے | زاہدان خشک کا ہے سب کا سب اسباب خشک
مبارک شیخ صاحب کو عمامہ | اٹھائیں گے نہ یہ بار گراں ہم

چند شعر جو مبتذل اور عامیانہ ہیں:—

کیوں مجھ پہ اے شکر لب یوں دانت پیستے ہو | کھا جاؤ گے کسی کو لڈو نہیں ہے کوئی
کاکل ہلا کے ہر دم کس کو پھنسا رہے ہو | اس دام میں پھنسے گا الو نہیں ہے کوئی
باتوں میں بگڑ جاتے کچھ بہتر ہے حسینا | اتنا بھی تو بد ذاتی پہ آنا نہیں اچھا
داڑھی میں ترے خضاب کا رنگ | گویا کہ ہے مے کا رنگ زاہد

عجب بات یہ ہے کہ تصوف و معرفت کا گہرا رنگ جو باقی کے فارسی کلام پر چھایا ہوا ہے اردو میں تقریباً اڑ گیا ہے۔ فارسی رنگ کے برابر تو کوئی شعر اردو میں ملتا ہی نہیں اس رنگ کا ایک آدھ شعر کہیں ملتا ہے تو پھیکا اور بے لطف اور یہی حال نصیحت و موعظت کا بھی ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ رنگ کس قدر پھیکا ہے:—

دریا سے موج، موج سے دریا نہیں الگ | ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم
دنیا میں عبث ہے فکر عقبیٰ | دو دن کے لئے تو آرہے ہو
نظر آیا مجھے ہر رنگ میں تیرا ہی ظہور | میں نے ہر شے میں تری جلوہ نمائی دیکھی
اعتبار عالم فانی نہیں صلا دلا | قبر کی تعمیر کیجئے قصر و ایوان توڑیے

دیوان اردو کے آخر میں باقی کے سلام درج کئے گئے ہیں۔ سلام، مرثیہ کے بہ نسبت زیادہ صاف سلیس اور سادہ ہوتا ہے شکل اور ساخت کے لحاظ سے غزل سے مشابہت رکھتا ہے مرثیہ میں تو مسلسل کسی واقعہ کا ذکر ہوتا ہے اور وہ اس لحاظ سے مثنوی کے مشابہ ہے لیکن سلام میں غزل کی طرح مختلف خیالات بیان کیے جاتے ہیں ایک شعر کو دوسرے شعر سے مربوط ہونا ضروری نہیں

ہر شعر میں ایک نیا مضمون ہوتا ہے۔ اور جس قدر سادہ طریقہ سے بیان کر دیا جائے بہتر ہے۔ غزل گو شعرا کے یہاں یہ صنف مرثیہ سے زیادہ مقبول ہے۔ باقی نے مرثیے تو غالباً نہیں لکھے البتہ سلام کہے ہیں اور خوب کہے ہیں۔ خیالات کا تنوع، طرزِ ادا کا حسن، زبان کی سلاست اور الفاظ کا برمحل استعمال ان کے سلاموں کا مرتبہ بلند کر رہا ہے۔ چند منتخب شعر نقل کر کے اس دلچسپ تذکرہ کو ختم کیا جاتا ہے

مصائبِ اہلِ بیت کا بیان :— مجرئی! ان سے جو پسرِ شاہِ ہدا کا اترا بیٹھتا سر کو فلک پر سے مسیحا اترا

پاؤں میں زنجیر جب سجاد کے ڈالی گئی غل اٹھا ایسا کہ رن میں حشر برپا ہو گیا
گھر لٹا خیمے جلے، شوہر گیا، بیٹے گئے قید خانہ میں پڑی بانو، یہ کیا کیا ہو گیا
عالم رو رہا تھا میں اشک افشاں رسول اللہ تھے باغیوں نے باغ لوٹا باغباں رونے لگا
ان کو تشہیر کیا کر کے سوار ناقہ شان میں جن کے ہے تطہیر کی آیت آئی
کوئی گھر میں، کوئی زنداں میں، کوئی مقتل میں کنبہ کے کنبہ پہ شبیر کے آفت آئی

شجاعت کا بیان :— شہ کہتے تھے میں صف شکنی سے نہیں ڈرتا بازو میں مرے زور ہے خیبر شکنی کا
زہرا کا کلیجہ ہوں دلِ شیرِ خدا ہوں سید ہوں نواسا ہوں رسولِ مدنی کا

کھینچ کر تیغ شاہ نے فرمایا دیکھ میرے دل و جگر کو دیکھ
کہا شمر نے نہیں کوئی رفیق اب فقط ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
دیا ہے اپنا سر میں نے خوشی سے قضا ہے یارِ ضا ہے اور میں ہوں
جو کچھ وعدہ کیا پورا کروں گا یہ خنجر ہے گلا ہے اور میں ہوں

اپنے رنج والم کا بیان :— اشکِ اپنے کہیں سرخ ہیں یادِ شہدا میں چھپتا ہے بہت رنگ عقیقِ یمنی کا
یاد آئی جو گلگوں کفنی بے کفنوں کی اشک آنکھوں سے بہنے لگے شبنم سے زیادہ
سلامی! ماتمِ شہ کا بیاں ہو عزا ہو گریہ ہو آہ و فغاں ہو
سلامی! کربلا ہے اور میں ہوں غم و کرب و بلا ہے اور میں ہوں
غمِ سبطین ہے تا حشر جہاں میں باقی اشک اس رنج میں برسا کر زمانے والے

میر احمد علی عصر

از

محمد اکبر الدین صاحب صدیقی

سابق مدیر "الموسیٰ"

میر احمد علی عصر

میر احمد علی نام عصر تخلص ہے والد کا نام میر بندہ علی خاں ان کے جد امجد کارنمایاں کے صلے میں نواب آصف جاہ اول کے دربار سے خطاب خانی اور جاگیر سے ممتاز تھے۔ اسی سلسلہ میں عصر مرحوم کو تاحیات ۵۲ ماہانہ سرکار سے منصب ملتا تھا۔ سلسلہ نسب میر احمد علی ابن میر بندہ علی ابن میر اعظم علی خاں ابن میر مرتضیٰ علی خاں ہے مولف "تزک محبوبیہ" نے لکھا ہے "پچہتر سال کا سن ہوگا" یعنے وہ تزک محبوبیہ کی تالیف کے زمانہ (۱۳۲۱ھ) میں موجود تھے اس لحاظ سے سن پیدائش تقریباً ۱۲۴۵ھ ہے اور ایک خط سے (جس کا ذکر آگے آئیگا) ظاہر ہوتا ہے کہ عصر نے ۱۳۲۱ھ اور ۱۳۲۳ھ کے درمیانی زمانہ میں انتقال کیا۔ ان کا مکان بیرون دروازہ علی آباد و تکیہ مغل فقیر کے محاذی ہے چنانچہ وہ ایک شعر میں اسکی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں ؎

دروازۂ نشاط کا کھلنا محال تھا — اے عصر جاتے گر علی آباد تک نہ ہم

عصر تکیہ مغل فقیری میں مدفون ہیں یہ ویسی ہی کشش و الفت مقامی ہے جس طرح حافظ کو رکنا باد سے تھی۔

زمانہ کے رجحان کے موافق عصر کو فارسی و عربی پر کافی عبور حاصل تھا۔ اردو تو مادری زبان تھی۔ شاعری کا چسکا بچپن سے تھا اور فیض جیسی نفس قدسی کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا نہ صرف شاعری بلکہ طریقت و معرفت کی راہیں بھی فیض ہی کی رہبری میں طے کی۔ انہوں نے حضرت فیض کی شان میں متعدد قصاید لکھے تھے یہاں انکے دیوان سے چند اشعار جن سے عقیدتمندی ظاہر ہوتی ہے نقل کئے جاتے ہیں۔

شاعر ہزاروں لاکھوں کروڑوں ہیں لیک عصر — استاد سا تو ایک نہیں کائنات میں

فیض جناب فیض ہے دریائے فیض حق — ہے عصر فیض یاب اسی آستاں سے ہیں

فیض جناب فیض سے اے عصر آج کل — طبع رواں کے حکم رواں [illegible]

پہنچتا اپنے مطلب کو ہے ہر مطلوب کا طالب — ملے ہر ظلم سے ملو ہے ساغر فیض مطلب کا

شریعت میں طریقت میں حقیقت میں اگر ڈھونڈو نظر آیا نہ مجھ کو ایک ہمسر فیض صاحب کا

غرض عصر نے حضرت فیض کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا ؂

خدائی میں نظیر ان کا نظر آتا نہیں کوئی ہے کیا ہی مرتبہ اللہ اکبر فیض صاحب کا

کیوں نہ ہو فیض اپنے عصر کے جگت استاد اور مرشد کامل مانے جاتے تھے ان کے تلامذہ اور مریدین کی تعداد بھی کثرت سے تھی۔ ان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ غرض ایک سعادت مند شاگرد اپنے استاد کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا اظہار عقیدت کر سکتا ہے۔

دیوان عصر میں (جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے) ردیف ض میں جملہ آٹھ غزلیں ہیں اور سات غزلوں کی ردیف 'فیض' ہے اور ایک غزل کی ردیف 'غرض' ہے لیکن وہ بھی حضرت فیض کی تعریف سے مملو ہے۔ عصر ہیں زیادہ چھان بین سے باز رکھتے ہیں اور خود فرما دیتے ہیں۔

کل مرا دیوان غلامی کے ہے دعوی کی دلیل عصر میری جو غزل ہے اک گواہ فیض ہے

اور یہ ان کی عقیدت کی انتہائی سرحد ہے۔

بقول مولف "تزک محبوبیہ" عصر کے چار دیوان غزلیات کے اور ایک دیوان رباعیات کا ہے سب قلمی ہیں کسی کی اشاعت کا موقع نہیں ملا لیکن ہمیں اس وقت تک ان کی چار کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ جن میں ایک تلامذہ فیض کا تذکرہ ہے اور دوسرا النغمیہ کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۳۰۱ھ میں مطبع صبغۃ اللہی تعلقہ رائچور سے شائع ہوا ہے اس کی ایک جلد مولوی سید محمد ایم اے کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ تیسری کتاب جو ہمارے زیر نظر ہے غزلیات کا دیوان ہے جو خود حضرت عصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور چوتھی کتاب رباعیات کا دیوان ہے یہ بھی عصر ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کے مطالعہ کی اجازت نواب صاحب ممدوح ہی نے اپنی مشہور علم دوستی کی بنا پر عطا فرمائی ہے جس کے ہم ممنون ہیں یہی ہمارا سرمایہ ہے جس کی بنا پر یہ مضمون ہدیہ ناظرین ہے۔ متذکرہ دیگر تین دیوان باوجود تلاش کے نہ مل سکے لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔

عصر کے اولاد نہ تھی جس کا انھیں بے حد قلق تھا ان کے بعض اشعار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہتے ہیں ؎

رباعی

پھول پھل آیا نہ باغ زندگانی میں کبھی ۔۔۔ گلشن ایجاد میں ہیں بے ثمر پیدا ہوا

روتا ہوں لب پہ آہ و نالہ بھی نہیں ۔۔۔ اندھیارے مکان کا اجالا بھی نہیں

اولاد سے ہے نام و نشاں دنیا میں ۔۔۔ اپنا کوئی عصر رونے والا بھی نہیں

عصر کے اولاد تو نہ تھی لیکن ان کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے اور بعض شاگردوں نے تو خاصا نام پیدا کیا ہے مثلاً (۱) نواب میر وزیر علی خاں آصف یاور الملک وزیر (۲) نواب محمد عزیز الدخاں عزیز یار جنگ عزیز (۳) صاحبزادہ میر مصطفےٰ علی اسد (۴) فخر الدین سیف (۵) مرزا عزیز جنگ سجاد تکیہ مغل فقیر (۶) نظام (۷) ساجد (۸) تحمل (۹) نام (۱۰) قیس (۱۱) کریم (۱۲) شرف، یہ وہی شرف ہیں جنھوں نے عصر کا مجموعہ نعتیہ اپنے مطبع میں چھپوایا۔ اور رباعیات کا دیوان بھی چھپوانا چاہتے تھے چنانچہ ایک خط میں جو نواب مشرف جنگ فیاض (والد ماجد نواب عزیز یار جنگ بہادر) کا موسومہ ہے لکھتے ہیں۔

"مجموعہ رباعیات استاذنا عصر صاحب مرحوم و مغفور بعیت مکرمی سید عباس صاحب قادری مرسل خدمت ہے۔ سابق رباعیات موصولہ کو کمترین نے طبع کروانا آغاز کیا تھا چنانچہ چند اوراق ملاحظہ کے لئے گذرانا ہوں مگر کاتب کی عدم دستیابی کے سبب سے ملتوی رہا اور یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ ناکامل ہے۔ ایک دوسرا مجموعہ مکمل جن میں کامل رباعیات حضرت کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں کتابوں کی الماریوں میں ہے میں بچشم خود دیکھ چکا ہوں۔ آخر عرض یہ ہے کہ اگر یہ وہاں طبع ہو جائے تو ایک جلد مرحمت فرمانا۔ مرقومہ ۱۵ شوال ۱۳۲۳ھ۔"

شرف اگر یہ دیوان بھی طبع کرا دیتے تو اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان رباعیات کو اپنے استاد عصر کی زندگی ہی میں شائع کرنا چاہتے تھے چنانچہ حضرت عصر کی ایک رباعی سے اس کی شہادت ملتی ہے۔

روشن علی شرف تخلص اے عصر ۔۔۔ آباد رہے مراد کا اس کے قصر

دیوان کی ترتیب میں مصروف ہے لیں ۔۔۔ اب ہم بھی رباعیات کو کرتے ہیں حصر

مگر مجموعہ کے متعلق جہاں تک ہمیں علم ہے اشاعت نہیں ہوئی رباعیات کے دیوان میں جو ہمارے پیش نظر ہے تقریباً ہزار

رباعیات ہیں جن کا انتخاب اس مضمون کے آخر میں درج کیا جائے گا۔ اسکے مطالعہ سے میر احمد علی عصر کی رباعیات کی اہمیت اور انکی وسعت معلومات اور زبان دانی ظاہر ہوسکے گی۔

عصر نہایت خوش خلق، خوش باش، کم سخن اور بے پرواشخص تھے انھیں نہ کسی چیز سے شوق تھا اور نہ کسی چیز کی عادت۔ صرف حقہ ان کا رفیق و ہمدم تھا۔ خواہ اس میں گڑاکو ہو یا نہو مگر نے سے آواز ضرور آنی چاہیے تھی چنانچہ اسی شوق کو ایک رباعی میں اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

منہ سے مجذوب کی مزا ہے بڑ کا　　　جیسا دے کھڑا حقہ مزا گُڑ کا

ان کی نشست گاہ نواب مشرف جنگ فیاض کا دیوان خانہ تھا۔ یہیں شاگردوں کا مجمع رہتا اور نقریباً دن کا زیادہ حصہ درس وتدریس میں گزرتا۔ نواب مشرف جنگ کے صاحبزادوں کی تعلیم بھی ان کے سپرد تھی اور دیگر مشتاقان سخن کے کلام کی اصلاح بھی اسی ضمن میں ہوتی رہتی۔ اصلاح سخن کے لئے کوئی خاص دن یا وقت مقرر نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کام میں مشغول رہتے حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی ذات گویا مرنج و مرنجان کی تصویر تھی ۔

ان کے غزلیات کا ایک نہایت ضخیم دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مگر یہ مکمل نہیں معلوم ہوتا۔ انکے دوسرے مکمل دیوان افسوس ہے کہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت دستیاب نہ ہوسکے موجودہ دیوان میں ردیف وار غزلیات درج ہیں اور ہر ردیف کے ختم پر چند سادہ اوراق چھوڑے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس دیوان کے لئے ردیفوں کی اور غزلیں بھی کہنے کا خیال تھا۔ اس دیوان کے آغاز میں ایک مہر ثبت ہے جس میں "میر احمد علی عصر ۱۲۸۳ھ" کندہ ہے لیکن مولوی سید محمد کے کتب خانہ میں عصر کی ملکیت کی دو کتابیں ہیں۔ ان پر بھی مہر ثبت ہے اور اس میں صرف "میر احمد علی ۱۲۶۹ھ" کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دو مہریں تھیں ایک میں عصر کندہ ہے اور دوسری میں صرف نام اسلئے ممکن ہے کہ عصر نے اپنا تخلص ۱۲۶۹ھ کے بعد اختیار کیا ہو اور اسی سن کے بعد سے شاعری کو شہرت حاصل ہوئی ہو دیوان کا آغاز ایک قصیدے سے ہوتا ہے جو حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے۔ اور پھر مسلسل ردیف وار غزلیں مختلف بحور و قوافی میں مرقوم ہیں۔

عصر پر گوئی اور محاورہ بندی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ انکے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کا ایک دریا ہے کہ

بہا چلا جا رہا ہے اور حسن یہ کہ ہر محاورہ اور ضرب المثل برجستہ اور خوش آیند طریقے سے نظم ہوا ہے۔ سلاست و روانی ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جیسا کہ وہ خود بھی فرماتے ہیں ؎

رباعی

روزمرہ اور زباں ہے صاف صاف   شیر ہیں مضمون کے اشعاروں میں ہم
اُردو کے محاوروں سے واقف ہوں تمام   مملو ضرب المثل سے ہے میرا کلام
خالی نہیں اصطلاحوں سے کوئی غزل   ہوتا ہے خیال بجنبہ مغزوں کا خام

ان کے دیوان سے محاورات کا ایک خاصہ لغت تیار ہو سکتا ہے ہر ایک غزل یا رباعی میں کئی کئی محاورے اور ضرب المثل نہایت سادگی اور روانی سے نظم ہوئے ہیں جن کی چند اور مثالیں یہ ہیں۔

ہیچ ہیں ابرو کار کھو میان ہیں   رات دن رہتے ہیں تلواروں میں ہم
بھول جائیں گفتگوئے مستعار   بس جب آڑے ہاتھ تکراروں میں ہم
وامق و فرہاد اور مجنوں بھی ہیں   نامور لیکن ہیں ان چاروں میں ہم
دیں بہا ' بدلے پسینے کے ' لہو   بیوفا ' اور ہیں وفاداروں میں ہم
روکتا ہے کون شاعر کی زباں   آپ ہیں مجبور مختاروں میں ہم

عصر کا شہباز فکر فضائے تخیل میں اتنی بلند پروازی تو نہیں کرتا کہ مضمون عنقا کی طرح معدوم ہو جائے اور دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ باوجود اس سادگی کے ان کے کلام میں شیرینی اور اثر ضرور ہے۔ انتخاباً دو غزلوں سے چند شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ؎

(۱)

خدایا ان بتوں کے ہاتھ سے آئے بہت تنگ ہم   زباں ہو بند اگر کھولیں کبھی شکوے کے دفتر ہم
بصد منت بلانے سے گئے تھے جنکے شب گھر ہم   ہوئے دروازہ ہی میں دیکھ کر وہ درہم و برہم
کفن کو پھوٹی کوڑی تک نہیں آزاد رکھتے ہیں   بتائیں نام کیا مولا کہ ہیں مفلس قلندر ہم
شب غم انتظاری میں تمہاری اس طرح گذری   کبھی تھے گھر کے اندر ہم کبھی تھے گھر کے باہر ہم

ہماری شاعری کیا عصر ہم کیا سچ جو پوچھو تو
جناب فیض کے صدقے سے کہلائے سخنور ہم

(۲)

بے جا غم لیے رحم میں رویا نہ کریں گے
ہم آبروئے اشک ڈبویا نہ کریں گے

اس سرو کا وصف قدِ بالا نہ کریں گے
ہم قمری دل کو تہ و بالا نہ کریں گے

مر جائیں گے عشق بت ترسا نہ کرینگے
کھو کر یہ خدا دل کو ترسا نہ کریں گے

بیمار نگہ تیری مداوا نہ کریں گے
مر جائیں گے اس درد کا چارا نہ کریں گے

ایک شعر میں فارسی مقولے کو کھپایا ہے لیکن اس میں بھی وہی سادگی کارفرما ہے ؎

دل را بدل رہیست مثل ہے یہ آئینہ
دل میں بتوں کے شکر خدا ہم سما چکے

مٹی میں مٹی مل گئی نام و نشاں مٹا
پامال کر کے خاک ہماری اڑا چکے

ایک شعر بھولے پن سے کہہ گئے ہیں لیکن سادگی کی حقیقی تعریف اس شعر سے واضح ہو جائیگی ؎

خدا ایسا کرے وہ چھوٹ جائے
نہ دیکھے تجھ کو جو لے دلربا آنکھ

ان کا کلام جس طرح محاورے اور ضرب الامثال کا خزانہ ہے اسی طرح اپنے اندر سوز و گداز بھی رکھتا ہے۔ بعض جگہ تو یہ نہایت حزن آمیز لہجہ میں اپنا دکھ درد سناتے ہیں مثلاً ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

کیا ماجرائے زورقِ دل ہم بیاں کریں
اے ناخدا خدا ہے ہمارے جہاز کا

اے ناخدا اگر تو نے ہماری کشتی دل کو بحرِ عشق سے پار کھینے سے ہمت ہار دی ہے تو کوئی پروا نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ کشتی تو گرداب میں ہے اور ہم جاں بلب لیکن خدا سے ابھی آس نہیں چھوٹی۔

بیکسی اور مفلسی کے عالم کو کس یاس انگیز الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

جامہ گرد کو ہم اپنا کفن جانتے ہیں
نہیں محتاج کفن لاشۂ بے جاں اپنا

اس شعر میں ایک ہنگامہ محوِ خواب ہے۔ جامۂ گرد سے دشت نوردی کا اظہار کس اعلیٰ تخیل کی دلیل ہے۔ اور پھر دشت نوردی میں گرد آلود ہونا یقینی۔ شک کے بے جان ہونا اور اس حالت میں مرنا بھی بعید از قیاس نہیں۔ مرنے کے بعد

اس ویرانہ میں کفن لائے کون اور نہلائے کون۔ پھر کیوں نہ جامۂ گرد کو کفن جانیں!

معشوق سے مخاطبت ہے کہتے ہیں: — بیچے او تیرے مایۂ عشرت کون سے غم کا سامنا نہ ہوا

دستِ ستم سے کون بچا تیرے اے فلک جنت نشان تختۂ ہندوستاں تو کیا

ہنگامہ دہلی کے متعلق غالب کی ہمنوائی میں نہایت تسکین دہ پیرایہ میں لیکن پرسوز صدا میں کہتے ہیں کہ فلک نے کس ملک کو اپنے دستِ ستم سے نہ بیٹھا۔ ہندوستان کا ذکر ہی کیا ہے۔

تقریباً ہر شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے۔ اس پامال مضمون کو عصر نے ایک شعر میں نئے پیرایہ میں ادا کیا ہے

سنتے تھے کل جو رستم دستاں کی داستان عبرت کی جا ہے وہ ہوئے داستان آج

وہ لوگ جو شاہنامۂ فردوسی کو الف لیلیٰ کی داستان کی طرح پڑھا کر سنا کرتے تھے آج محوِ خوابِ دائمی ہیں " سنتے تھے " اس شعر میں خاص ٹکڑا ہے جس نے شعر میں یاس و حسرت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ایک پوری غزل نہایت پرسوز ہے اس کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

شہیدِ لب تمہارے زندہ دل ہیں خضر مرتے ہیں عمرِ جاوداں پر

کہانی کیا شبِ غم کی سناؤں انہیں نیند آ گئی میری داستاں پر

ہزاروں سودے اور اک سر ہے تقاضا سو کا ہے اس ایک جاں پر

جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہو گماں ہے شمعِ سوزاں کا زباں پر

طوافِ کعبہ زاہد کو مبارک ہمارا سر ہے اُن کے آستاں پر

ہر غزل ایک خاص رنگ میں ہے اور اس سے عصر کی نادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک شعر میں یہ مضمون کہ معشوق گھر تک آ جائے اور پھر بغیر ملے واپس چلا جائے نئی طرز سے ادا کیا ہے اسلوبِ بیان قابلِ داد ہے۔

روز گھر تک وہ مرے آ کے پلٹ جاتے ہیں الٹی تاثیر مرے نالۂ شب گیر میں ہے

اسکے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر اس کا یقین نہ ہو کہ میں آرزوئے وصل میں اپنی جان کھو رہا ہوں تو میرا دل چیر کے دیکھو

اس میں سوائے حسرتِ وصل کے کوئی اور دوسری شئے بھی خوابیدہ ہے؟

حسرتِ وصل بھری اس دلِ دلگیر میں ہے
ہو نہ باور تو ذرا چیر کے پہلو دیکھو

پھر کہتے ہیں کہ ان کا ہجر مجھے اس قدر رلا رہا ہے کہ میری آرزو کا بر آنا تو کجا خود زندگی محال معلوم ہو رہی ہے کتنے لطیف پیرایہ میں کہتے ہیں ؎

چشم تو گھر ہی ڈبو دینے کی تدبیر میں ہے
یار اتری نظر آتی ہی نہیں زورقِ دل

اس شعر میں تو چشم ابھی تدبیر کر رہی ہے کہ گھر ڈبو دیا جائے لیکن یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

آنسوؤں نے لی خبر بنیاد کی
ڈھا گئی دیوارِ تن کی الاماں

کاتبِ تقدیر نے جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے چنانچہ غالب کہتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہاں غالب کے اظہار میں شوخی ہے۔ لیکن عصر نہایت مغموم ہو کر کہتے ہیں ؎

حرف کس پر رکھوں کیا اپنا ہی رونا روؤں
وہی بھرتا ہوں جو لکھا مری تقدیر میں ہے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی نے ان کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ دنیا میں ہنسی خوشی بسر کریں۔ سب سے پہلی بات جو بظاہر معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ لاولد تھے اور اس کا غم ہی ان کو کھائے جاتا تھا۔ دوسرے دنیا کی کج روی سے وہ ایسے برداشتہ خاطر ہو چکے تھے کہ خود مجسم غم بن گئے تھے اور ہر مشکل کو آسان سمجھ لیا تھا۔ ایک شعر میں عاشقی کا انجام بتلایا ہے کہ دل تو کھو یا گیا اور باوجود تلاش سراغ ندارد۔ کہتے ہیں ؎

بیٹھے اس کوچہ میں جب خاک اڑا کر اٹھے
خاک درخاک ہوا پر نہ ملا دل کا سراغ

افلاس اور بے سروسامانی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

کفن کو پھوٹی کوڑی تک نہیں آزاد کہتے ہیں
بتائیں نام کیا مولا کہ ہیں مفلس قلندر ہم

قلندروں کے نزدیک مستقبل کی فکر گناہِ عظیم ہے ان کا عقیدہ ہے کہ خدا قاضی الحاجات ہے اور اسی سے احتیاج پوری ہوگی۔

عاشق دردِ ہجر سے تڑپ اٹھتا ہے اور مضطربانہ عالم میں پکارتا ہے ؎

دکھلاتے کب ہیں اپنا وہ رخسار دیکھئے کب حشر کا اجڑتا ہے بازار دیکھئے

عصر کے کلام میں قنوطیت بھی ہے اور رجائیت بھی تعجب ہے کہ ایک صوفی منش اور عارف ہونے کے باوجود ان کے کلام میں تفلسف اور تصوف کا رنگ بہت کم ہے۔ دیوان میں متعدد اشعار ہیں جو جوش سے لبریز ہیں اور صورتِ حال سے معمور اور شاعر کے جذباتِ باطنی کے ترجمان مثلاً یہ غزل ہے۔

لب پر شور میرا وا نہ ہوا وہ نمک پاش بے مزہ نہ ہوا
کیا ہوا کیا کہوں میں کیا نہ ہوا عصر اک کام کام کا نہ ہوا
کس کا الجھا نہ زلفِ یار میں دل کون یاں موردِ بلا نہ ہوا
وصل اس جنگجو سے مشکل ہے میں نے جی تک لڑا دیا نہ ہوا
اپنے جامہ سے میں نکل جاتا ہاتھ میں دامن آپ کا نہ ہوا

ایک اور غزل بھی اسی طرح پر جوش ہے:۔

دوزخ کا خوف ہے نہ طلب ہے بہشت کی محنت ستم کشوں کی ہوئی رائگاں تو کیا
قطع و برید پردۂ الفت کے ہوئیں گے قینچی کی طرح چلتی ہے ان کی زباں تو کیا
میٹھے ہیں منہ کے دل میں بھرا ہے تمام زہر پکوان پھیکا اونچی ہے ان کی دکان تو کیا

ایک شعر میں معشوق سے مخاطب ہیں ؎

تم ہو نازاں حسن پر اپنے تو میں ہوں عشق پر مرتبہ تم کو اگر گل کا ہے مجھ کو خار کا

یعنے تم کو حسن کی ملکیت پر فخر ہے تو میں بھی آخر اپنی دولت عشق پر ناز کرتا ہوں اگر خدا نے تمھیں ایک شئے سے ممتاز کیا ہے تو میں اس کی بارگاہ سے محروم تھوڑا ہی ہوں۔

ایک شعر میں اپنی ڈھائی گھڑی کی بادشاہی کا اعلان کرتے ہیں ؎

بندے کے حکم میں تھی خدائی تمام شب ہونے نہ پائی اُن سے جدائی تمام شب

اسی غزل میں اسکے بالکل متضاد کہتے ہیں کہ دردِ ہجر نے اتنا رلوایا کہ سیلاب اشک نے زمین و آسمان ایک کر دیا۔

تا صبح آسمان و زمیں ایک ہو گئے کی آنسوؤں نے وہ یدو درائی تمام شب

معشوق کی کم التفاتی کی تصویر کتنے بہترین پیرایہ میں کھینچے ہیں ۔

تم کیا خفا ہوئے کہ ہوئی زندگی خفا — تم کیا رکے کہ رک گیا سارا جہان آج

مضمون آفرینی رنگِ سخن کی ایک قدیم شاخ ہے جس پر ہر شاعر طبع آزمائی کرتا ہے اور نئے نئے مضامین پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عصر جو اتنے ضخیم دیوان کے مالک ہیں کیوں کر بچ سکتے۔ انہوں نے مضامین زلف نئے نئے انداز سے بیان کئے ہیں

شب ہوتے وقت آنکھوں کو زلفوں کا ہے خیال — زہریلے کالے خواب میں دو رات آئے سانپ

چھوٹتا دم بھر نہیں ہے تیرے زلفوں کا خیال — مار دو پیدا ہوئے ہیں شانہ ضحاک میں

زلف وخط کے عشق میں بعد فنا — لاش اپنی طعمہ مار و مور ہے

دوسرے شعر کا مضمون نہایت اچھوتا اور تلمیح ہے۔ تیسرا شعر زلف وخط اور مار و مور کے تناسب اور تقابل کو ظاہر کر رہا ہے اور مزید برآں بلحاظ مضمون یقیناً قابل تعریف ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

ساغر بکف اور ساقی پیکش ہو نہ ہو غیر — اس وقت اگر پوچھو تو ہیں عصر ہیں ہم

اس مضمون کو یقین نے بھی ادا کیا ہے اور خوب داد حاصل کی ہے :-

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

لیکن عصر کے شعر میں "ہیں ہم" سے جو لطف پیدا ہوا ہے اہل ذوق سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ یقین کے شعر کا مضمون زاہد کے امتحان تک محدود ہے اور عصر اس سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ایک اور شعر ہے :-

دھرا ہے ساغر مئے آگے پری ہے دل بر — اک آفتاب بغل میں ہے اک مقابل ہے

اسی مضمون کا ایک شعر جلیل کا بھی ہے۔

وصال یار بھی ہے دور میں شراب بھی ہے — قمر بھی ہے میرے پہلو میں آفتاب بھی ہے

لیکن زمانہ کی تقدیم و تاخیر کے پیش نظر عصر کے شعر کو ہر طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ہیں باخبر و شہر کے آپ ہی مصدر خطا معاف — بندہ جناب اس میں بہت بے قصور ہے

عصر نے خیر و شر کی نسبت سے اپنے آپ کو دور اور بے قصور رکھ کر تخیل کو بہت بلند کر دیا ہے۔

روح ہے، پردہ عناصر ہے — ایک قیدی ہے چار پہرے ہیں

روح کو ایک قیدی اور عناصر اربعہ کو چار پہرے کہنا اچھوتا اور لطیف استعارہ ہے ؎

ذبح کر ڈالے وہ قاتل تو میں جی اٹھتا ہوں — قم باذنی کی صدا نعرۂ تکبیر میں ہے

قتل کے وقت اللہ اکبر کہنا قم باذنی کے مترادف ہے جس سے تن بے جان میں جان تازہ پیدا ہو گی۔

حضرت عصر کے کلام پر تبصرہ بڑی فرصت کا کام ہے کسی غزل میں تیس چالیس شعر سے کم نہیں۔ ہر صنعت میں سیکڑوں شعر نظر آتے ہیں ان کے کلام کا انتخاب مختلف النوع مضامین کی وجہ سے مشکل ہے۔ ہم یہاں چند شعر مختلف غزلوں سے انتخاب کر کے درج کرتے ہیں۔

تیر جس سنگ پہ کی آپ نے شمشیر اپنی — کاش تربت کا ہمارے وہی پتھر ہوتا

ہے عصر وجودی میں شہودی میں بڑا فرق — الزام وہ دیں لاکھ میں ملزم نہیں ہوتا

اشک آنکھوں سے بہانا اک بہانا ہو گیا — طفل ابتر نے کیا مشہور راز یار کو

لاکھوں خدا نما ہیں نہیں اک خدا نما — جو پاس آپ کے ہے وہ نظروں سے دور ہے

جمع ہیں یا ہندو مسلماں لاش پر بعد فنا — گاڑنے پر وہ، یہ بیٹھے ہیں جلانے کے لئے

دل توڑتے ہو، عرش کا ڈھاتے ہو کنگرہ — پاس آپ کے ثواب، گناہ شنیع ہے

حضور کعبہ سے اب کے گیا کو جاتا ہوں — قسم خدا کی بتوں پر دل آ گیا تو ہے

دوآبہ میں خیال زلف و رخ کے دل پریشاں ہے — وہ کافر ہوں کہ رونا حال پر ہر اک مسلماں ہے

محبت ظاہرا ہم سے عداوت غائبانہ ہے — صنم اک دن تمہیں بھی تو خدا کو منہ بتانا ہے

عصر کے دیوان غزلیات میں دو قصیدے ہیں جن میں ایک چوراسی شعر کا اور دوسرا ساٹھ شعر کا۔ دونوں نواب میر وزیر علی خان آصف باور الملک کی شان میں کہے گئے ہیں جو عصر کے شاگرد تھے اور عقیدت مند بھی۔ اسکے علاوہ اشعار مخمس اور

نو مثلثات ہیں حضرت فیض کی غزل پر جو مخمس ہے اسکے تین بند ملاحظہ ہوں۔

غیر ان کے کان اگر بھرتے ہیں بھرنے دو انھیں — چھوٹی چھوٹی تہمتیں دھرتے ہیں دھرنے دو انھیں
دیکھیے کس گھاٹ اترتے ہیں اترنے دو انھیں — لیکے جان و دل کرتے ہیں مکرنے دو انھیں
مجھ پہ وہ جو جو ستم کرتے ہیں کرنے دو انھیں

دونوں لب دو برگِ گل ہیں شاخسارِ حسن کے — دونوں عارض بھی دو گل ہیں نو بہارِ حسن کے
وہ تو وہ خود تم ہو بوٹے جوئبارِ حسن کے — دونوں آنکھیں دو ہرن ہیں مرغزارِ حسن کے
کشتِ خطِ سبز اگر چرتے ہیں چرنے دو انھیں

صبر و آرام و خرد بھی پکڑے اپنا راستہ — ڈھل گیا گردن کا منکا چھوڑ دی دل نے بھی جا
مجھ کو رنجِ ہجر نے ایسا نہ و بالا کیا — جان ہے آنکھوں میں اوپر چڑھ رہا ہے دم مرا
گر وہ کوٹھے سے اترتے ہیں اترنے دو انھیں

دہلی کے آخری چراغ ظفر کی ایک غزل پر بطور مثلث جو مصرعے لگائے ہیں انہیں سے ایک بند یہ ہے۔

رکھیں نہ اہل ظرف کہیں تجھ پہ حرف دیکھ — کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانند جوش خم نہ زیادہ ابل کے چل

اسی طرح مصحفی کی ایک غزل پر مثلث ہے جس کے دو بند یہ ہیں۔

وہی دل ہے وہی بیماریاں ہیں — وہی آہ و فغان و زاریاں ہیں
وہی راتیں وہی بیداریاں ہیں

شراب عیش پیتے ہیں دمادم — وہی ٹھٹھے وہی چہلیں ہیں باہم
وہی جھجکیں وہی گل کاریاں ہیں

دیوان رباعیات ۔ اس کا مختصر تذکرہ گذشتہ سطور میں کیا جاچکا ہے۔ اس دیوان میں کل (۱۰۰۰) رباعیات ہیں لیکن

ایسے متعدد رباعیات شامل نہیں جو دیوان غزلیات میں موجود ہیں۔ دیوان حمد سے شروع ہوتا ہے جسکی پہلی تین رباعیات ذیل میں درج ہیں

اے عصر بھلا کیا ہو رقم وصفِ خدا — کوزے میں سمائے کس طرح سے دریا
دم مار سکے کوئی یہاں کیا مقدور — فرمائے رسولؐ جب کہ لا احصی ثنا

کیا بندہ کا منہ جو کر سکے حمدِ خدا — قطرے کی نمود کیا ہے پیشِ دریا
جز جل جلالہٗ کہوں کیا اے عصر — آگے واجب کے کیا ہے ممکن کا پتا

اسکے بعد نعت میں بھی دو رباعیات کہی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

اے خواجہؐ کونین رسولِ دوسرا — وے حامیٔ مجرمانِ اعلیٰ ادنا
گو اس کلمہ پہ رکھتے ہوں اہلِ کلام — میں تو یہی بولوں گا کہ ہو آپ خدا

جس نے کہ جمالِ مصطفیٰؐ کو دیکھا — بیشک وہ عالمِ بقا کو دیکھا
کہتے ہیں اسے اہلِ کمال وحق میں — جس شئے پہ نظر پڑی خدا کو دیکھا

ان دو رباعیوں کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی شان میں دو رباعیات ہیں اس سے اور انکے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ تشیع سے تھے مگر وہ خود آگے ایک رباعی میں اپنا مذہب و مشرب ظاہر کر دیتے ہیں۔

حنبلؒ مالکؒ ہے شافعیؒ بھی اکرم — شجرہ مجھ بس اپنا بتائیں کیا ہم
مذہب حنفی ہے قادری ہے مشرب — ہم عصر ہیں پیروِ امامِ اعظمؒ

عصر کی رباعیات کو مجموعی حیثیت سے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ رباعیات جن میں شوخی و ظرافت ہے دوسری وہ جن میں نصیحتیں اور پند ہیں تیسری وہ جو محاوروں سے مملو ہیں یہاں پہلی قسم کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

اپنے ہی لئے ہیں حور خلد اور قصور — قائل ہیں بزرگی کے ہمارے جمہور
کچھ ایسے ویسے گئے گذرے نہیں — دادا آدم کے ہم بھی پوتے ہیں حضور

قاضی مفتی تمام ہیں رشوت خور ۔۔۔ ام الدنیا ہیں سارے یہ دین کے چور
اندون کو دیکھ بڑبڑاتے ہیں بہت ۔۔۔ کوسے سے چماروں کے کہیں مرتے ہیں ڈھور

مندرجہ بالا رباعیاں شوخی کے ساتھ ساتھ ضرب الامثال سے بھی مملو ہیں اور آئندہ بھی متعدد رباعیاں ایسی ملینگی جو باوجود شوخی و ظرافت کے حامل ہونے کے محاورے بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں۔

بوسہ مانگوں تو کہتے ہیں آج اور کل ۔۔۔ کچھ عرض کروں تو صاف جاتے ہیں بدل
فرماتے ہیں یوں ناز سے بھلا شب وصل ۔۔۔ دشمن سوے نہ سونے دے سچ ہے یہ مثل

اندھیر یہ ہے صبح کو کہتے ہیں شام ۲ الٹا ہم کو ہی دیتے ہیں الزام
برعکس نہند نام زنگی کافور ۔۔۔ اندھے آنکھوں کے ہیں روشن نام

دل عصر بتوں نے لے لیا ہے اب تو ۳ کعبہ جسے سمجھے تھے گیا ہے اب تو
یارائے سخن نہ دم زدن کا موقع ۔۔۔ پتھر کے تلے ہاتھ دبا ہے اب تو

گیا وہ مقام ہے جہاں گو تم بدھ پر انوار الٰہی کا پرتو پڑا اور مہاتما گوتم اسی دن سے روشن ضمیر کہلانے لگے۔

سر پر آسماں گرا رہا ہے مہ رو ۔۔۔ دن کو تارے دکھا رہا ہے مہ رو
کیوں پر کے کبوتر نہ وہ گھر پر اڑوائیں ۔۔۔ بے پر ہم کو اڑا رہا ہے مہ رو

دوسرے حصے میں ہم نے پند و نصائح کو رکھا ہے۔ پند و نصائح کا خاصا دفتر ہے۔ عصر نے متعدد رباعیات ایسی کہی ہیں جو نصیحتوں سے پُر ہیں۔ اس میں اخلاق و کردار کو درست کرنے کا بھی درس دیا گیا ہے۔ ان رباعیات میں بھی محاورے اور ضرب الامثال کثرت سے ملیں گے اگر ہم دیوان رباعیات عصر کو گنجینہ ضرب الامثال کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

سیدھے ہیں ستم شعار اہل دنیا ۔۔۔ مطلب کے ہوشیار اہل دنیا
ہیں نام کے دوست کام کے ہیں غرضی ۔۔۔ اپنے گوں کے ہیں یار اہل دنیا
باقی ہے دین اور فنا ہے دنیا ۔۔۔ اک چشم زدن میں بس ہوا دنیا ۔۔۔ کیوں مزرع آخرت نہ ہم نے سمجھا ۔۔۔ کیسی امید ہے سنا ہے دنیا

متعدد رباعیات ایسے بھی ہیں جن میں عصر نے فارسی کے یا تو محاورے باندھے ہیں یا عموماً سعدی کی گلستاں یا بوستاں کے مصرعے اخذ کر لئے ہیں مثلاً :۔

سیدھوں ہی سے رہتا ہے زمانہ ٹیڑھا　　جمع خاطر نہ ہو پریشان ذرا
دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست　　بے حکم خدا بھی ہل نہیں سکتا پتا

اینک تو انھوں نے نصیحت کی نصیحت کیا کی بلکہ ایک درس دیا لیکن اب مخاطب ہو جاتے ہیں ۔

پہچان تو نیک آدمی کا رتبہ　　اور صحبتِ جاہل سے تو اپنے کو بچا
کر کارِ خیر میں تو بہت جد و جہد　　کہنے میں تو عورتوں کے مت جا

مولا میرے یہ بھی ہے فقیری نکتہ　　باطن رکھے ظاہر سے زیادہ اچھا
ظاہر ہے نظر گاہِ خلائق صوفی　　باطن ہے نظر گاہِ خداوند علاؔ

علم کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے ۔

اک سائل نے کیا علی سے یہ سوال　　فرمائیے تو، علم افضل ہے یا مال
فرمایا کہ مال علم سے ہے افضل　　یہ ارشادِ پیمبراں ہے وہ ارثِ جہال

ہے قول ابو سعید یہ آئینہ　　ان دس چیزوں سے صاف رکھ سینہ
حرص و امل و قہر و دروغ و غیبت　　بخل و حسد و کبر و ریا و کینہ

غرض اسی طرح پچاسوں رباعیات ہیں جو اخلاق سکھاتی ہیں اب محاورے جن رباعیات میں بکثرت استعمال کئے گئے ہیں ان کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ "جس کو پیا چاہے وہ سہاگن" ضرب المثل استعمال کی گئی ہے ۔

واعظ کو تو ہے اپنی ریاضت پہ گھمنڈ　　زاہد کو بھی ہے اپنی عبادت پہ گھمنڈ
جس کو پیا چاہے وہ سہاگن کہلائے　　عاصی رکھتے ہیں اس کی رحمت پہ گھمنڈ

اسی طرح متفرق محاورے اور ضرب الامثال استعمال کئے گئے ہیں جن کو مسطور کر دیا گیا ہے ۔

کھارے ہو کر کریں میٹھی چھری سے وہ حلال ۔۔۔ دکھلائیں جمال میں بھی وہ لاکھ جلال
قدموں سے نہیں ہم تو سرکنے کے حضور ۔۔۔ ناخن کا جدا گوشت سے ہونا ہے محال

اشرافوں سے آپ کو نفرت ہے کمال ۔۔۔ صحبت میں رہا کرتے ہیں اکثر ارذال
دلتے رہتے ہیں مونگ چھاتی پہ غیر ۔۔۔ دن رات بٹا کرتی ہے جوتی میں دال

روتا ہوں تو کہتا ہے وہ شمع محفل ۔۔۔ شعلہ سا بھڑکتا ہے بجھا دیکھ کے دل
ہے جائے خموشی نہ تو یارائے سخن ۔۔۔ گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

دانا ہو اگر تو باتیں واہی نہ کرو ۔۔۔ نادانوں کے ساتھ بیٹھے ہاہی نہ کرو
ٹوٹے ہیں آپ کے ابھی دودھ کے دانت ۔۔۔ منقے ہو اڑھائی دن کی شاہی کرو

کعبہ جاؤ نہ رب کعبہ سے ملو ۔۔۔ روشن دل کا دیا تو کر کر دیکھو
مشہور ہے بعد خویش کے ہی درویش ۔۔۔ پہلے گھر میں تو بعد مسجد میں سنو

رکھتے ہو اگر عقل تو سمجھو سوچو ۔۔۔ منہ ڈال گریبان میں کیا بیٹھے ہو
بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو صاحب ۔۔۔ آتا نہیں پھر ہاتھ گیا وقت سنو

جھوٹی جھوٹی قسمیں کھاؤ میٹھے ۔۔۔ سرسوں نہ ہتھیلی پہ جماؤ بیٹھے
کاوے یہ ہے توسن طبیعت سرکا ۔۔۔ گھر میں نہیں میدان نہ بتاؤ بیٹھے

یہ ہے بالکل سرسری انتخاب جو عصر کے کلام سے لیا گیا ہے عصر کے معلومات اور ان کا محاوروں پر عبور اس سے صاف ظاہر ہو سکتا ہے۔ غرض عصر کے متعلق بہت کچھ لکھنا تھا لیکن اجمالی خاکہ میں ان کے تمام خصوصیات جمع ہونے مشکل ہیں اگر ان کے وہ دواوین جو ہنوز گمنامی میں ہیں طبع ہو جائیں تو کسی اور موقع پر ان کو تفصیل کے ساتھ منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔

نواب فیاض الدینخاں مشرف جنگ فیاض

از

سیّد ابوالفضل صاحب بی۔ اے

متعلم ایم۔ اے



نواب مشرف جنگ بہادر فیاضؔ

نوابؔ فیاض الدینخاں مشرف جنگ فیاضؔ

گذشتہ زمانہ میں دکن کے اکثر وبیشتر امراء علم پروری اور ذوقِ شعروسخن میں ایک دوسرے سے پیش پیش رہنے کی کوشش کرتے تھے اور اس خصوص میں جن معززین نے اپنی زندگیاں شغلِ علم اور ذوقِ سخن میں صرف کیں اور ہمیشہ شاعروں اور اہلِ علم کی قدر فرماتے رہے ان میں نواب محمد فیاض الدینخاں مشرف جنگ فیاضؔ کے نام نامی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

ان کے جدِ اعلیٰ محمد سلطان الدینخاں کا تعلق پیشوایان سلطنت پونہ سے تھا انکی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے پنڈت پردہان والیٔ پونہ نے انہیں " ماموں" کا خطاب دیا تھا جس کے یہ معنی تھے کہ انکی شخصیت والیٔ پونہ کے ماموں کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ محمد سلطان الدینخاں " ماموں" کے دادا محمد ابراہیم الدین خاں بہادر کو حضرت آصف جاہ اول کے ہمرکاب رہنے کا شرف حاصل تھا۔ محمد سلطان الدین خاں صاحبِ علم وفضل اور ذی خلق انسان تھے۔ اُن کی فوجی خدمات بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے دکنی افواج کے اعلیٰ امتیاز کرنے والوں میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن وہ اپنے دو بھائیوں (محمد بدیع الدین خاں اور محمد ہاشم الدین خاں) کی شہادت سے برداشتہ خاطر ہو کر پونہ چلے گئے پھر کچھ عرصے کے بعد حضرت آصف جاہ ثانی کے ایماء وطلب پر پونہ سے واپس آکر بانکل، سرنگ پٹن اور شورا پور وغیرہ کے محاصروں میں بہ حیثیت افسر سواران شاہی آقائے نعمت کے ہمرکاب رہے۔

ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادوں محمد قائم الدین خاں بہادر اور محمد دائم الدین خاں بہادر کے نام ان کے آبائی حقوق منتقل کردئے گئے۔ اسکے علاوہ صوبۂ برار میں جاگیرات بھی عنایت کی گئیں۔ محمد قائم الدین خاں کے فرزند محمد عزیز الدین خاں کے زمانہ میں صرف منصبی معاش قائم رہی۔ انہیں کے اکلوتے فرزند محمد فیاض الدین خاں مشرف جنگ فیاضؔ ہیں۔

فیاضؔ کا خاندانی سلسلہ ایک طرف دربارِ پونہ کی ایک جلیل القدر ہستی سے ملتا ہے تو دوسرا یعنی ننھیالی ٹیپو سلطان

والی میسور تک جا پہنچتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قدیم اور معزز خاندان میں ایک طرف فوجی عنصر کا امتزاج تھا تو دوسری طرف علم و فضل کا۔ اسی لئے اس خاندان کے بیشتر اراکین ایک طرف میدان رزم کے شہسوار تھے تو دوسری جانب محفل ادب اور مجلس علم کے علمبردار۔

نواب مشرف جنگ فیاض کا بھی یہی عالم تھا۔ وہ اپنے سینے میں ایک حق گزار اور آزاد دل رکھتے تھے علم و ادب سخن گوئی و سخن فہمی ان کے گنجینۂ دماغ کی کائنات تھی۔ اگرچہ انھیں اپنے اجداد کی طرح سپاہیانہ جوہر دکھانے کے مواقع نہیں ملے لیکن زندگی بھر وہ ممتاز سیول عہدوں سے سرفراز رہے۔

فیاض کے خاندان کے تفصیلی حالات متعدد کتب مثلاً "منظر الکرام" "تزک محبوبیہ" "تاریخ النوائط" "تذکرہ شعرائے دکن" وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں اسلئے یہاں صرف انکی شخصیت اور زندگی کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائیگی جو خاص علم و فضل اور شعر و سخن سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ ۱۲۵۰ھ میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور دار العلوم میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اسوقت یہ مدرسہ علوم السنہ مشرقیہ اور مذہبی تعلیمات کا واحد ادارہ اور حیدر آباد کے معززین و امراء کی اولاد کی بہترین تعلیم گاہ تھا۔

اُس زمانہ کے دستور کے مطابق فیاض نے مشہور اساتذۂ وقت سے بھی عربی، فارسی اور دیگر علوم کی تکمیل کی اور خداداد ذہانت کی بدولت (جس کا اکثر مورخین کو اعتراف ہے) ان کی عربی قابلیت اور فارسی مہارت مسلمہ ہو گئی چنانچہ مدت تک مدرسہ زماں خاں شہید و مدرسہ منصبداران کے نصاب تعلیمی اور انتظام کا تعلق انہیں سے رہا۔

انکا ذوق شاعری اکتسابی نہیں بلکہ مبدء فیاض کا عطیہ تھا۔ فیاض اس جذبہ کو کیونکر روک سکتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہر اک فن کی تکمیل کیلئے رہبر کی بھی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ متعدد علوم میں دسترس حاصل ہونے کے باوجود بھی وہ فن شعر کی تکمیل کیلئے مضطرب رہے اور انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے سخن سنج و سخن فہم اساتذۂ وقت کی طرف توجہ کی۔

اس وقت دکن میں حضرت شمس الدین فیض کی اہلیت کا شہرہ ہو رہا تھا اور یہ شہرت نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ اساتذۂ وقت میں سب سے وسیع دائرہ تلمذ انہی کا تھا۔ حضرت فیاض نے بھی انہی کی شاگردی کا فخر حاصل کیا

اوران کے پاس شعروسخن کی جتنی محفلیں ہوتیں فیاض ان سب میں شریک ہوتے۔

"محبوب الزمن میں عبدالجبار خاں صوفی رقمطراز ہیں کہ:۔

"کتب درسیہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو شعرگوئی و سخن سنجی کا شوق دل میں پیدا ہوا آپ کی طبیعت میں موزونیت خداداد تھی اور چستی وچالاکی بھی طبیعت کا جزو اعظم۔ ہم عصروں میں آپ کی ذہانت و فطانت مسلم الثبوت تھی۔ آپ نے زور فطرت سے شعر کہنا شروع کیا۔ جناب فیض کی خدمت میں اصلاح لیتے رہے اور چند سال تک مشق کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ استاد کی فیض صحبت اور توجہ کی برکت سے آپ کا کلام شستہ وپختہ ہوگیا۔ رفتہ رفتہ آپ درجۂ استادی کو پہنچے اور اکثر شائقین آپ کی خدمت میں مستفید ہوتے تھے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ فطرتی جوش اور طبعی مناسبت ان کی شاعری کے جزو اعظم ہیں اس زمانے کے قاعدے کے مطابق نوآموز شاگردوں کے کلام پر اصلاح استاد کی بجائے ان کے ممتاز شاگرد ہی دیا کرتے تھے جن کی نامزدگی استادہی کے ذریعہ عمل میں آتی تھی چنانچہ فیض کے ممتاز تلامذہ میں مزاج، عصر، پاس اور فیاض ہیں جن کے ساتھ ہمیشہ نومشق شاعروں کی جماعتیں رہا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب "محبوب الزمن" نے فیاض کو اساتذہ کی فہرست میں داخل کرلیا ہے۔ لیکن ان کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اصلاح سخن میں صرف کریں اس میں شک نہیں کہ فیض کے انتقال کے بعد بیشمار ایسے نومشق شعراء موجود تھے جن کے کلام کی اصلاح انہوں نے ازراہ عنایت و علم دوستی اپنے ذمہ لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی ہر مجلس اور ہر محفل میں متعدد اشخاص ایسے نکل آتے جن پر اصلاح سخن یا کسی اور سلسلے میں حضرت فیاض کی نظر عنایت ہوتی۔ وہ متوسط قدوقامت کے وجیہہ انسان تھے جسم گٹھیلا تھا۔ ورزش جسمانی اور سپاہیانہ مشاغل سے بھی ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے زمانے کے امراء و شرفاء کے لباس ہی میں ملبوس رہا کرتے تھے۔ خوش خط تھے۔ میں نے انکی بعض تحریرات دیکھی ہیں جو ان کے فرزند نواب عزیز یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ بعض شکستہ اور بعض نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ طرز تحریر سے بھی عالمانہ شان واضح ہے۔

حضرت فیاض کی زندگی تکلفات سے مبرا تھی۔ سیدھے سادے اور آزاد منش انسان تھے۔ بزرگان دین سے

انھیں بڑی عقیدت تھی کم سخن، متواضع، مستغنی المزاج اور بردبار تھے۔ وضعداری کی جو شان انہوں نے ابتداء سے اختیار کی تھی آخر تک باقی رہی چنانچہ عبدالجبار خاں "محبوب الزمن" میں تحریر کرتے ہیں:۔

"مولف فقیر ۱۲۸۶ھ میں طالب علمی کی حالت میں مولوی محمد زماں خاں شہید مرحوم کے مکان پر فروکش تھا اس وقت آپ کو دیکھا تھا۔ پھر جب سنہ ۱۳۰۱ھ میں سیاحت ہند سے شہر حیدرآباد میں آیا آپ کو دیکھا بجنسہ اسی لباس میں صورت میں پایا۔ طرز و روش میں ذرا بھی فرق نہیں تھا .... آپ کا استقلال و وضع کی پابندی تحسین کے لائق ہے۔"

حضرت فیاض کے دل میں ہمیشہ سچی ہمدردی اور اخلاص و محبت کا دریا موجزن تھا۔ چونکہ انکی عنایات و نوازشات کا سلسلہ طبقۂ شعراء یا سخن سنج محفلوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اول مددگار معتمد صرف خاص مبارک پیشی اعلیحضرت بندگان عالی ہونے کی حیثیت سے بھی انہوں نے عدیم المثال شرفا پروری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے ماتحتین عہدہ داروں سے لیکر محکمے کے ملازمین تک ان کے محاسن اخلاق کے مدّاح تھے۔ ہم عصروں کی سوسائٹی میں ان کی بے حد قدر و منزلت کی جاتی۔ وہ اعلیحضرت غفران مکاں کے دربار میں بھی رسوخ رکھتے تھے اور امراء عظام اُن کا احترام کرتے تھے۔

اس امر کا ذکر آچکا ہے کہ فیاض اپنے ہم عصر شعراء کی ہمت افزائی مختلف طریقوں سے کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہر جمعہ اپنے مکان پر شعراء اور سخن فہم اصحاب کو مدعو کیا کرتے۔ یہ علمی مجلسیں ان مشاعروں کے علاوہ تھیں جو حضرت فیض کے انتقال کے بعد اُن کے زیر سرپرستی ہوا کرتے تھے۔ صبح سے شام تک علمی مشاغل جاری رہتے۔ اچھی خاصی دماغی ورزش ہوجاتی۔ قابل لوگوں کو اپنے جوہر دکھانے کے خوب خوب مواقع ہاتھ آتے۔ زندہ دلی کا یہ عالم ہوتا کہ غمگین سے غمگین شخص بھی مسرت و ابتہاج کی موجوں میں بہا چلا جاتا حتیٰ کہ جب یہ مسرور مجمع منتشر ہوتا تو کسی کے دل میں غم کا شائبہ تک باقی نہ رہتا۔ سب کے لئے پرتکلف کھانے کے انتظام کے علاوہ ہر شخص کی دلجوئی کا ہر طرح لحاظ رکھا جاتا۔

اس زمانے کے مشہور شعراء میں جو ممتاز اصحاب عموماً ہر مجلس میں شریک رہا کرتے تھے ان میں حکیم مظفر الدین خاں معزاج، میر احمد علی عصر، سینل پرشاد خرم (جو مادۂ تاریخ نکالنے میں بہت مشہور تھے) رائے بہاری لال رمز جن کا آخر زمانہ میں

جذب کی کیفیت طاری ہوگئی تھی) سخنور، میر احمد علی فاضی، مطلب، میرزا قاسم علی بیگ اخگر وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان میں صرف آخر الذکر بقید حیات ہیں جو فارسی ادب کے زبردست ماہر ہیں اور ان پر فیاض کی خاص نظر عنایت رہا کرتی تھی۔

ایک شعر میں حضرت فیاض اپنے ان ہم عصر شعراء کی یاد تازہ کرتے ہیں جو حضرت فیض کی بارگاہ میں بھی موجود رہا کرتے تھے:-

تھے بزم فیض میں یہی دو چار خاص خاص
عصر و مزاج و فاضی و مطلب کہاں ہیں اب

فیض کے انتقال کے بعد فیاض ہی نے ان کے سالانہ عرس کی تقریب کا انتظام اپنے ذمہ لیا۔ اسمیں عوام کو پر تکلف دعوتیں دی جاتیں اور ہر سال باقاعدہ شاندار مشاعرے ہوا کرتے۔ جن میں قدیم مشاعروں کی طرح ہر شاعر کے ساتھ اس کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی ہوتی تھی۔ نو مشق شعرا اپنے اپنے اساتذہ کے ایما پر پہلے خود غزلیں پڑھا کرتے۔ اسکے بعد اساتذہ کی باری آتی اسمیں بھی مدارات اور عزت و احترام کا سلسلہ جاری رہتا اور اس بات کی پوری پوری احتیاط کی جاتی کہ بزرگوں کے سامنے کسی قسم کی بے ادبی یا لغزش نہونے پائے۔

ان مشاعروں میں صدارت کا طریقہ نہ تھا لیکن انتظامی حیثیت سے حضرت فیاض ہی مشاعرے کے روح رواں ہوتے
ان مشاعروں میں نواب آصف یاور الملک وذیر جو اعلیٰحضرت غفران مکاں کے بہنوئی تھے) اور مہاراجہ سرکشن پرشاد وغیرہ جیسی شخصیتیں بھی موجود رہا کرتیں اور ان کی غزلیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ حضرت فیض کے جملہ شاگرد اور ان شاگردوں کے شاگردوں تک بھی بہ پابندی موجود رہتے۔

بیرونی شعرا میں فصاحت جنگ جلیل، اختر یار جنگ اختر، حبیب کنتوری، نظم علی حیدر طباطبائی، شفیقہ کنتوری، ترکی (جو کشمیر کے رہنے والے تھے) ظہیر دہلوی، خورشید عالم خورشید (جو حضرت داغ کے بھائی تھے) سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی (جو حضرت داغ کے داماد تھے) وغیرہ معہ تلامذہ لازماً شریک ہوا کرتے۔ اور یہ مشاعرہ حضرت فیض کے سال وفات (۱۲۸۳) سے حضرت فیاض کے سال رحلت (۱۳۲۸) تک ہر سال نہایت آب و تاب سے منعقد ہوتا رہا۔

دکن کی شاعری میں مشاعرہ فیض میں شرکت کرنے والے اساتذۂ سخن کو خاص اہمیت حاصل ہے سینکڑوں شاعر اپنی اپنی خاص رنگ میں نزاکت تخیل کے لطیف ترین نمونے قدر دانان سخن کے سامنے مصرعہ طرحی پر پیش کرتے اور خوب خوب

داد پاتے تھے۔ یہ جلسے مہینی خوشی برخواست ہوا کرتے اور انکی دلچسپی یہیں ختم نہیں ہو جایا کرتی تھی بلکہ حضرت فیاض ان میں سے منتخب شدہ غزلیات کو ایک دلفریب گلدستے کی شکل میں طبع کرانیکا انتظام فرماتے۔ یہ "گلدستۂ فیض" بعد طبع شعراء اور احباب میں مفت تقسیم ہوتا۔ ان گلدستوں کی ضخامت عموماً سو ڈیڑھ سو صفحات تک ہوا کرتی جس میں شعراء کے پاکیزہ ترین کلام کا انتخاب ہوتا۔ اسی مشاعرہ میں دکن میں غالباً پہلی دفعہ سائلؔ دہلوی نے لَے سے اپنا کلام سنایا۔ لیکن یہ طریقہ حیدرآباد کے اساتذہ میں مقبول نہیں ہوا۔ وہ اب تک برابر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ البتہ آجکل بعض نوجوانوں نے لَے سے پڑھنا شروع کردیا ہے۔

اردو شاعری کی ان بیش بہا خدمات کے علاوہ حضرت فیاضؔ نے نثر نگاری اور فنون کی ترقی کی طرف بھی کچھ کم توجہ نہیں کی۔ وہ فارسی زبان میں بھی شعر کہا کرتے تھے لیکن کم۔ علم حساب کے زبردست ماہر تھے چنانچہ طالبان علم کی سہولت اور اعانت کے لئے انہوں نے چار کتابیں علم ریاضی سے متعلق تصنیف کیں۔ ان میں ایک کا نام "قواعد کلیہ" دوسری کا "غرائب حسابی" تیسری کا نام قطاع اور چوتھی تشریح المساحت ہے۔ "قواعد کلیہ" ۱۲۸۵ھ میں شائع ہوئی۔ یہ اسی صفحات پر مشتمل ہے جس میں پانچ مختلف ابواب ہیں جن کی تفصیل خود مصنف نے اپنے دیباچہ میں اس طرح بیان کی ہے:—

> می گوید ذرہ بمیقدار محمد فیاض الدین متخلص فیاضؔ زلہ ربائے مایدہ ہدایت جناب استاد الحکماء ماہر رموز فروع و اصول واقف علوم معقول و منقول مطاعنا حافظ مولوی میر شمس الدین متخلص فیضؔ بسط اللہ ظلال فیوضہ کہ این رسالہ ایست مختصر در چند قوانین مستنبط از علم حساب مسمی بہ "قواعد کلیہ" و مرتب شد در سن یکہزار و دوصد و ہشتاد و سہ ہجری بپاس خاطر چند احباب مشتمل بر مقدمہ و پنج باب۔ باب اول در قواعد استخراج مجہولات قیمت اشیاء۔ باب دوم در قواعد استخراج مجہولات تعداد اشیاء۔ باب سیوم در قواعد استخراج مجہولات مشاہرہ سال و ماہ و روز۔ باب چہارم در قواعد استخراج سود ایام و منڈاون وغیرہ۔ باب پنجم در قواعد استخراج محاصل مجہول زمین وغیرہ باد و جدول معرفت ماہوار و سود ایام"۔

دوسری کتاب "غرائب حسابی" ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اڑتالیس صفحات کا ایک اردو رسالہ ہے جس میں پہلے ایک سو ایک سوالات لکھے ہیں اور آخر میں خود انکا حل اور جوابات بھی درج کئے ہیں۔ اس کتاب کو مصنف نے نواب

مختار الملک سالار جنگ اول کے نام پر معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں سے دو سوالات اور ان کے جوابات بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت فیاض نے صغیر سن طلبا میں حساب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے کیسی دلچسپ کتاب تالیف کی تھی۔

سوال "چند آدمی ایک باغ میں گئے۔ پہلے شخص نے ایک سیب توڑا۔ دوسرے نے دو اور تیسرے نے تین اسی طرح سبھوں نے سیب توڑے اور باہر آکر علی السویہ آپس میں بانٹ لئے تو ہر ایک کو سات سات سیب ملے پس وہ کتنے آدمی باغ میں گئے تھے اور کتنے سیب توڑے گئے۔

جواب۔ وہ تیرہ آدمی تھے جو باغ میں گئے اور کل ۹۱ سیب توڑے۔

سوال۔ دو طالب علم ایک کتاب کے خریدار تھے پہلے نے کہا اگر تہائی تیری جمع کی میری جمع میں شریک ہو تو میں اس کتاب کی خریداری کروں دوسرے نے کہا اگر چوتھائی تیری جمع کی میرے پاس اور ہو تو میں یہ کتاب خرید لوں۔ کہئے تو اس کتاب کی کیا قیمت تھی اور ان دونوں کے پاس کتنے کتنے روپے تھے۔

جواب۔ پہلے طالب علم کے پاس ۸ روپے اور دوسرے کے پاس ۹ روپے تھے اور کتاب گیارہ روپے کی"

"کنز النظر الیف" بھی بچوں کیلئے تحریر کی گئی تھی جو اخلاقی نکات اور موعظات سے معمور ہے اسکے علاوہ اقلیدس کی مفید معلومات کو "قطاع" کا جامہ پہنایا۔ کنز النظر الیف فارسی زبان میں ایک سو بیس صفحات کی کتاب ہے جو مولف کے فرزندان عزیز الدین خاں (حال نواب عزیز یار جنگ بہادر) اور کریم الدین خاں کی طرف سے مطبع گلزار دکن میں ۱۳۰۱ھ میں چھپی ہے اسکے آخر میں اس عہد کے مشہور شعرا حکیم مظفر الدین خاں مزاج، حکیم منور الدین خاں علاج اور مولوی میر احمد علی عصر کے قطعات تاریخی بھی درج ہیں۔ اس کتاب میں اکثر نہایت دلچسپ لطیفے جمع کئے گئے ہیں جن کے مطالعے سے عربی اور فارسی علم و فضل اور شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ بطور نمونہ چند لطیفے یہاں درج کئے جاتے ہیں"

"چوں مولوی باقر آگاہ بر کلام غلام علی آزاد چہار صد ایراد نوشتہ و آزاد بلگرامی با مولوی در مناظرہ بر نیامدہ بمکابرہ آوردہ این بیت نوشتہ فرستاد۔ شعر۔

آزادم من از نسلِ حسین ابن علی ام — ہرکسکہ درآویخت بمن نسل یزید است

مولوی آغا و بعد مطالعہ تبسم کرد و گفت "ما آزاد را از سادات میدانستیم او مقر بعدم سیادت خود است کہ میگوید من از نسل حسین ابن علی آزادم۔"

"روزے در مذاکرہ این و آن نواب سعادت علی خاں بہادر گفتند کہ ہجر بالفتح ہم درست است۔ جان بیلی صاحب رزیڈنٹ گفت کہ خلاف محاورہ است نواب جواب دادند کہ اگر باعتبار لغت درست باشد در استعمال چہ مضائقہ۔ دریں اثنا سید انشاء اللہ خاں حاضر شدند۔ صاحب موصوف بطرف ایشاں مخاطب شدہ پرسیدند کہ شما چہ می گویید لفظ ہجر بالفتح است یا بالکسر۔ چون ایشان از مباحثہ ماسبق واقف نبودند گفتند بالکسر و معاً روئے نواب دیدہ از قیافہ دریافتند و عرض کردند کہ حضور بہمیں سبب حافظ علیہ الرحمۃ می فرمایند۔ شعر

شب وصل است طے شد نامۂ ہجر — سلامٌ ہِیَ حتّٰی مطلع الفجر

باستماع ہذا نواب و اہل دربار ہمہ شگفتہ و محظوظ شدند۔

"روزے غلام مصطفیٰ صاحب سخن کہ از مشاہیر وقت بود از حضرت استاد العصر مولانا حافظ میر شمس الدین محمد فیض رحمۃ پرسیدند کہ چہ حکمت است کہ در قرآن مجید کلمہ رحمت و نعمت خلاف رسم الخط عرب چند جا تائے دراز نوشتہ شدہ ہمچو رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، وَرَحْمَتُ رَبِّکَ خَیْرٌ، وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا، وَاشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ و بنائے مدور مرقوم نگشتہ فرمودند حکمتش علیم حکیم عزوجل و حبیبش صلی اللہ علیہ وسلم میدانند گر من از طرف خود میگویم در ینجا لفظ رحمت و نعمت مضاف بسوئے اللہ و رب شدہ گو باعزت حق سبحانہ نہ پسندید کہ رحمت و نعمت خود بسبب تاء مدورہ در قلت اعداد شمردہ شود لہذا بتائے دراز مرتسم گشت کہ کثرتش محسوب و معلوم عباد گردد۔"

ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ عمر خیام کی رباعیات کو یورپ و ایشیا کے متفرق مجموعوں اور نسخوں سے جمع کر کے ۱۳۱۱ھ میں چھپوایا جس کی ابتدا میں اٹھائیس صفحات کا ایک بسیط مقدمہ عمر خیام کے حالات زندگی

اورخصوصیات رباعیات پر تحریر کیا ہے ۔ اس مقدمہ کا کچھ حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے فیاض کی مصروفیات، علمی ذوق اور وسعت مطالعہ کا کچھ حال معلوم ہوگا ۔

"بندۂ ہیچمدان محمد فیاض الدین خاں فیاض کہ بغازہ کشئ شاہد ترتیب ابکار افکار حکیم ہمام عمر خیام دست کشادہ و بخط و خال آرائی لیلیٰ ادایان رباعیاتش سواد سواد مردم دیدۂ تامل را گداز دادہ است از آویزش تعلقیست کہ دریں عالم صوری بخدمت مددگاری صاحب نظر بلند نگاہ آفاق سید محمد عبدالرزاق خاں بہادر المخاطب بہ آصف نواز الملک و معتمد دفتر خاص خداوند اعلیحضرت نواب میر محبوب علیخاں بہادر چہرۂ روزگار را بہ گلگونۂ اعتبار برافروختہ و از سلسلہ آرائی تعلقات خدمت منسوبہ اہتمام مطبعی کہ منتسب بہ صرف خاص و بقبضہ اختیار این ہمیقدار نیاز اختصاص است ۔ روزے ہنگام جولانگاہ یعنی مشاہدۂ اوراق کلام خیام طبع نیرنگی جوی این دلدادۂ ادائے سخن بایں حسن بیرنگ رام تسلی نگردید و جمالش پئے حلی بند صحت دیگر چشم درخور تماشا نپسندید ۔ ہرچند کہ سابق آغا نصر اللہ خاں بہادر متخلص بہ فدائی المخاطب دولت یار جنگ در عرصۂ تصحیحش رخش فکر انداختہ و در پست و بلند مقام سخن بے نفس گداختہ بود اما بوجہ ترک اہتمام و کار مطبع این تصویر مقاصد را اکازہ گذاشت و دست توجہ ازین کاہش باز داشت ۔

لاجرم باتمام آں دست سعی از آستین ارادت بیروں آوردم و از چندیں نسخہ جات کہ بخط و خال اختلاف صوری در مجالس ارباب نظر جلوۂ اعتبار داشت بہ تسلی نگاہ شوق خوش کردم ۔ ہر گل مضمونے و رنگے داشت و ہر غنچۂ مطلبے بوئے تازہ بمغز و دل میگذاشت ۔ حسن تزئینش از اختلاط حسن عرضی بعالم حیرت میکشید و عقل زنگ آمیز صورت و ربط معانی محال می اندیشید ۔

.... یکیے ای ۔ ایچ ونفیلہ سابق بنگال سیول سرویس ست کہ بدامن زنی کمر ہمت جز پانصد رباعی دستگاہی دیگر بعرض نیاورد، و از معائنہ امتزاج و اختلاط دیگر کلام بکلام خیام فرق بین والمودن ناممکن شمردہ از سرکشیدن خار غلطی لفظی و معنوی، ہرقدر آگار دلخراشی کہ در بہارستان کتب قلمی

ومطبوعه هند وترجمه های انگریزی وافرنجی دوربانش ے نمود و فکر انتخاب آسنوی خیال بر مید........

گرم او عرصه تحقیق کلام خیام مترجم انگریزی که بفراهم آوردن کلام خیام سمند تلاش را در مضمار روزگار جولان داده است در دیباچه تالیف خویش اساس سخن چنان نهاده که به نسخه جات رباعیات خیام که در سرزمین بنگاله چشم کشادم در یکی منقولات نسخه ایشیاٹک سوسائٹی را مثنوی بیشتر رباعیات دیدم و دو تا نسخه قلمی کتب خانه هند ونسخه که در مطبع کلکته بقالب طبع در آمده بسراپای آن شده واکردم. هر یکی را در جلوه ترتیب کلام از دیگرے بیگانه یافتم و نیرنگی این اختلاف دست بر دل می گزارد که این شاهدان رنگین جلوه از آئینه تالیفات خیام چهره کشوده باشند........ ونسخه جات قلمرو ایران با نسخه قلمی بود که در سنه هشت صد و شصت و پنج هجری در شیراز سوادش برگرفته اند وبطهران رنگ طبعش ریخته ونقش ثانیش با لیوزنیکو در پس در ناسب بر انگیخته روے حیرت می کشاید وارباب نظر را از نیرنگی ادائے خویش پریشانی می افزاید وچندیں نسخه جات قلمی اوده.......... بخط وخال آرای نسخه کیمبرج جو هر سعی بعرض رسانیده اند........

از معائنه هر نسخه که در ترتیب مختلف است گو هر هیں تحقیق بدست می افتد که خاندان عهد لیس را خیام بجو یائے شرامی آرد چنانچه نسخه قلمی کهنه بود که یک صد و پنجاه و هشت رباعیات مثنوی دیده اند و دو تا نسخه جات پیرس که رنگ تحریرش در سنه یکهزار ریخته اند یک صد و هفتاد و پنج رباعیات موشح گردیده است و دیگرے بتعداد دو صد و سیزده رباعی رسیده.

ونسخه در کتب خانه کیمبرج گزاشته اند وازخط اطان روزگار حال صورت ترتیب گرفته هشت صد و یک دانه گوهر ہائے رباعیات در سلک تحریرش انسلاک پذیرفته.... که بسیار نسخه جات را پیدا فراهم وبنظر شوق معائنه کرده حرف می زند که زاده ہائے طبع خیام را در پیرایه تعداد یک هزار و دو صد رباعی دیده ام........ الحاصل ای. ایچ ونفیلد سیول سرول بنگال مترجم رباعیات خیام و پنجصد الی آبدار رباعیات ہائے خیام را در سلک انتخاب کشیده و جے. بی. نکولا قونسول یعنی سفیر دولت فرانسه چهار صد و شصت و چهار جواهر پاره

معدن خیال خیام برجیدہ و برنار دکوانچ ..... بنام پکاڈلے نشان ۱۵ شہر لندن ترجمہ کیمبد ویک باعی بقالب زبان انگلش کشید و و در مطبوعہ واقع لکھنو تعدادش بہ ہفت صد و شصت وسہ رسید۔ این غواص بحر لالی سخن بنفس سوزی تلاش گوہرہائے (یکہزار و ۱۰۳۰ سی) رباعیات برآوردہ بپیرایہ گوش و گردن عروس تالیف کردہ وہم می تواند زد .... اما ازآنجا کہ عصائے خامہ ناسخین امی فطرت عذرخواہ مذلت اقدام قدماست و رہنمائے مسلک سدا دو نارا ستنے ہمیں یک عصاست ازین حمرا اندیشہ زیادہ تر بدقت و انشگاف حقیقت خوب و زشت نہ پیچید و مذاق راستی اندیش بکج روی روش اہل ایراد نگرائید۔ نہ جرعہ کشان حکمدہ تحقیق می شناسند کہ سرمستی کلام خیام از دیگر بادہ گساران معانی وہم خیال است اما بزم خیال خواجہ حافظ شیرازی و بابا افضل کاشی از ہمیں بادہ کیفیت خیام مالامال است الخ"

فیاض نے اپنی باقیات میں ایک نامکمل لغت بھی چھوڑا ہے۔ اس لغت میں انہوں نے یہ التزام کیا تھا کہ ہر لغت کی مفصل تعریف کے بعد اسکی نظیر میں صرف اپنے استاد ہی کے اشعار پیش کریں لیکن کاروبار کی کثرت کے سبب یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور اب اسی نامکمل حالت میں یہ نایاب کتاب نواب عزیز یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت فیض کے دیوان کو سب سے پہلے فیاض ہی نے ترتیب دیکر طبع کرایا تھا۔ فیض کے ایک صاحبزادے المتخلص صاف تھے جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ فیاض نے ان کے کلام کو بھی بڑی محنت سے جمع کر کے اپنے منجھلے فرزند محمد کریم الدین خاں کی جانب سے چھپوا دیا جو اب بکیاب ہے۔

فیاض کی صحت قابل رشک تھی انہوں نے ۸۷ سال کی عمر پائی ۱۳۱۹ھ میں مشرف جنگ بہادر کا خطاب ملا اور مدت العمر انہوں نے علم اور ملک دونوں کی خدمات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ آخر زمانے میں انکی بصارت میں فرق آگیا تھا لیکن لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔ انکا انتقال ۱۳۲۵ھ میں ہوا۔

انکی اولاد میں نواب عزیز یار جنگ بہادر، محمد کریم الدین خاں اور محمد رحیم الدین خاں اس وقت موجود ہیں۔ اول الذکر اپنے والد کی طرح علم دوست اور اعلیٰ درجے کے سخن سنج و سخن فہم اور بلند حوصلہ ہیں۔

فیاض کا کلام انکی زندگی کی طرح نہایت سادا سیدھا اور ہر قسم کی متروک صنعتوں اور تکلفات سے بالکل پاک ہے ضلع جگت، اور صنائع و بدائع (جو اس زمانے کے اکثر شعراء کے کلام کا لازمی جزو ہیں) کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت سادگی، نزاکت تخیل اور انداز بیان کی خوبی ہے۔ انگریزی زبان کے ایک بڑے شاعر جان ملٹن نے شاعری کی جو تین اصلی خصوصیتیں بیان کی ہیں (یعنی سادگی، اصلیت اور جوش) یہ اوصاف فیاض کے کلام میں بھی موجود ہیں اور انہی کی روشنی میں انکی شاعری کا صحیح لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔

انکے اردو دیوان کا ایک مبسوط قلمی نسخہ (۳۲۰ صفحات) نواب عزیز یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مخمسات قطعات اور موقتی نظمیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ہم نواب صاحب کے شکر گزار ہیں کہ اس مضمون کے سلسلہ میں انہوں نے ہمیں اسکے مطالعہ کا موقع دیا۔

انتخاب کلام حضرت فیاض

ہر رنگ میں وہ شاہد رنگیں قبا ملا　　پنہاں کہیں ملا تو کہیں برملا ملا
جوشش زن ہو جو ترا بحر کرم　　پار لگ جائے سفینہ میرا
حسنِ تاباں سے شانِ حقیقت ہے آشکار　　اٹھ جائے چشمِ دل سے جو پردہ مجاز کا
ہر شئے میں ذات کا ہے اسی کی ظہور نور　　منہ پر پڑا ہے پردۂ غفلت نہیں نقاب
جس کی ہمیں تلاش ہے دل میں ہے وہ مکیں
وہی ہر شان میں ہے جلوہ گر مستور ہر شئے میں
ایسی مجبوریوں پہ یہ دعویٰ　　نہ ہوا ہم کو اختیار افسوس!
ہے گزر اس کا حریم قدس تک　　عرش کے بھی ہے پرے پرواز عشق
شیشے میں بادہ در گلو طبل تہی ہیں سب سبو
ہے کفر اگر کہوں خدا ہوں　　ہاں! آئینۂ خدا نما ہوں

ممنون میں ہوا نہ کسی اہل ناز کا　　ہے لاکھ لاکھ شکر مرے بے نیاز کا
اپنی خودی حجاب ہوئی ورنہ ہر جگہ　　جلوہ عیاں ہے اس صنم بے حجاب کا
جلوہ گر ہے نور دل میں حسن عالمگیر کا　　آئینہ میں عکس ہے کس مہر پر تنویر کا
منحصر دیر و کلیسا و حرم پر کچھ نہیں　　خانۂ دل بھی ہے تو اللہ کے گھر کا جواب
پھرتے ہیں خاک اڑاتے ہوئے چار سو عبث
بتاؤں کس طرح میں ہے نہاں کیونکر عیاں کیونکر
ہوں انا الحق کی صدا کا آشنا　　میں نے جس دن سے سنی آواز عشق
حسن کی جب سے ہوئی نشو و نما　　بس اسی دن سے ہوا آغاز عشق
منضبطۂ الست کی پا گئے کیف و کم کو ہم
خدا جانتا ہے خدائی کی باتیں　　نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں

ہوں راہ نورد حرم شاہد یکتا — آواز انا الحق ہے میری بانگ درا میں

دیر و حرم میں کرتا ہے کس کی تلاش تو — گردن جھکا کے دیکھ ذرا وہ تو پاس ہے

خود فراموشی خدا کی یاد میں — اور کیا ہے بس یہی توحید ہے ۔ دوڑ زاہد کی ہے بس جنت تک — قدم اس سے کہیں دور اپنا ہے

زبان کی خوبیوں میں ان کے قلم سے جو محاورے اور خاص ترکیبیں بے اختیار نکل گئی ہیں ان کی مثالیں :—

سامنا میرے دیدۂ تر کا — کر سکے منہ نہیں سمندر کا ۔ شمع لحد تو رہ گئی جل بجھ کے صبح تک — اسکا سراغ ہی نہیں پروانہ کیا ہوا

میں تو ہو جاتا ہوں باہر آپ سے — غمکدہ میں میرے جب آئے آپ ۔ چلے وہ اس طرف صورت دکھا کر — یہاں دم رہ گیا آنکھوں میں آکر

بہے جب آنسوؤں کے ساتھ لخت دل ہوا ثابت — غم فرقت لہو پانی ہمارا ایک کرتا ہے

ہماری داستاں پر کان وہ دھرتا نہیں شاید — کوئی در پردہ اس گل پیرہن کا کان بھرتا ہے

جدت مضمون !! — ایسا کوئی کبوتر قیامت نامہ بر ہو — اڑنے میں جس کو سبقت ہو مہر رنگ رو پر

مرتا ہوں شب ہجر میں لیکن نہیں مرتا — تکلیف قضا کیوں نہیں کرتی مرے گھر تک

کلام کی چستی بے تکلف محاورے تشبیہیں اور استعارے —

غم زلف ناچار سہتے ہیں لوگ — خدا کا دیا سر پہ رکھتے ہیں لوگ ۔ وہ شوق سے پھر رہے ہیں باہر — باہر ہیں خودی سے ہو رہا ہوں

ہم نے رو رو کے کیا ابر کو پانی پانی — ہنس کے بجلی کوئی تم نے بھی گرائی ہوتی

نکل آتا ہے جب مذکور انکی سرد مہری کا — تو بیمار محبت ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے

بندھا آنکھوں میں ہے تار یاد زلف پیچاں کا — نظارہ گھر میں بیٹھے کر رہا ہوں سنبلستاں کا

رخ پہ جب زلف آگئی سورج گہن ثابت ہوا — اپنے دود آہ سے چرخ کہن ثابت ہوا

لکھے وصف غنچہ دہانوں کے اس قدر — خامہ کو عندلیب کے منقار کر دیا

عرب کا ایک مشہور شاعر کہتا ہے !

والبدر ینظر فی السحاب کانّہٗ — عذراء تنظر من وراء سجاف

مطلب:۔ قمر ہلکے ہلکے بادلوں سے اپنا چہرہ یوں دکھا رہا ہے گویا ایک حسین لڑکی نہایت باریک کپڑے کے عقب سے آہستہ آہستہ دیکھ رہی ہے! بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کو کسی حسینہ کے دھندلے نقوش سے تشبیہ دینے میں وہ لطافت نہیں جو کسی عدیم النظیر نقاب افگندہ حسینہ کے چہرے کو "ابرِ تنک" میں چھپے ہوئے ماہتاب سے تشبیہ دینے میں ہے۔ شعر کی خوبی کا اندازہ اہلِ ذوق ہی کر سکتے ہیں!!

چھایا ہوا ہے ابرِ تنک ماہتاب پر   یا تیرے رخ پہ ہے مہ خلوت نشیں نقاب

"ابرِ تنک" اور "مہ خلوت نشیں" کا حسن سخن سنج طبقے سے پوشیدہ نہیں۔

تھمتا نہیں ہے توسنِ عمرِ رواں کہیں   بجلی کے تار کا ہے گماں باگ ڈور پر

آئیے گھر میں کبھی فیاض کے   دیدنی ہے اس کے دل کا خانہ باغ   سوزِ غم میں آہ کے جھونکے نہیں   چل رہی ہے بادِ صرصر دعوے میں

لبِ لعلیں کے تصور میں یہ دل   اک عقیقِ یمنی ہے اب تو

مراعاتُ النظیر اور چٹپٹی بندش:۔

گل ہیں مرے سینے میں گلستاں سے زیادہ   ہر زخم ہے خنداں گلِ خنداں سے زیادہ   سنتے ہیں اندھیری ہیں بہت گور کی راتیں   تاریک نہ ہو گی شبِ ہجراں سے زیادہ

گل باغ میں فلک پہ قمر لالہ دشت میں   محفل میں شمع سب پہ تمہارا جمال ہے

شاعرانہ نکات:۔ پھرتا ہے جو خورشید پیالہ لئے دن بھر   دریوزہ گرِ حسن ہے یا شاہ تمہارا

کیوں نہ پیدا ہو تلونِ طبع میں   دہر بھی توسن رسیدہ ہو گیا

بات رہ جاتی ہے دن رہتے نہیں   تم نہ آؤ گے تو کیا ہو جائے گا

سرفراز اوج ہو سکتا ہے کب پابندِ دام   ہے خلافِ عقل اڑنا طائرِ تصویر کا

خاکِ راہِ کشتگانِ خنجرِ تسلیم ہو   اے ہوس گر تجھ کو کچھ شوق ہے اکسیر کا

افسوس بیکسی میں کسی نے دیا نہ ساتھ   ہے اک چراغِ گور تو وہ بھی بجھا ہوا

اگر رفعت پذیر اپنا غبارِ ناتواں ہوتا   زمیں ہوتی فلک پر اور نیچے آسماں ہوتا

بہ رنگِ نکہتِ گل عشقِ بلبل گر نہاں ہوتا — نہ دشمن باغباں ہوتا نہ برباد آشیاں ہوتا
باغ عالم میں نہ بلبل ہی کو گریباں دیکھا — گل شاداب کو بھی چاک گریباں دیکھا
وصف جنت حضرت واعظ جو کرتے ہیں بجا — لیکن اس زہرہ شمائل کے ہے کاشانے کے بعد
دور مسجد ہے تو میخانہ ہے پاس اے فیاض — شغل کچھ تو بھی خالی نہیں رہنا بہتر
کیا بخت نارسا کی شکایت گنا ہ تھی — افسوس کچھ کا کچھ ہوا مجھ پر گمان دوست
موت بھی تو کہیں کمبخت نہیں آتی ہے — وصل موقوف اگر ان کا ہے مرجانے پر
اللہ رے بے رخی تری عرضِ وصال پہ — فقرے سنا دئے مجھے دو چار خاص خاص

"خاص خاص" کہہ کر مطلب پورا کرنا بلاغت کی انتہا ہے!!

بجھ گیا ہے چراغ لطف حیات — وہ نہیں ہیں تو کیا مزا اے شمع
جلوہ بخش انجمن ہے نور خلوت خانہ شمع — عاشقوں کے گھر میں ہے داغ دل دیوانہ شمع
جلوہ افزا ہو جو اپنا اتحاد حسن و عشق — شمع پروانہ بنے بنجائے ہر پروانہ شمع
رات بھر اک چاند سے رخ کی ہے یاد — میرے گھر جلتا ہے بے روغن چراغ
وہ ابروئے کشیدہ اور کچھ ہے — کھنچی دیکھی ہے یوں تو بارہا تیغ
ہو گیا یاد میری صحبت میں — آئینہ کو دل حیراں کا سبق
دو عالم کی ہے اس دلبر سمائی — دیا اللہ نے کتنا بڑا دل
چراغ خانۂ ویراں ہے گویا — تھا جب درد تو کس کام کا دل
چاند ہیں آسمان حسن کے آپ — اور سب خوبرو ستارے ہیں
آپ کے حسن خداداد کی ہے شان کچھ اور — شمع کی لو نہیں خورشید کی تنویر نہیں
کونسا غیرت گل سوئے گلستاں آیا — آج بلبل جو اڑائی ہوئی اوسان آئی

انگریزی مثل ہے "مصیبت تنہا نہیں آتی" .... حضرت فیاض کا شاعرانہ خیال ہے: —

حسرت و یاس و غم و رنج و الم و درد فراق — بیکسی آئی بھی تو لے کے یہ ساماں آئی

زلف سنبل ، چشم نرگس ، رخ ہے گل ، قامت ہے سرو — سر سے جو ڈھلکا ہے آنچل باغ کی دیوار ہے

خضر کی عمر سے بڑھکر ہے شہیدوں کی حیات — آب حیواں مگر آب دم شمشیر میں ہے

دیکھ کر نرگس بیمار کے بیمار کا حال — غم سے آنکھوں میں مسیحا کی بھر آیا پانی

نقطۂ لاینقسم ہے وہ دہن — فلسفی کے قول کی تردید ہے

خبر فصل بہاری کی صبا تک لیکے آئیگی — یہ کچھ اڑتی ہوئی بلبل نے پہلے سے اڑائی ہے

نہ گھبرا اے دل ناداں نہ گھبرا — ابھی تو عاشقی کی ابتدا ہے

خوار ہیں دنیا میں اہل علم و فضل — ہے جہاں دانا اسی جا دام ہے

ثنا کی ہر ایک صاحب حب وطن میں ہے — معدن میں لعل نافہ آہوئے ختن میں ہے

آئینہ خانۂ دل میں ہے مرے تصویر انکی — روکش رونق بتاں خودآرائی ہے

اسلوب بیان -

اب کوئی تجھکو پوچھتا ہی نہیں — محتسب دور ہے یہ ساغر کا

چوما حجر اسود و کعبہ کو بھی لیکن — سودا مسی آلودہ لبوں کا نہیں جاتا

"مسی آلودہ لبوں" کے ذائقے کو کس نفیس پیرائے میں "حجر اسود" پر ترجیح دی ہے۔ مضمون کی جدت کے علاوہ حضرت فیاض کے اکثر اشعار رعایت لفظی کی مثالوں میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان اشعار کا لطف سرسری نظر سے پڑھنے والوں کو بالکل نہیں آسکتا۔ الفاظ کی رعایتوں اور انکی خوبی استعمال پر نظر رکھکر ان کے کل اشعار پڑھنے سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

ہو ایسی عمارت ہے کہاں — کعبۂ دل کو نہ ڈھایا ہوتا

آنکھیں کھلی ہیں لڑتی ہیں ملتی ہیں رات دن — آنکھوں کا نام مفت میں بیمار کر دیا

نسبت ہے کچھ بھی سرو کو قامت سے یار کے — اک ناڑ سا قد اس نے بڑھایا تو کیا ہوا

حال دل کا کہا نہیں جاتا — آہ! چپکے بھی رہا نہیں جاتا

ہو سکے جس کا مسیحا سے علاج — درد فرقت نہیں ایسا ہوتا

کہتا ہے یہ بادہ کش سبو سے — ہے خون مجھے حلال تیرا

کب تک رہیگی چہرۂ آئینہ جبیں پہ نقاب — اللہ زمانہ آئینے الٹی نہیں نقاب

ہائے کہ دشت جنوں میں بھی ہاں سفر — قیس و فرہاد بھی گئے مرے بیکار ابتک

یہ محفل رنداں ہے بس آئے حضرت واعظ — موقوف کریں اپنی خرافات کہیں اب

جو ظلم بتوں کیے ہیں خدا سے بچی اُسکی
امید تلافی مکافات نہیں اب

ہے نصیحت تری ناصح بے سُود
مغز پاشی سے برادر حاصل

کبھی آ سکیں جو مسیح بھی تو عبث ہے بات تو ہے یہی
مرے دل کا درد ہے لا دوا مرے درد دل کی دوا نہو

ہرن کہتے ہیں چشم جاناں کو شاعر
اٹھی اب زمانے سے مردم شناسی

دست رقیب زلف شکن در شکن میں ہے
کچھ بوئے رشک آج نسیم چمن میں ہے

غم فراق، ادائے رنگیں کے دلکش اظہارات عاشق محزوں کے نالہائے نیم شبی اور آہ سحری کے پر درد بیانات کو پڑھیے!

یاد رخ گلگوں میں جلا دل پر داغ
رو کش ہے بہار ارم صحن چمن کا

بت سامنے بیٹھے رہے اسکے حضور
بات کرنے کا بھی مقدور نہ تھا

وعدۂ وصل بڑی بات نہ تھی
سچ تو یہ ہے انھیں منظور نہ تھا

اف رے سوز حرارت تپ عشق
جیتے جی اس بخار نے مارا

میں مختصر بیان کروں قصہ کونسا
شب ہائے غم کا یا تری زلف دراز کا

بزم اغیار میں انکا تبسم ہونا
دل مجروح پہ اپنے نمک افشاں تھا

آ گئے تو تمکنت بھی حیا بھی غرور تھا
اب مانع نظارہ ہوئی چار میں نقاب

آپ کو شرماتے ہیں رو رو کے ہم
برق کو ہنس ہنس کے تڑپاتے ہیں آپ

انداز خرام سے تمھاری
مٹی ہوئی سینکڑوں کی برباد

لطف ہے ساقی مخمور کا میخانے پر
گردن شیشہ جھکی جاتی ہے پیمانے پر

ساغر کو ذرا سنبھال لینا
میں نشہ میں چور ساقیا ہوں

اثر دل میں نہیں اسکے تو کیوں اے آہ پھرتی ہے
زمیں سے آسماں تک آسماں سے تا زمیں سو لیا

خالق کی قسم اس بت کافر کی محبت
پیوستہ مرے دل میں ہے ایماں سے زیادہ

بت جو پھر جائیں مجھ سے پھر جائیں
میں خدا سے پھروں خدا نہ کرے

ناصح جو آپ کہتے ہیں سچ ہے درست ہے
قابو میں جسکے دل ہی نہ ہو پھر وہ کیا کرے

امید وفا ان حسینوں سے رکھنا
نہ ہے یہ سمائی نہ ہے یہ قیاسی

قسم کھا کر کہوں گا تجکو اے بت
خدا نے اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے

لب جاں بخش یہ سبزے کی نمود
چشمۂ خضر یہ کائی ہے

دل ایک ہے کس کس سے بچائے کوئی
انداز سے غمزے سے کرشمے سے ادا سے

میں ہوں اور بیخودیٔ شوق وصال
آپ ہیں اور خود آرائی ہے

ٹوٹا رشتہ نہ اسیری میں پریشانی کا
گیسوئے یار کی ہم زلف ہے زنجیر اپنی

اردو شاعری کے اس دلچسپ گنجینے کے آخر میں بہت سی نظمیں مندرج ہیں جو فیاض نے خاص خاص مواقع پر تحریر کی تھیں۔ ان کی ابتدا میں طویل ساقی نامے بھی موجود ہیں۔ ان نظموں کے بعد متعدد رباعیات ہیں جن میں سے اکثر اعلیٰ درجے کی ہیں۔ یہاں صرف چار نقل کی جاتی ہیں جو خلفاء راشدین کی شان میں تحریر کی گئی ہیں:۔

سر دفتر اہل دیں جناب صدیقؓ
پیدا نہ ہوا کہیں جواب صدیقؓ

کیا سامنے آسکے عدوئے کذاب
جب آپ کو مل گیا خطاب صدیقؓ

تقریرِ عمرؓ ہوئی ہے شمشیرِ عمرؓ ۔۔۔ شمشیرِ عمرؓ ہوئی ہے تقریرِ عمرؓ
مفتوح ہوا عرب سے لے تا بہ عجم ۔۔۔ دیکھو! کہتے ہیں اسکو تسخیرِ عمرؓ

کیا منہ ہے مرا جو ہو ثنائے عثمانؓ ۔۔۔ ہے سینہ میں، سر میں، دل میں جائے عثمانؓ
ملتی ہے یہاں دولت دین و دنیا ۔۔۔ سب خلق پہ ہے عیاں غنائے عثمانؓ

کیا مجھ سے ادا ہو وصف شایان علیؓ ۔۔۔ ربع مسکوں ہے زیر فرمان علیؓ
کیا میرے مقابل ہو عدوئے بزدل ۔۔۔ مشہور ہوں میں شیر نیستان علیؓ

جی تو چاہتا ہے کہ دیگر اصناف سخن کے بھی چند نمونے اور پیش کریں لیکن خوف طوالت مانع ہے داغ دہلوی کی وفات کی انہوں نے جو تاریخ کہی تھی اور جو زبان زد خاص و عام ہو گئی تھی اسی پر ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

ہائے لطف شاعری جاتا رہا

۱۳۲۲ھ

سیّد اصغر حسین ناجیؔ

از

مرزا محمد علی صاحب بی۔ اے متعلم ایم۔ اے (آخری عثمانیہ)



میر اصغر حسین ناجی

سیّد اصغر حسین ناجیؔ

دیانت خاں اور امانت خاں دو سگے بھائی وزرائے دہلی سے تھے دیانت خاں سے سید اصغر حسین ناجیؔ مرحوم اور امانت خاں سے میر سرفراز حسین خاں فخر الملک اور میر اسد علیخاں نظام یار جنگ خانخاں مرحوم کے آبائی سلسلے ملتے ہیں۔ ناجیؔ کے والد میر صلابت علی (۱۲۲۷ تا ۱۳۰۰ھ) اور دادا میر ولی کبیر خاں تھے۔ موخر الذکر کو نواب سکندر جاہ نے ایکہزار روپیہ منصب عطا کی تھی میرک عطا حسین ان کے چھوٹے لڑکے تھے اور اسی لئے میرک پکارے جاتے تھے ان کے بڑے بھائی میر صلابت علی تھے بقولِ صاحب محبوب الزمن

"صاحب علم و فضل تھے اور خاص کر علم محاسبہ میں کمال مہارت رکھتے تھے اور انتظام مہات ملک سے خوب ماہر تھے ریاست حیدر آباد میں امرائے دولت کے نزدیک امانت گزار و دیانت دار مانے جاتے تھے منیر الملک بہادر و سعید الملک بہادر و راجہ راؤ رنبھا بہادر وغیرہ نے اپنی جاگیرات کا انتظام انہیں کی تفویض کیا تھا اور خاص نواب خانخاں بہادر کے جاگیرات کا انتظام بھی انہیں کے اہتمام میں زمانہ دراز تک رہا خوش اخلاق اور نیک نیت تھے اقربا اور احبا کے ساتھ حسن سلوک فرماتے تھے سادات اور زائرین کی بھی خدمت کرتے تھے آپ نے ایک مسجد چادر گھاٹ میں موسیٰ ندی کے کنارے تیار کی اور اسکے تحت میں ایک دوکان بھی تعمیر کرادی تاکہ اس کا کرایہ مسجد کی ضروری مصارف میں آوے آخری عمر میں حج و زیارت سے مشرف ہو کر کربلا المعلیٰ میں اقامت اختیار کی تھی ۱۳۰۰ھ میں وہیں فوت ہوئے" (صفحہ ۱۱۱۹)

میر ولی کبیر خاں کے بعد ان کی منصب ان کے لڑکوں کے نام جاری ہوئی اور یہی سلسلہ ناجیؔ تک باقی رہا۔ البتہ ان کے بھائیوں کی منصب ان کے خاندان میں ابتک جاری ہے حضرت ناجیؔ کے متعدد لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن صرف ایک صاحبزادی باقی رہیں جن کی اولاد موجود ہے مولوی میر صادق علی صاحب (مددگار ناظم ٹپہ سرکار عالی) اور نواب شہید یار جنگ شہید حضرت ناجیؔ کے نواسے داماد اور میر سعادت علی صاحب رضوی صادق بی۔ اے (عثمانیہ) کواسے داماد ہیں۔

میر صلابت علی کے متعدد لڑکے اور لڑکیاں تھیں ان کے دوسرے صاحبزادے یعنی ناجی کے چھوٹے بھائی سید اکبر حسین خود بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے نوحہ گوئی اور قصیدہ نگاری انکی جولان گاہیں تھیں صرف تکمیل ذوق کے لئے شعر کہتے تھے شہرت کا خیال نہ تھا اس لئے کلام طبع نہ ہوا حضرت ناجی کی چھوٹی بہن راقم کی حقیقی نانی تھیں چونکہ ان کے والد نواب فخر الملک اول کے معتمد تھے اسلئے ناجی بھی ابتداء میں ان کے بڑے لڑکے نظام یار جنگ خانخاں کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ پر ملازم ہوئے نازک مزاج تھے اسٹیٹ کے دیگر عہدہ داروں سے نہ بن سکی اسلئے علیحدہ ہو کر ایک عرصہ تک خانہ نشیں رہے تقسیم اسٹیٹ کے بعد فخر الملک ثانی نے ان کو چار سو روپیہ ماہوار پر اپنے اسٹیٹ کا معتمد مقرر کیا اور وہ مدت العمر اسٹیٹ ہی کے ہو رہے

ناجی ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے وطبعاً نیک نہاد اور پاک سرشت انسان تھے ان کو اپنے آباء و اجداد کے نام نیک کو برقرار رکھنے کا ہمیشہ خیال رہا اور اپنے والد کی آخری نصیحت کہ :—

"میاں اگرچہ ہماری عمر کوئیلے کی کوٹھری میں گزری مگر کبھی ہم کو سیاہ دھبہ نہ لگنے پایا"

ان کو ہمیشہ یاد رہی ان کی طبیعت میں احتیاط اس درجہ تھی کہ سرکاری دوات و قلم جو مکان پر ہوتا اسکو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال نہ کرتے شعر و سخن سے فطری ذوق تھا تلامذہ مکان پر آتے اور اصلاح کے لئے کلام پیش کرتے تو اپنے ذاتی واسطی قلم دوات وغیرہ کا استعمال کرتے ۔

انکی ابتدائی تعلیم تو گھر ہی پر ہوئی بعد میں مولوی سید نیاز حسن قبلہ اور مولوی سید محمد علی قبلہ سے فقہ اور عربی میں تعلیم پائی۔ شعر و سخن میں منشی تفضل حسین عطا سے تلمذ تھا اور ناجی تخلص انہیں کا عطیہ تھا۔

کار و بار ملازمت کے بعد جو وقت فرصت کا ملتا ادبی مشاغل میں صرف ہوتا تھا اپنے اور شاگردوں کے کلام کی سند کے لئے موقع بہ موقع اساتذہ کے کلام سے نظائر پیش کیا کرتے تھے ان کی زود فہمی اور نازک فہمی مشہور تھی صاف دلی اور صاف گوئی ان کی ممتاز خصوصیتیں تھیں بے لاگ ایسے تھے کہ جو کچھ کہنا ہوتا منہ پر کہہ دیتے ۔

تاریخ گوئی میں بے مثل تھے برجستہ تاریخ کہتے اور اچھے اچھے مادے نکالتے تھے ایک دفعہ لکھنؤ میں اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم تھے اتفاقاً میزبان کے کسی دوست کے لڑکے کی کامیابی کی اطلاع ملی حاضرین مبارکباد دے رہے تھے

ناجی تھوڑی دیر خاموش سنتے رہے اور پھر میزبان سے مخاطب ہو کر چار مصرعوں کا ایک قطعہ پڑھا جس کے آخری مصرع سے تاریخ کامیابی نکلتی تھی مصرع   ہو گئے پاس فضل داور سے

حاضرین مجلس کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مادۂ تاریخ (۱۳۰۵ھ) ہے انہوں نے کہا "جی ہاں فضل خدا سے ہی کامیابی ہوتی ہے" ناجی نے جواب دیا "اس سے کس کو انکار ہے مگر آخری مصرع میں مادۂ تاریخ بھی ہے" سب متحیر ہو گئے اگرچہ یہ مصرع ناجی کی بے مثل مہارتِ تاریخ گوئی کے شایان شان نہیں ہے تاہم برجستہ ہونے کے اعتبار سے یہاں پیش کیا گیا ان کے متعدد اعلیٰ پایہ مادہ ہائے تاریخ ان کے احباب اور تلامذہ کے دیوانوں وغیرہ میں موجود ہیں جن میں سے بعض اس مضمون کے آخری حصے میں نمونہ کلام کے ساتھ مندرج ہیں۔

حضرت سرور کائنات اور اُن کی آلِ پاک سے دلی محبت تھی اثنا عشری مذہب تھا پرجوش شیعہ تھے عشرہ کے دن سر و پا برہنہ رہتے اور نماز عصر تک کچھ نہ کھاتے اعمال عاشورہ پابندی سے بجالاتے تھے اس دن ان کے یہاں مجلس منعقد ہوتی تھی جو اب تک جاری ہے ایام عزا میں سیاہ دستار اور سیاہ قبا پہننا لازمی سمجھتے تھے۔ حیدرآباد میں شیعوں کے ہاں محرم اور صفر کے مہینوں میں ہر سال جس کثرت سے مجالس ہوا کرتی ہیں ناجی ہی کی قوت عمل کا نتیجہ ہیں اُن سے پیشتر یہاں مخصوص اور گنتی کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنے احباب کو ترغیب دلا دلا کر اُن کے یہاں بھی مجلسیں منعقد کرائیں اور اکثر و بیشتر اُن مجالس کے اوقات وغیرہ بھی خود ہی مقرر کیا کرتے غرض اُن کے اثر اور دلچسپی نے بہت جلد ایک نئی فضا پیدا کر دی۔ محفل میں اُن کی کوئی خاص جگہ معین نہ تھی مرثیہ بغور سنتے کوئی شعر اچھا معلوم ہوتا تو تعریف کرتے اور اگر کسی شعر میں غیر معمولی درد ہوتا تو نہایت خاموشی سے آبدیدہ ہوتے۔

ان کے مکان پر یوم عاشورہ   ۲۰ صفر اور ۲۸ صفر کو مجالس منعقد ہوتی تھیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے ۲۶ رجب کو جشن بعثت کے نام سے وہ ایک محفل آراستہ کیا کرتے تھے جس میں طرحی مصرع پر قصیدہ خوانی ہوتی تھی اور شعرا ایک دوسرے سے خراج تحسین حاصل کیا کرتے۔

نوحہ، سلام، منقبت اور تاریخ گوئی وہ اصناف سخن ہیں جو اُن کے مرغوب طبع تھے ایک یا دو مرثیے بھی

کہے ہیں۔ غزل کبھی نہیں کہی۔ متشرع آدمی تھے اور ثواب دارین ان کا مطمح نظر تھا۔ عبادت کے طور پر تمام عمر اسی قسم کی شاعری میں منہمک رہے۔

حضرت ناجی کو نام و نمود کا مطلق خیال نہ تھا کاغذ کے پرزوں پر شعر لکھتے کبھی شاگردوں کے حوالے کر دیتے اور کبھی بے پروائی سے ادھر ادھر ڈال دیتے اُن کے بھتیجے میر احمد علی عقیل مرحوم اور بھانجے مرزا علی رضا مرحوم نے اُن کے نوحوں کو جمع کر کے "درۃ الغموم" کے نام سے شائع کیا اگر یہ حضرات توجہ نہ کرتے تو شاید یہ کلام بھی محفوظ نہ ہو سکتا مجموعہ کا نام خود ناجی کا مجوزہ مادہ تاریخ ہے جس سے ۱۳۲۶ھ نکلتا ہے۔ یہ کتاب قاسم پریس سے شائع ہوئی تھی شروع میں ناجی کے شاگرد میر دلاور علی دانش نے ایک مختصر سی تمہید لکھی ہے کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تقریباً دو ہزار تین سو اشعار مندرج ہیں آخر میں ان کے احباب اور تلامذہ کے متعدد قطعات تاریخی بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ناجی کے احباب و تلامذہ کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

انہوں نے ۳ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو وفات پائی چنانچہ ہر سال اسی تاریخ ان کے نواسے میر سخاوت علی صفا مجید ان کی یادگار میں محفل مسالمہ منعقد کرتے ہیں جس کے لئے مقررہ طرح مصرع پر شعراء سلام لکھ لاتے اور داد سخن حاصل کرتے ہیں۔ ناجی استاد فن کی حیثیت سے اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو چکے تھے چنانچہ اُن کے متعلق محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ۔

> "آپ کو ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق رہا ہے آپ کا کلام اُردو فارسی دونوں زبان میں سنجیدہ و پسندیدہ ہوتا ہے آپ کی طبیعت قدرتاً شعر و شاعری کے مناسب تھی میدان سخن سنجی میں خوب جولانی کرتی ہے خاص اس فن میں آپ کی مہارت اس درجہ بڑھ گئی کہ معاصرین و اقران آپ کو استاد سمجھتے ہیں آپ کے کلام میں میر کا انداز معلوم ہوتا ہے آپ کے تلامذہ شہر میں اکثر ہیں آپ کے اصلاح سے کلام کو درست کرتے ہیں آپ تواریخ گوئی میں ید بیضا رکھتے ہیں تہنیت اور تعزیت میں فی البدیہہ موزوں فرماتے ہیں" (صفحہ ۱۱۳۰)

اُن کے تلامذہ کی کثیر تعداد تھی جن میں سے متعدد اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں اُن کے مخصوص تلامذہ میں میر دلاور علی دانش مرحوم۔ میر محمود علی لائق۔ میر محمد علی مسرور۔ حکیم میر عابد علی غیور۔ مرزا علی جواد جواد۔ مرزا علی جعفر جعفر مرحوم۔

سید سجاد حسین سجاد۔ اور سید محمد مہدی ناہید بہت مشہور ہیں ان سب کا مطبوعہ کلام موجود ہے۔ اول الذکر نے جناب امیر علیہ السلام کی مدح میں متعدد مخمس اور ہفت بند لکھے جن میں (مخمس) "پنجۂ حیدری" اور ہفت بند دونوں شائع ہو چکے ہیں انہوں نے اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے اجداد کے حالات میں ایک منظوم تاریخ بھی "تحفۂ عثمانیہ" کے نام سے لکھی تھی جس کے صلے میں سرکار آصفی سے تین ہزار روپیہ انعام حاصل کیا اُن کے علاوہ تلامذہ ناجی میں غیور اور مسرور نے بھی اساتذہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

نمونہ کلام ناجی۔

قطعات تاریخی

۱۔ قطعہ تاریخ تسمیۂ فرزندان نواب فخر الملک بہادر

زہے تقریب بسم اللہ خوشا عشرت کی محفل | قبا پہنے کوئی زریں ہے اور کوئی ستارو کی
بصد حسرت فلک دیکھے نہ کیونکر چشم انجم سے | کہ بزم عیش امیروں کی ہے محفل نامداروں کی
ہوا کرتے ہیں عشرت میں بسر دن عیش میں راتیں | کبھی مجمع عزیزوں کا کبھی صحبت ہے یاروں کی
خدا نواب فخر الملک کو قائم رکھے دائم | فزوں ہو خضر کے بھی عمر سے عمر انکے پیاروں کی
یہ دونوں نونہال گلشن زہرا و حیدر ہیں | رہیں خرم بر آئیں اُن سے امیدیں ہزاروں کی
بنے ہر ایک دولہا اور دلہن کو بیاہ کر لائیں | رہے سہروں میں چہرے چاند سے ہوں چھاؤں تاروں کی
خیال سال تاریخ آیا جب اس رسم نیکو کا | کہا ناجی نے بسم اللہ ہوئی دو گلعذاروں کی

۱۳۰۶ھ

۲۔ قطعہ تاریخ طبع دیوان ڈاکٹر احمد حسین مائل۔

ہوا دیوان رنگیں منطبع جس وقت مائل کا | تو بولے دیکھ کر سب اسکو بہتر ہے گلستاں سے
جو پوچھی دوستوں نے طبع کی تاریخ ناجی سے | کہا سن چھپ گیا مائل کا دیوان فضل سبحاں سے

۱۳۱۵ھ

۳۔ قطعہ تاریخ طبع "درۃ النجوم"

علی رضا نے یہ نوحے چھپائے ہیں میرے ۔۔۔ جہاں میں شاد یہ ناجی ہزار سال رہے
کہا یہ میں نے دعا یہ معجمہ میں سال ۔۔۔ یہ لطف حضرت باری یہ بے ملال رہے

۱۳۲۶ھ

قصیدہ

اللہ ثنا خوان حسین ابن علی ہے ۔۔۔ قرآن مبیں شان حسین ابن علی ہے
رضوان گلستان جناں کہتے ہیں جس کو ۔۔۔ اک مروحہ جنبان حسین ابن علی ہے
جبریل وہ ہے خادم دیرینہ شبیر ۔۔۔ میکال وہ دربان حسین ابن علی ہے
اصغر کے ہیں قربان علی اکبر کے تصدق ۔۔۔ وہ گل ہے یہ ایمان حسین ابن علی ہے
محشر میں نہ دیکھے گا کوئی مہر جبیں کو ۔۔۔ کیا سایۂ دامان حسین ابن علی ہے
خلاق دو عالم کے مباہات کے قابل ۔۔۔ ہر کار نمایان حسین ابن علی ہے
روشن گر عرش و فلک و گلشن جنت ۔۔۔ ہر گوہر دندان حسین ابن علی ہے
پروانہ ہے سو جان سے مہر فلک اسکا ۔۔۔ جو شمع شبستان حسین ابن علی ہے
دیتا ہے اسے اجر خدا طوف حرم کا ۔۔۔ سو جاں سے جو قربان حسین ابن علی ہے
طالب وہ نبی کا ہے وہ طالب ہے خدا کا ۔۔۔ دنیا میں جو خواہان حسین ابن علی ہے
سجاد سے تا صحبت حق مہدی ہادی ۔۔۔ اک اک گل خندان حسین ابن علی ہے
اللہ نے شاہوں کا کیا ہے انھیں سرتاج ۔۔۔ کیا قدر غلامان حسین ابن علی ہے
تاب آنکھ ملانے کی نہیں مہر فلک کو ۔۔۔ کیا شمسہ ایوان حسین ابن علی ہے
دنیا ہے سخیر اس کی سخیر اسکی ہے عقبیٰ ۔۔۔ جو تابع فرمان حسین ابن علی ہے

ناجی ہے گلستان جناں تیرا نشیمن
تو بلبل بستان حسین ابن علی ہے

سلام

سلامی رن میں بیجاں ہو گیا تشنہ دہن دولہا   بنا تھا نام کو دنیا میں فرزند حسن دولہا

عجب شادی ہوئی زہرا و حیدر کے گھرانے میں   دلہن تھی لے کے ردا جلوے میں رن میں بے کفن دولہا

دوبارہ کردیا تیرہ برس کے سن میں ازرق کو   مثال حیدر کرار تھا شمشیر زن دولہا

دلہن دولہا کے لاشے پر یہ رن میں بین کرتی تھی   سدھارے تم جہاں سے جانب نہر لبن دولہا

تمہارا حال یہ دکھلایا مجھکو ہائے قسمت نے   سم اسپاں سے چکنا چور ہے سارا بدن دولہا

سناں پر سر تمہارا ہے تن مجروح رتی پہ   مرے اے گلبدن دولہا مرے سرو چمن دولہا

لگی کس کی نظر جوڑا شہانہ تر ہوا خوں سے   مرے رشک چمن دولہا مرے گل پیرہن دولہا

تمہیں رویا کریں گے اہل ماتم میرے بابا کے   بپا ہوگی تمہارے غم کی ہر جا انجمن دولہا

ہوئی دو گھر کی بربادی رہیگی یاد یہ شادی   نہ بھولے گا کوئی یہ غم تہ چرخ کہن دولہا

رسن بازو میں بیڑی پاؤں میں ہے طوق گردن میں   مصیبت میں ہیں سجاد علیل و خستہ تن دولہا

ہٹاؤ فوج اعدا کو اٹھو سمجھاؤ ناقے پر   چلیں ہیں شام کو اب خواہر شاہ زمن دولہا

کروں فریاد اس قوم جفا پیشہ کی میں کس سے   نہیں ہے سر پہ کوئی جز خدائے ذوالمنن دولہا

نہ تم ہو اور عمو ہیں نہ بھائی ہیں نہ بابا ہیں   علی و فاطمہ کا لٹ گیا سارا چمن دولہا

تمہارے بعد جینے کا نہیں اب لطف دنیا میں   بلا لو پاس اپنے مجھکو اے ابن حسن دولہا

یہ وہ دولہا دلہن ہیں حال انکا سن کے اے ناجی
رہینگے صرف شیون حشر تک سارے دلہن دولہا

نوحہ

دو روز کے پیاسے ہائے حسین احمد کے نواسے ہائے حسین   سر آپکا کاٹا ظالم نے شمشیر جفا سے ہائے حسین

کیا وقت مصیبت آپ پہ تھا تیغوں سے بدن جب چور ہوا
زخم آپکے باندھے زینب نے زہرا کی ردا سے ہائے حسین

تھے آپ بڑے نازوں سے پلے گر چند قدم مسجد میں چلے
دیتے تھے ہوا محبوب خدا دامان قبا سے ہائے حسین

خالق کو یہ خاطر آپکی تھی بھوکا نہ رکھا بچپن میں کبھی
آتے تھے انار و سیب سدا فردوس علی سے ہائے حسین

خط سینکڑوں لکھکر بلوایا زہرا و نبی کو رلوایا
دنیا کے لئے پیش آئے لعین تزویر و دغا سے ہائے حسین

لب خشک تھے اور خالی تھا شکم مہماں پہ تھے ظلم و ستم
محروم رہا ہوگا نہ کوئی یوں آب و غذا سے ہائے حسین

ہفتم سے ہوا بند آب رواں تھے کوفی و شامی دشمن جاں
تکلیفیں اٹھا کر کوچ کیا اس دار فنا سے ہائے حسین

بے سایہ پڑا ہے دھوپ میں تن جلتی ہے زمیں عریاں ہے بدن
زخموں میں بھری ہے ریگ رواں جنگل کی ہوا سے ہائے حسین

ملبوس خلد آئے بھیجا تھا اشتر تھے بنے محبوب خدا
کاندھے پہ چڑھایا عید کے دن کس لطف و عطا سے ہائے حسین

بچے تھے جو سارے تشنہ دہاں خیمے کے عقب کھدوایا کنواں
اعدا نے اسے بھی بند کیا سب رہ گئے پیاسے ہائے حسین

اک سمت تھا مجمع بیماروں کا اور ایک طرف غمخواروں کا
دو تین پہر میں چھوٹ گئے خویش و رفقا سے ہائے حسین

بعد آپکے کیا کیا ظلم سہے اک سال برابر قید رہے
چھوٹے بصد آفت اہل حرم زندان بلا سے ہائے حسین

جن روتے ہیں شہ پر اور ملک کیا غم میں اثر ہے آج تلک
آتی ہے صدا ناجی ہم کو یہ ارض و سما سے ہائے حسین

نوحہ

اے یارو کیسی چل گئی صرصر چمن چمن
لوٹا گیا ریاض پیمبر چمن چمن

ہر عندلیب پیٹتی ہے سر چمن چمن
برپا ہے ماتم گل حیدر چمن چمن

بہلاتی تھی بہشت میں اصغر کو یوں بتول
پھرتی ہوں تم کو گود میں لیکر چمن چمن

قربان جاؤں سہمے ہو کیوں تیر ظلم سے
دیکھو کھلے ہیں کیسے گل تر چمن چمن

بھوکے ہو تین روز کے پیتے نہیں ہو کیوں
جاری ہیں نہریں دودھ کی اصغر چمن چمن

کوثر پہ جھومتا ہے بہشتی سکینہ کا　　مصروف سیر ہیں علی اکبر چمن چمن
دیکھو یہ عون ہیں یہ محمد بھی کے لال　　پھرتے ہیں دونوں کیسے برادر چمن چمن
بازی کناں ہیں پتوں سے مرا کے درخت کے　　مسلم کے دونوں سرو صنوبر چمن چمن
دادی سے گر خفا ہو تو دادا کے پاس جاؤ　　لے کر پھریں گے ساقی کوثر چمن چمن

ناجی گل رسول کے ہم عندلیب ہیں
ہے اپنی جا بہشت کے اندر چمن چمن

دہری ردیف کو آخر تک قائم رکھ کر اس سے جو بیشمار فائدے اٹھائے گئے ہیں وہ ایک پختہ مشق ماہر فن ہی کا کام ہے۔ سرو صنوبر کا استعارہ ردیف کے ساتھ جو لطف دیرہا ہے اہل ذوق اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ایک مچلے ہوئے بچے کو لیکر ٹہلنا اور اسکو وہاں کی دلفریبیاں دکھا دکھا کر بہلانا اور پھر اُسکے کسی طرح نہ ماننے پر۔ مصرع "دادی سے گر خفا ہو تو دادا کے پاس جاؤ" کہنا شاعر کی فطرت شناسی اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

نوحہ

کہتے تھے شب قتل یہ مشتاق شہادت ہوگی سحر کب　　یارب ہمیں مرنے کی تمنا ہے نہایت ہوگی سحر کب
بیٹھے ہیں تری راہ میں اللہ نے گھر بار ہیں دوش پہ سر بار　　کب دیکھینگے سیر چمن گلشن جنت ہوگی سحر کب
کب شمر و عمر کو تہ شمشیر کرینگے کب خوں میں بھرینگے　　کم حشر کے دن سے نہیں اس شب کی طوالت ہوگی سحر کب
کیسی یہ شب آئی ہے کہ کٹتی ہی نہیں ہے گھٹتی ہی نہیں ہے　　اس شب کی ہے اک ایک گھڑی ہم کو قیامت ہوگی سحر کب
دنیا کی تمنا نہیں جینے سے ہیں بیزار مرنے پہ ہیں تیار　　پیاسے ہیں بہشت چشمہ کوثر کی ہے چاہت ہوگی سحر کب
کب زخم بدن خوب ہی کی شدت سے بھینگے کب سر یہ کٹینگے　　کب ہم غم و آلام سے پائینگے فراغت ہوگی سحر کب
فوارۂ خوں زخموں سے کب اپنے چھٹینگے کب کپڑے لٹینگے　　کب ہوگی اذاں آئیگی کب قتل کی نوبت ہوگی سحر کب
ہم سب ترے پیارے کہ ہوا خواہ ہیں شہ کے نیے ہیں　　اب سن نہیں سکتے حرم شاہ کی رقت ہوگی سحر کب

سب جاگ رہے ہیں کوئی اب تک نہیں سویا سب میں ترے جویا — کب جام شہادت ہمیں ہو ویگا عنایت ہو یگی سحر کب

سب کو ہے سر شام سے اندیشۂ شبخون اے خالق بیچوں — ہے سخت پریشاں ترے محبوب کی عترت ہو یگی سحر کب

کب پیش نبی جائینگے سر اپنے کٹا کر اے خالق اکبر — کب ہو گی نصیب احمد والا کی زیارت ہو یگی سحر کب

کب آب دم خنجر و شمشیر پئیں گے تا چند جئیں گے — کب ہو یگی آخر یہ شب رنج و مصیبت ہو یگی سحر کب

فردوس معلی کی ہوا کھائینگے کب ہم اے خالق عالم — کب ہو یگی حوروں سے بستر ہمیں وصلت ہو یگی سحر کب

انصار ہم اسکے ہیں ہم اسکے ہیں موالی جو سب کا ہے والی — کب خیمہ سے نکلیگا دل شاہ ولایت ہو یگی سحر کب

کب لشکر روبہ کو بھگا دینگے سوئے شام کب کھینچینگے صمصام — کہتے تھے یہ شیران بیابان شجاعت ہو یگی سحر کب

ناجی شب عاشور سحر تک بے رخنداں کہتے تھے یہ مرآں

انصار دل و جان شہنشاہ رسالت ہو یگی سحر کب

شریف اور اعلیٰ مقصد کیلئے مر مٹنا انسانی نصب العین ہے۔ زندگی کے اس نظریہ کو حضرت ناجی نے ایک خاص رفعت تخیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ ان کی نظر حقائق و معارف کے جن سربستہ رازوں پر پڑ رہی ہے اس کو صاحب بصیرت ہی خوب جان سکتے ہیں۔ راہ حق میں لڑ کر مر مٹنے کی اتنی شدید تمنا اور ایک سچے مظلوم کی رفاقت میں جان پر کھیلنے کے لئے اتنی بے چینی اولوالعزم اور پاک ہستیوں ہی کا حق ہے۔ خاصان خدا دراصل انھیں مقدس بزرگوں کا نام ہے۔

واقعہ نگاری اُن کے کلام کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ وہ اس خوبی سے واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ ناظرین کا ذہن تصور کی زحمت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ شعر پڑھتے ہی تصویر سامنے کھنچ جاتی اور پڑھنے والا ہمہ تن اس میں گم ہو جاتا ہے۔ اس محویت میں وہ سمجھتا ہے کہ گویا سارا واقعہ اُسکی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

لائے ہے کوئی آنش کوئی ساغر شربت پیتے نہیں حضرت

اک گھونٹ نہیں حلق مبارک سے اترتا بیمار ہیں حیدر

دوسری اہم اور نمایاں خصوصیت "بین" ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف واقعہ نظم کیا گیا ہے لیکن

اُس میں بلا کی شعریت اور دردمند دل کا سوز چھپا ہوتا ہے۔ رُلانا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ بناوٹی رونا بھی اُن کو نہیں آتا۔ اُن کا دکھا ہوا دل محض حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ "بین" میں واقعہ نگاری کو اس کمال سے گھلا ملا دینا کہ یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ بین نگاری کی گئی ہے یا واقعہ نگاری اور ساتھ ہی ان دونوں کے ملاپ ہی میں نہایت لطف سے واقعہ کو اپنی جگہ اور بین کو اپنی جگہ الگ الگ چمکانا حضرت ناجیؔ ہی کا کمال تھا۔ مثال ملاحظہ ہو۔

ہوئی دو گھر کی بربادی رہیگی یاد یہ شادی
نہ بھولے گا کوئی یہ غم نہ چرخِ کہن دولہا

کلامِ ناجیؔ کی ایک اور خصوصیت روانی اور بے ساختہ پن ہے۔ وہ بے تکلف شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

عباس سے کہتی ہے یہ عباس کی مادر اللہ سے رو کر
صحت کے لئے مانگو دعا اے مرے بیٹا بیمار ہیں حیدر

ایک دکھیاری ماں اپنے بچے سے مخاطب ہو کر اپنے بےچین دل کو منانے کا کیسا اچھا طریقہ نکالتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ معصوم بچے کی دعا (اور پھر اپنے باپ کے لئے) گڑگڑا کر مانگی جائے تو بارگاہ ایزدی میں قبول ہو کر ہی رہیگی۔ اور ساتھ ہی "اے مرے بیٹا" کہہ کر اُسکے نازک اور سہمے دل کو کس شفقت سے بہلا رہی ہے۔

غیر مانوس اور مشکل قافیوں کی وجہ سے حضرت ناجیؔ کے کلام کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ وہ مشکل سے مشکل قافیہ کو شعر میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں۔ شعر پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ قافیہ اسی مقام کے لئے خلق ہوا تھا۔ ایک جگہ دولہا (ردیف) کے ساتھ "انجمن" (قافیہ) کو اس خوبی سے استعمال کیا ہے!

تمھیں رو یا کریں گے اہلِ ماتم میرے بابا کے
بپا ہو گی تمھارے غم کی ہر جا انجمن دولہا

عربی اور فارسی الفاظ بھی اُن کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ وہ روایت بندی میں حد درجہ تحقیق سے کام لیتے ہیں۔

خط سینکڑوں لکھ کر بلوایا زہر اوبی کو رُلوایا
دنیا کے لئے پیش آئے لعین تزویر و دغا سے ہائے حُسین

حضرت ناجی کے کلام کے مطالعہ سے قطب شاہی دور کے مرثیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انکی بھی امتیازی خصوصیت "بین" اور "واقعہ نگاری" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ناجی کے ساتھ قدیم طرز مرثیہ نگاری بھی ختم ہوگئی۔ البتہ ان کے تلامذہ پر ان کے اسلوب کا اثر عرصہ تک باقی رہا۔



ہز ہائینس اعلیحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ سادس

چوتھا دور

سنہ ۱۳۰۱ھ سے سنہ ۱۳۲۵ھ تک

یہ دور بھی نہایت درخشاں رہا حضرت آصف جاہ سادس ۱۳۲۹ھ جو آصف تخلص فرماتے تھے ادب نواز اور شعر و سخن کے قدردان تھے خود بھی اچھے شاعر تھے اور باکمال شعرا کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ ان کی علم نوازی اور قدر دانی سخن کا شہرہ دور دور تھا۔ یوں تو شمالی ہند کے باکمال شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہو چکا تھا لیکن اس دور میں وہ اور مستحکم ہو گیا اس باہمی میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر پڑا سب کا رجحان صحیح شاعری کی طرف تھا۔ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا اور متفقہ طور پر اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ کی اس طرح رفتہ رفتہ متروکات کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی۔

اس وقت حیدرآباد میں اچھے اچھے ذی کمال اور صاحب فن شعرا کچھ تو دکن ہی کے تھے اور کچھ باہر سے آئے ہوئے تھے جنکی ایک طویل (کئی صفحات کی) فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں بنظر اختصار مائل، کیفی، توفیق، شاہ عزیز اور سیا (جن کے حالات اور نمونہ کلام صفحات مابعد میں درج ہے) کے علاوہ شمالی ہند کے چند اور دکن کے چند ممتاز و مشہور شعرا کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

حیدرآبادی شعراء:۔ میر قادر حسین فرق۔ میر تراب علی زور۔ محمد حسین ساماں۔ محمد مظفر الدین معلےٰ۔ فیاض الدین فیاض اقبال یار جنگ اقبال۔ غلام محمد عرب شوق۔ غلام علی جوش۔ میر دلاور علی دانش۔ میر یٰسین علی خاں امیر۔ امیر حمزہ حمزہ۔ سید محمد حسینی رفعت

سید احمد افسر۔ محمد وزیر الدین مہر۔ صاحبزادہ میر خیرات علی خاں سخی۔ نواب آصف یار الملک وزیر۔ میر محمد علی بخشی۔ امداد حسین عازم
میر مہدی حسین الم۔ میر محمد علی رنج۔ سید نوازش علی لمعہ۔ نواب صادق جنگ حلم۔ خواجہ بہار الدین دارا۔ صدیق احمد فہیم۔ عبد العلی طیش
منتخب الدین تجلی۔ میر نوازش علی مست۔ سید شاہ ابراہیم عفو۔ سید غلام محمد زعم۔ محی الدین محفوظ۔ لقمان الدولہ دل۔ اعظم علی شایق
احمد اللہ وصل۔ وحید الدین عالی۔ احمد نواز جنگ فانی۔ اعظم اللہ حسینی اظہر۔ ضیغم جنگ سرفراز۔ میر وزیر علی خاں جوش۔
عباس حسین خاں شہید۔ میر مہدی خاں مہدی۔ سید خواجہ دوست۔ شہاب الدین توقیر۔ عبد الصمد واصفی۔ سید محمد حسینی عقیل۔
عبد الحی بازغ۔ یٰسین بخش یٰسین۔ مجاہد الدین مجاہد۔ احتشام الدین تجلی۔ قادر حسین قادر۔ برہان علی مخمور۔ عبد الغفور خاں نامی
عبد الوارث خاں وارث۔ محمد علی خاں ناظم۔ صولت جنگ عابد۔ عبد الولی فروغ۔ شایق حسین صفیر۔

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے:۔ سید کاظم حسین شیفتہ لکھنوی۔ سید محمد کاظم حبیب کنتوری۔ حیدر یار جنگ نظم طباطبائی۔ شمس الحق
بیکش نھانوی۔ فصیح الملک داغ دہلوی۔ امیر احمد امیر مینائی۔ ظہیر الدین ظہیر دہلوی۔ احسان الحق زار دہلوی۔ نواب مرزا شکیب دہلوی۔ عبد الرحمٰن بیدل
سہارنپوری۔ محمد باقر فکر کانپوری۔ امراؤ مرزا نادان دہلوی۔ سید محمد شاہ وارثی بے نظیر۔ درگا پرشاد ذکا فتحپوری۔ نادر علی برتر قنوجی۔ عبد الصمد خاں
ضیغم لکھنوی۔ نجم الدین ثاقب بدایونی۔ عابد مرزا بیگم لکھنوی۔ سید محمد ضامن کنتوری۔ محمد جمال الدین اشک لکھنوی۔ فصاحت جنگ جلیل مانکپوری
اختر یار جنگ اختر مینائی۔ ابو الحمید آزاد دہلوی۔ نیر الدین ضیا دہلوی۔ امیر حسن فروغ لکھنوی۔ مرزا بہادر بہادر۔ اصغر یار جنگ اصغر۔

اس دور کے شمالی ہند کے باکمال شعراء:۔ میر مہدی مجروح۔ حکیم ضامن علی جلال لکھنوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم دہلوی۔
عبد الرحمٰن راسخ دہلوی۔ ریاض احمد ریاض خیرآبادی۔ سید علی نقی صفی لکھنوی۔ مرزا ہادی عزیز لکھنوی۔ علی احسن احسن مارہروی۔
سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی۔ محمد نوح نوح ناروی۔ حکیم برہم برہم گورکھپوری۔ حفیظ جونپوری۔ احمد علی قدوائی شوق لکھنوی۔
وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی۔ محمد نوح شہیر مچھلی شہری۔ محمد محسن محسن کاکوروی۔ عبد الحی بیخود بدایونی۔ محمد جعفر اوج۔ سید علی شاد
عظیم آبادی۔ امداد امام اثر عظیم آبادی۔ افتخار حسین مضطر خیرآبادی۔ وحید الدین احمد بیخود دہلوی۔ اور جدید طرز کے شعراء مثلاً
محمد حسین آزاد۔ الطاف حسین حالی۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی۔ اکبر حسین اکبر الہ آبادی۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی۔ برج نارائن چکبست

ڈاکٹر احمد حسین مائل

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور



ڈاکٹر احمد حسین مائل

مائل اور انکی شاعری

ڈاکٹر احمد حسین مائل ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حاجی محمد رضا حسین رضاؔ علاقہ صرفخاص میں میر منشی تھے۔ ان کا سلسلہ شمالی ہند میں قاضیان گوپامو اور مدراس میں والاجاہی خاندان سے ملا ہوا ہے۔

مائل نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین ہی سے حاصل کی۔ فارسی کے کچھ سبق اپنے والد کے استاد میر مہدی حسین ناقبؔ سے بھی تبرکاً لئے تھے۔ انگریزی، حساب، اقلیدس اور دیگر علوم میں کافی مہارت پیدا کی تھی چنانچہ امتحانات کی اعلیٰ اور مسلسل کامیابیوں کی بناء پر سرکار سے ماہانہ پچھتر روپے الونس پاتے رہے۔ پھر مدرسہ طبابت سرکار عالی میں ساڑھے پانچ سال تک زیر تعلیم رہے۔ اس اثناء میں انہیں سالانہ وظیفہ تعلیمی بھی ملتا رہا۔ کامیابی امتحان کے بعد نواب مختار الملک کے ہاتھ سے ۱۲۹۴ھ میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔

مائل کو طب یونانی اور ہومیوپیتھیک سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے فن کے خاص ماہر تھے چنانچہ ان کے بعض اہم علاج اصلاع سرکار عالی میں اسوقت تک زبان زد خاص و عام ہیں۔

طب کے بعد شعر و شاعری ہی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ شاعر پیدا ہوئے۔ فارسی میں اپنے والد رضاؔ سے اصلاح لیتے تھے اور جب سترہ سال کی عمر سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے تو محمد سرفراز علی وصفیؔ سے اصلاح لینی شروع کی۔ جو اپنے زمانہ کے ماہر فن اساتذہ سخن میں شمار کئے جاتے تھے

مائل کی جودت طبع اور ولولۂ سخن نے استاد کو بہت جلد اُن کی طرف مائل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین سال کے عرصہ میں شاگرد خود استاد بن گیا چنانچہ ایک مشاعرہ میں مائل اور ان کے ایک استاد بھائی احمد اللہ واصلؔ نے (جو ہمیشہ مشاعروں میں اُن کے ساتھ ساتھ رہتے تھے) اپنی اپنی غزلیں سنائیں تو جہاں اکثر اصحاب نے تعریف کی بعض حاسدوں نے آوازے کسنے شروع کیے اور کہا کہ "یہ تو اپنے استاد سے لکھوا لاتے ہیں" اس واقعہ سے یہ دونوں اتنا متاثر ہوئے کہ ترک شاعری کا تہیہ کر لیا اور دوسرے روز استاد کے یہاں اپنا تمام اثاثۂ شاعری لئے ہوئے پہنچے اور کہا کہ "یہ سب آپ کے حوالے ہے آئندہ سے ہم شاعری نہیں"

استاد نے نہایت شفقت و دلسوزی سے کہا کہ "آئندہ کا ارادہ تو آئندہ پر رہا مگر یہ بتاؤ کہ آخر یہ برہمی کیوں ہے؟ کیا واقعہ گذرا جو تم اتنا متاثر ہوئے" مائل نے رات کے مشاعرہ کا واقعہ سنانے کے بعد کہا کہ "اگرچہ عموماً بعض استاد اپنے شاگردوں کو بوقت اصلاح اپنے ایک دو شعر بھی دیدیا کرتے ہیں مگر حضرت کا یہ حال ہے کہ ایک آدھ مصرعہ اور شعر تو بڑی چیز ہے ایک آدھ لفظ بھی دینا پسند نہیں فرماتے۔ اور ہمارے ایسے اشعار قطعاً قلمزد فرمادئے جاتے ہیں جو ایک آدھ لفظ کی الٹ پھیر سے بہت چست ہوسکتے ہیں اور بعد اصلاح صرف وہی شعر چھوڑ دئے جاتے ہیں کہ جن میں ایک لفظ بھی نہ بنایا گیا ہو۔ اس طریقہ عمل کی یہ وضاحت بھی فرمائی گئی ہے کہ اس طریقہ سے طبیعت بڑھتی ہے حقیقت حال تو یہ ہے مگر ہم کو جو صلہ ملتا ہے وہ یہ کہ ہم استاد کا کلام اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے ہیں"۔

یہ واقعہ سنکر اور اس برہمی کی کیفیت کو دیکھ کر استاد متبسم ہوئے اور مبارک باد دی۔ شاگرد حیران تھے کہ یہ مبارکباد کا کیا محل ہے؟ پھر خود ہی استاد نے کہا کہ "شکرانہ کا دوگانہ ادا کرو اور خوشی مناؤ کہ اللہ نے تم کو یہ درجہ عطا فرمایا کہ اب لوگوں کو تمھارے اور تمھارے استاد کے کلام میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ اس سے بڑھکر اور کیا چاہتے ہو کہ تمھارے کلام کو تمھارے استاد کا کلام قرار دیا جاتا ہے"۔

مائل کی زندگی کا زیادہ تر حصّہ (یعنے تقریباً تیس سال) ملازمت کی وجہ سے اضلاع ہی پر گذرا۔ البتہ وظیفہ لینے سے تین سال قبل حیدرآباد میں دواخانہ علی آباد پر تبادلہ ہوگیا تھا نماز فجر کے بعد عموماً ایک دو گھنٹے مائل کی فکر سخن کا وقت ہوا کرتا تھا۔ اسکے بعد بارہ بجے تک مطب میں رہتے۔ واپسی اور طعام کے بعد کچھ دیر تک قیلولہ کرتے تھے پھر پانچ چھ بجے تک مطالعہ کتب اور جب کبھی ان کے فرزند ساتھ ہوتے تو یہ وقت درس و تدریس میں گذر جاتا۔ پانچ چھ بجے سے شب کے آٹھ نو بجے تک عموماً چار پانچ ملاقاتی روزانہ جمع رہتے اور جب کبھی مہینہ دو مہینہ کے لئے حیدرآباد آتے تو صبح سے شام تک احباب کا مجمع ہوتا اور اکثر و بیشتر شعر و سخن کا چرچا رہتا۔

قیام اضلاع کے باوجود اکثر اشخاص مائل کے یہاں اپنا کلام بغرض اصلاح روانہ کرتے تھے۔ وہ جدید حضرات کو اکثر یہی ہدایت دیتے کہ ایسے اصحاب کو اپنا کلام دکھائیں جن سے بالمشافہ اصلاح لینے کا موقع ملے۔ اکثر و بیشتر انکار کر دیتے تھے

لیکن پھر بھی متعدد اصحاب کے کلام پر ان کے شدید تقاضہ و اصرار کی وجہ سے نظر ڈالنی پڑتی تھی۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں اہلِ دکن کے علاوہ اہلِ شمال بھی شامل تھے۔ ان کے خاص تلامذہ میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔

۱۔ دائم جنگ الم۔ ۲۔ صادق جنگ حلم۔ ۳۔ سید یوسف حسینی اعظم۔ ۴۔ وجیہہ الدین رسا۔ ۵۔ مفتی اعظم علی شاہ یق عبدالسلام راغب۔ ۷۔ عبدالوہاب عاصم۔ ۸۔ خواجہ فیاض الدین وغیرہ۔

مائل ہمدرد اور یار باش انسان تھے۔ کم استطاعت مریضوں کو اپنے صرفہ سے بمبئی سے دوائیں منگوا دیتے تھے۔ ان کے یہاں اکثر مہمانوں کا مجمع رہتا اور بعض دوستوں کی سالہاسال تک پابندی کے ساتھ ماہانہ مدد کرتے رہے۔ آخر عمر میں مذہبی رنگ بہت حاوی ہوگیا تھا حضرت آغا داود صاحب سے بیعت تھی۔ انکی فرمائش پر ایک "میلاد مبارک" لکھی تھی جس کو انہوں نے بہت پسند فرمایا۔ اسکے بعد سے مائل نے سوائے نعت شریف کے کچھ نہیں لکھا چنانچہ ایک نعتیہ دیوان مکمل ہوگیا تھا۔

حیدرآباد میں تبادلہ ہونے کے بعد سے فرائضِ منصبی کے بعد اکثر وقت مراقبہ میں گذارتے تھے یہاں تک کہ سواری میں بھی یہی عالم رہتا تھا۔ جب وظیفہ لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اپنے مرشد کی درگاہ کے قریب آغا پورہ میں ایک مکان میں مقیم ہوگئے۔ چند روز کے بعد فالج میں مبتلا ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ سال مبتلا رہنے کے بعد ۲۲ رمضان ۱۳۳۲ھ ۹ مہر ۲۳ف کو وفات پائی اور اپنے مرشد کی درگاہ کی سیڑھیوں کے سامنے جانبِ غرب دفن ہوئے۔

مائل نے اردو زبان کی لازوال خدمت کی ہے۔ وہ دکن کے اُن خاص خاص شاعروں میں سے ہیں جن کے کارنامے دنیائے اردو میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ ان کے زمانہ میں دکن میں کوئی ان کا ہم پلہ شاعر نہ تھا۔ استاد الاساتذہ حضرت فیض کے بعد سے ان کے جیسا قادر الکلام پختہ مشق، اور پرگو شاعر کوئی نہیں پیدا ہوا۔ مائل میں وہ تمام صفتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک حقیقی اور بلند مرتبہ شاعر میں ہونی چاہئیں۔ رفعتِ تخیل، فکرِ کامل، قادر الکلامی، شوخیِ طبع اور جراتِ رندانہ ایسی خصوصیتیں بہت کم ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور فطرت کی یہی وہ فیاضی تھی جس نے مائل کو یکتائے عصر بنا دیا۔ انہوں نے قریب قریب ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اُن کی غزلوں میں شوخی، رندی و مستی، اور کہیں کہیں تصوف کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ اُن کے قصیدے "لفظی شان و شکوہ اور قادر الکلامی" کے اچھے نمونے ہیں۔ اُن کے مرثیے انکے قلم کی

روانی، اور قوت بیان کے دلچسپ ترجمان ہیں۔ اوران کی رباعیاں، نوحے، میلاد نامے، نعتیہ کلام، اور منقبتیں روحانی لذتوں اور گوناگوں قلبی کیفیتوں سے مالامال ہیں۔

مائل کے قریب قریب پندرہ ہزار شعر کا پتہ چلا ہے۔ اور جو کلام انہوں نے دوسروں کو دیدیا یا ان کے بعد تلف ہوگیا وہ اس کے سوا ہے۔ سنہ ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۳ء تک ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوچکے تھے۔ دو مثنویاں جن کے نام "نور ظہور" اور "ظہور نور" ہیں اور ایک "تحفہ دکن" جس میں ہر صنف سخن کے نمونے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ تقریباً سات ہزار شعر پر مشتمل ہے اور سنہ ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اسکی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر غزل پر مصنف کی وہ عمر درج ہے جو اسکی تصنیف کے وقت تھی۔ "تحفہ دکن" کے بعد انہوں نے چار ہزار شعر کا ایک دیوان بھی مدون کیا تھا۔ اسکے علاوہ آخر عمر میں نعتیہ کلام کا بھی اور ایک دیوان مرتب ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے قلمی نسخے اس وقت موجود ہیں۔ اس مدون کلام کے علاوہ بہت سی غزلیں، مرثیے، رباعیاں، اور معراج نامے وغیرہ خود مصنف ہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے محفوظ ہیں۔

مائل کے اس مجموعۂ شعر وسخن کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کی اصلی عظمت بے نقاب ہونے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ان کے یہاں کم غزلیں ایسی ملیں گی جو دو غزلہ اور سہ غزلہ نہوں۔ بعض بعض زمینوں میں تو انہوں نے سو سو کے قریب شعر لکھے ہیں۔

کلام مائل کی دوسری خصوصیت نہایت ہی سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی ہے۔ شاہ نصیر اور ذوق کے بعد اردو زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا ہو جو اس خصوص میں مائل کی ہمسری کر سکے۔ اس قسم کی بعض زمینوں کی مثالیں اور ان میں مائل کے اشعار کی تعداد کے علم سے مائل کی دقت پسندی اور قدرت کلام کا ثبوت ملیگا۔

۱۔ کیوں نہ تڑپے راستہ میں خاک پتھر زیر پا۔ قافیہ مضطر۔ ردیف زیر پا۔ شعر ۲۴

۲۔ آغوش نقش پا یہ ہے آغوش نقش پا۔ ،، ہوش۔ ،، نقش پا۔ ،، ۲۶

۳۔ آفتاب آئے چمک کر جو پیے جام شراب ،، سحر ،، جام شراب ،، ۳۴

۴۔ ہیں لب و خط رخ نور سفید و سبز و سرخ ،، گوہر ،، سفید و سبز و سرخ ،، ۲۵

۵۔ ہے عندلیب باغ سے دور اور شکستہ پر ۔	قافیہ اباغ ۔	ردیف سے دور اور شکستہ پر	شعر ۲۸
۶۔ دل میں ہیں کئی داغ بہ رنگ پر طاؤس	״ فرنگ	״ پر طاؤس	״ ۲۱
۷۔ دل لیکے اڑی کاکل جانانہ سر دوش	״ پروانہ	״ سر دوش	״ ۲۰
۸۔ خمیدہ ہو کر بنے گا ہر ایک تار گیسو ہلال عارض	״ بہار	״ گیسو ہلال عارض	״ ۳۵
۹۔ ہے نظر میں یہ جہاں پروانہ و فانوس شمع	״ آسماں	״ پروانہ و فانوس شمع	״ ۳۰
۱۰۔ تجھ کو لگائیں گے نظر آئینہ شانہ شمع	״ خبر	״ آئینہ شانہ شمع	״ ۱۴
۱۱۔ آسماں تجلی مہ انور دھواں بتی چراغ	״ پیغمبر	״ دھواں بتی چراغ	״ ۳۱
۱۲۔ یارب ہوں میرے گھر میں گل و مل بہار و باغ	״ نظر	״ میں گل و مل بہار و باغ	״ ۱۹
۱۳۔ جنبش میں زلف پر شکن ایک اس طرف ایک اس طرف	״ چمن	״ ایک اس طرف ایک اس طرف	״ ۲۰
۱۴۔ خاص تحفہ میں کچھ اے دلبر ہو سونے کا ورق	״ خنجر	״ ہو سونے کا ورق	״ ۲۳
۱۵۔ تیرتا ہے ڈوب کر دم تا بہ گردن آب میں	״ چلمن	״ آب میں	״ ۹۹
۱۶۔ فرقت کا نہیں رنج گلا اور ہی کچھ ہے	״ دوا	״ اور ہی کچھ ہے	״ ۳۴

مائل کے کلام میں متعدد غزلیں ایسی بھی نظر سے گذرتی ہیں جو غالباً اردو کے مشہور و معروف اساتذہ کی خاص غزلوں کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ میر، سودا، انشا، نصیر، انیس، دبیر، ناسخ، آتش، ذوق، مومن اور غالب غرض کوئی ایسا استاد نہیں جس کی غزل قصیدہ یا رباعی وغیرہ کی زمین میں مائل نے طبع آزمائی نہ کی ہو محض تفریح طبع اور بعض وقت قدرت کلام دکھانے کی غرض سے اس قسم کی کوشش کی گئی تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آورد اور التزام کے باوجود بعض شعر ایسے نکل پڑے ہیں جو واقعی ان اساتذۂ قدیم کے جواہر پاروں کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں ۔ ممکن تھا کہ مائل کے اس قسم کے اشعار بطور نمونہ و مقابلہ یہاں پیش کئے جاتے مگر اس موضوع پر آج سے [illegible] مائل کے ایک شاگرد اعظم نے ۱۳۲۲ھ میں سوا دو سو[۲۲۵] صفحات کی ایک ضخیم کتاب "زمزمۂ ہند و دکن" شائع کی تھی [illegible]

اکثر اساتذۂ فن کے کلام کے ساتھ ساتھ مائل کے کلام کو پیش کیا گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض جگہ شاگرد کا جوش عقیدت انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا اور اسی وجہ سے استاد کی شہرت بری طرح متاثر ہوئی اور انکی صحیح عظمت بے نقاب نہ ہو سکی۔

”زمزمۂ ہند و دکن“ اصل میں ان معترضوں کے جواب میں لکھی گئی تھی جو ایک دکنی شاعر ہونے کی وجہ سے مائل کی استادی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے اور زبان اور شعر و سخن کو بھی کسی خاص ملک بلکہ شہر یا محلہ کے رہنے والوں کی میراث سمجھے ہوئے تھے اس زمانہ میں اردو کے اہل زبان صرف وہی معدودے چند خاندان یا اشخاص سمجھے جاتے تھے جو دہلی یا لکھنو کے خاص خاص محلہ جات میں سکونت پذیر تھے اور دوسرے ملک یا شہر یا محلہ کے وہ صاحبان علم و فضل یا شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے بھی غیر اہل زبان سمجھے جاتے تھے جن کے اسلاف صدیوں سے اردو زبان کو مادری زبان کے طور پر استعمال کرتے آئے تھے۔ اور جو سوائے اردو کے اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے یہ مصنوعی اور مضحکہ خیز امتیاز اس درجہ مستحکم کردیا گیا تھا کہ دوسرے مقامات کے رہنے سہنے والے بھی خود کو غیر اہل زبان سمجھنے لگے تھے اگرچیکہ ان کی مادری زبان اردو ہی کیوں نہ ہو اور اسکے سوا وہ کوئی اور زبان بول ہی نہ سکتے ہوں۔

یہ مضحکہ خیز احساس آجتک باقی ہے گو اتنا شدید نہیں۔ لیکن یہ اردو کی ہمہ گیری کیلئے مضر ہے۔ اگر اردو کو صحیح معنوں میں ترقی کرنا اور تمام ہندوستان کی زبان کہلانا ہے تو اس قسم کے تعصبات دور ہونے چاہئیں۔ پروفیسر سلیم نے لکھا تھا کہ

> ”یہاں زبان اور قلم کے بہت سے دربان موجود ہیں جو کہتے ہیں جو الفاظ پہلے زبان میں بن چکے وہ سماعی ہیں ان پر قیاس کرکے نئے الفاظ بنانے کی اجازت نہیں ہے مگر یہ مقولہ ان اشخاص کا ہے جو پرانی لکیر کے فقیر ہیں جو اپنی زبان کو وسیع کرنا نہیں چاہتے بلکہ نئے بنائے الفاظ کو گھٹاتے اور ترک کرتے جاتے ہیں ....
>
> اردو زبان اب دہلی اور لکھنو میں محدود نہیں رہی ہے۔ وہ ان حدود کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے۔ اسکے لئے اب اسی قدر وسعت کی ضرورت ہے جس قدر کہ ہندوستان میں وسعت ہے“ (افادات سلیم صفحہ ۲۳)

یہی خیال مائل کا بھی تھا۔ انہوں نے پروفیسر سلیم کی اس تحریر سے تیس (۳۰) پینتیس (۳۵) سال قبل ہی سے اپنے کلام میں اسکی طرف اشارے کرنے شروع کردئے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اب اردو اپنی محدود نہیں رہ سکتی اور اب دکن بھی لکھنو کی طرح

غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی زبان کا لوہا منوالے گا۔ وہ کہتے ہیں۔ ع

لکھنو اب حیدرآباد دکن ہو جائیگا

اور یہ محض ایک شاعرانہ ترنگ ہی نہیں ہے۔ وہ صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر شعر و سخن کا یہی ذوق اور قدر دانی جاری رہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

مائل جو ہو قدر اس ہنر کی — دلی سے بڑھے یہ حیدرآباد

لیکن اس موقعہ پر اس حقیقت حال کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مائل کو جس ماحول سے مقابلہ کرنا پڑا وہ ان کے خیالات و معتقدات کے لحاظ سے نہایت ناخوشگوار تھا۔ اغیار تو اغیار خود اُن کے اہل ملک بھی یہی سمجھتے تھے کہ مائل ایک غیر اہل زبان شاعر ہیں اور وہ کسی طرح دہلی یا لکھنو کے کسی شاعر کے ہم پلہ بھی نہیں ہو سکتے اسلئے انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اہل ملک کی ناقدر دانی کی شکایت کی ہے وہ کہتے ہیں۔

مجھ کو تو قدر دانِ سخن کی تلاش ہے — مائل جو قدر دانِ سفارش ملا تو کیا

مگر افسوس ہے کہ مائل کی یہ ساری کوششیں ان کے حق میں مضر ثابت ہوئیں عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ وہ ایک مغرور شاعر ہے اور اہل زبان اساتذہ کے ساتھ خواہ مخواہ مقابلہ کرتا ہے۔ اسکی اصلی وجہ تو یہی تھی جو مائل نے بیان کی ہے

قدر مائل کی ہو کیوں کر کہ ہے مائل دکنی — وہ دکھاتا ہے یہی عیب ہنر سے پہلے

نشو و نما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیونکر ہوگی — گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنر ہم

مائل اپنے اہل ملک کی اصل کمزوری سے واقف تھے۔ اس کو دور کرنے کی کوشش انہوں نے اس طرح سے بھی کی کہ اہل زبان شعراء کی اچھی سے اچھی غزلوں کے جواب میں خود بھی اعلیٰ درجہ کی غزلیں لکھیں اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اگر دکن کا بھی کوئی شاعر چاہے تو برابر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

مائل نے غزل لکھی ہے مومن کی غزل پر — تھی شہر کی اب ہو گئی دکھن کی زمیں یہ

اسی طرح وہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ اگر توجہ کرے تو ایک حیدرآبادی شاعر اہل دہلی یا اہل لکھنو جیسی زبان لکھ سکتا ہے

توجہ اگر ہو تو ارد و ہے کیا چیز　　　　کہ راز خدا آدمی جانتا ہے

ساتھ ہی اپنے اہل ملک کو یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ تم جن کو اہل زبان سمجھتے ہو وہ بھی تو میری (یعنے ایک دکن کے شاعر کی) تعریف کرتے ہیں ؎

گیا میں جو مائل خوش بیاں کئی اہل ہند تھے جمع واں　　　　ہوئے پہلے میرے سخن سے خوش ہو پھر سخن کے اثر سے خوش

وہ میں دکھن کا شاعر ہوں بتان ہند کی تجھ پہ　　　　عنایت ہے نوازش ہے کرم ہے مہربانی ہے

مرے اشعار سن کر کہتے ہیں اہل زبان مائل　　　　دکن کا رہنے والا ہے کہ یہ ہندوستانی ہے

پھڑک جاتے ہیں اہل ہند مائل کی غزل سن کر　　　　دکن کے شاعروں کی بھی طبیعت ایسی ہوتی ہے

مائل کہاں سے آگئی ایسی زباں تجھے　　　　قائل ہیں اہل ہند تری بول چال کے

مجھے پھر سپہر شاعری کہتے ہیں جب مائل　　　　کہ سارے ہند میں ہے مجھ سے روشن نام دکھن کا

یہ محض شاعرانہ تعلیاں نہیں ہیں بلکہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند کے اکثر شاعر اور اہل ذوق مائل کی زبان اور قدرت کلام کے معترف تھے اور ان میں سے بعض تو اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ شمس العلماء حافظ نذیر احمد کے فرزند رشید بشیر الدین احمد دہلوی نے ایک دفعہ مائل کو لکھا تھا کہ :-

> خدا خدا کر کے ایک دوست کی عنایت سے آپ کا دیوان مجھے ملا اور میں نے بغور اسے پڑھا میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں شاعر نہیں ادیب نہیں مگر اچھے برے کی تمیز مجھ میں ہے۔ اور گو اہل زبان ہونے کا فخر نہیں مگر وہاں کا رہنے والا ہوں جہاں کی زبان مستند گنی جاتی ہے یعنے دلی اور ایسے شخص سے پڑھا لکھا ہے جس کی زبان آج ہند میں بے نظیر ہے یعنے مولوی نذیر احمد مدظلہ العالی بس ان خصوصیتوں کے لحاظ سے مجھے بھی تھوڑا مذاق فہم سخن میں ہونا چاہیے اور الحمد للہ کہ کچھ ہے۔ میری بھی رائے ہے کہ آپ کا کلام اعجاز مسیحائی کا عجیب اثر رکھتا ہے۔ دکن کے لوگوں سے زیادہ اہل ہند کو ان کی قدر کرنا چاہیے کیا اچھا ہے کہ میں نے آپ کا ایسا شخص نکالا جس نے دکن کا نام روشن کیا ہے۔ مورخہ ۱۲ ربیع ۱۳۱۲ھ (ماخوذ از تذکرہ ہند و دکن صفحہ ۲۱۱)۔

مائل اپنے مقصد (یعنے اہل دکن کے احساس پستی کو دور کرنے) میں پوری طرح سے کامیاب ہوجاتے اگر ان کے ہمعصروں داغ اور امیر جیسے اعلیٰ پایہ اساتذہ سخن سے دکن کے اہل ذوق اُس وقت مرعوب و متاثر نہ ہوتے۔ اگرچہ جودت طبع، پرگوئی اور عاشق مزاجی میں وہ داغ سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن داغ کی طرح وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھے اور نہ انکی شاعری درباری قدرافزائیوں کی وجہ سے سربلند ہوسکتی تھی۔ ان کی ساری زندگی شہر کی شعروسخن کی محفلوں اور اہل ذوق کے مجمعوں سے دور اضلاع اور دیہات کے دواخانوں اور مریضوں میں گذرگئی۔ اپنے اس پیشہ کی مصروفیتوں کے بعد جو کچھ وقت ملتا اسکو وہ محض اپنے فطری ذوق کی بنا پر شعروشاعری میں صرف کرتے۔ مگر اس پرخلوص اور بےغرض خدمت کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی پریشانیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک الشعراء مرزا داغ کو یہ خیال دلایا گیا کہ مائل اُن پر چوٹ کیا کرتے ہیں۔ اور دکن کے اہل ذوق طبقہ میں مائل کی روزافزوں مقبولیت کو دیکھ کر کوئی تعجب نہیں کہ داغ اس پر بھی یقین کرنے لگے ہوں چنانچہ مشہور ہے کہ اعلیحضرت غفران مکاں نے کبھی اُنسے مائل کی نسبت دریافت فرمایا تھا تو داغ نے یہی جواب دیا کہ ”وہ شاعر بہت اچھے ہیں مگر مجھ پر ہمیشہ چوٹ کیا کرتے ہیں“۔ ممکن ہے کہ داغ کا یہ خیال اسلیے بھی پختہ ہوگیا ہو کہ مائل نے اپنے اہل وطن کا احساس پستی دور کرنے کے لیے بعض شعر ایسے بھی کہے جو علانیہ داغ کے اشعار کا جواب معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

زباں کا بڑا جن کو دعویٰ ہے مائل — انھیں بھی تو آئی زباں آتے آتے

کیوں مادری زبان پہ ہے مدعی کو ناز — مائل وہ اک کنیز ہے میرے کمال کی

وحشی کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اگرچہ مائل دبستان لکھنو سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس دبستان ہی کے رنگ پر قائم نہیں رہے۔ ان کے یہاں بہت سا کلام دبستان دہلی کے رنگ میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے بعض شعروں پر تو بالکل داغ کے اشعار کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ انکی شاعری اصل میں ایک ایسا سنگم تھی جہاں دہلی اور لکھنو دونوں مقامات کی خصوصیات سخن ایک دوسرے سے بغلگیر ہورہی تھیں۔ مائل نے ان دونوں دبستانوں کو ملاکر دکن میں ایک نیا دبستان پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اگرچہ وہ اپنے ہم خیالوں کے فقدان کی وجہ سے اس میں خاطرخواہ کامیاب نہیں رہے۔

مائلؔ کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان باغ و بہار نظر آتا ہے، جذباتِ حسن و عشق کے علاوہ۔ مانگ، چوٹی، جوبن اور کمر سے متعلق بھی بعض ایسے ایسے شعر لکھ گئے ہیں جو شاید آج مبتذل، سوقیانہ اور خلاف تہذیب سمجھے جائیں اور صحیح رنگ تغزل اور ذوق سلیم پر گراں ہوں مگر اس زمانہ کے زندہ دل عوام کا مذاق اور مائلؔ کا ایک خاص رنگ دکھانے کی خاطر اس قسم کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

لئے بوسے جو میں نے تین چار آہستہ آہستہ
دیا کافر نے سینہ کو ابھار آہستہ آہستہ

سنگے گننے ہٹکئے شرما کے وہ
کی خطا، بوسے جو گن گن کے لئے

یہ نمایاں ہے ان کے جوبن سے
کھیل کھیلے ہیں دست دشمن سے

لچکتی کمر سے تھرکتی نظر سے
کلیجے میں لیں چٹکیاں آتے آتے

کیوں پوچھتے ہو وصل میں ہاتوں کو کیا ملا
تیری کمر ملی ترے بند قبا ملے

دبانے سے نہیں دبتا شب وصل
وہ ہے ابھرا ہوا جوبن کسی کا

مائلؔ کا سب سے زیادہ درخشاں رنگ شوخی اور ظرافت ہے۔ غالباً یہ انداز یا تو استاد وصفی لکھنوی کا اتباع ہے یا ہمعصر شعرائے لکھنو کے برابر اپنے کو ثابت کرنے کا خیال، لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ صحیح رنگ تغزل سے بیگانہ تھے جلیہ اور لباس سے قطع نظر واردات عشق اور معاملات محبت سے متعلق سیکڑوں شعر ہیں جو باعتبار لطف زبان و اسلوب بیان لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً یہ چند شعر ؎

ہاں بجا۔ سچ۔ تم کو کیا معلوم عشق و عاشقی
بات بھولی ہے مگر انداز معشوقانہ ہے

یارب نہ پوچھ حشر کے دن درد دل کا حال
تو میرا ہم مذاق نہیں تجھ سے کیا کہوں

صاف کہتا ہوں خدایا وہ خدائی نہ کرے
بخشنا یاد نہ ہو جس کو گنہگاروں کا

زور جھ پر ملک الموت کا چل ہی نہ سکے
منہ پہ منہ تم جو رکھو جان نکل ہی نہ سکے

زمزمہ، نالۂ بلبل ٹھہرے
میں جو فریاد کروں غل ٹھہرے

لڑائی حضرتِ مائل سے ہے اگر منظور — نظر نظر سے زباں سے زباں لڑا دینا

داورِ حشر سرِ حشر دکھا وہ قدرت — میں جہنم سے بچوں اور ترا احساں بھی نہ ہو

خدا کی بات موسیٰ کو مبارک — ہمارے کان ہوں تیری نہیں ہو!

یارب مرے اعمال کے دفتر کے برابر — قسمت کا بھی دفتر ہو جداگانہ سرِ دوش

مائل یوں تو رند خرام اور آزاد خیال نظر آتے ہیں لیکن ان کا دل سوز و گداز اور احساس خودی اور خوف خدا سے معمور تھا۔ اسی کے اثر سے ان کے کلام میں اخلاق و تصوف کی بھی جھلک ہے اور یہ خشک مضامین بھی ان کے خاص اسلوبِ بیان کی وجہ سے بہت پرکیف ہو گئے ہیں۔ مثلاً

تم کو بھی ہے کمال تو ہم کو بھی ہے کمال — تم بخششوں میں طاق ہوئے ہم گناہ میں

سارے گنہگار چلے کیا ہوا کی چال — کیوں پل صراط پر کوئی نقش قدم نہیں

خیالوں میں نگاہوں میں مخفی ہو — پھر اس پر یہ غضب پردہ نشیں ہو

تیری کثرت کا یہ غوغا ہے بھٹکتے جاؤ — تیری وحدت کا یہ ایما ہے نگہباں ہوں میں

یا الٰہی مرا دل ہے کہ تماشائے طلسم — کبھی قطرہ نظر آیا کبھی دریا مجھ کو

داورِ حشر نے کس سوختہ دل کو بخشا — خلد کہتا ہے جہنم سے بدل جاؤں گا

موسیٰ نہیں ہوں میں نہ کروں لن ترانیاں — پردہ اٹھا دو بیچ سے گفت و شنید کا

حج کو چلا جو میں تو ملا کعبہ ہر جگہ — تو کس طرف نہ تھا ترا جلوہ کدھر نہ تھا

جلوہ آئینہ نما ہے تری یکتائی کا — کس کو دیکھوں کہ یہ موقع ہے خود آرائی کا

ہیں جا بجا چھپے ہوئے گوشے نقاب کے — تو پردہ پوش حسن ترا پردہ در ہوا

یہ رسم آپ کے دربار میں نرالی ہے — جو خود کو بھول کے آیا وہ بے قصور آیا

مائل کو اپنے ہم عصروں پر یہ فضیلت ہے کہ انہوں نے دبستان لکھنؤ کی بھی پیروی کی ہے اور دبستان دہلوی نے بھی

علیحدہ نہیں رہے۔ زبان کی ترقی کے خیال میں مختلف فیہ الفاظ اور متروکات کا خیال بھی بالائے طاق تھا۔ ان کی یہ فراخ حوصلگی قابل ستائش ہے۔ اس آزادروی کو گمراہی کا مترادف سمجھنا (جیسا کہ سمجھا گیا ہے) صحیح ہو یا نہ ہو مگر وہ لکیر کے فقیر نہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں یکسانیت مفقود ہے باوجود ان باتوں کے وہ بہت پر گو اور کہنہ مشق نظر آتے ہیں۔ زبان میں لوچ، بیان میں شوخی ہے خیالات میں صداقت تخیل میں رفعت ہے غرض ان کا دیوان گل ہائے رنگارنگ کا گلدستہ ہے وہ خود بھی کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں ؎

مرے دیوان میں ہر رنگ کے ہیں شعرائے مائلؔ
وہی جانے وہی پہچانے جو اس فن میں کامل ہے

سیّد جلال الدین توفیق

از

محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے، ایل ایل بی
جامعہ عثمانیہ

سیّد جلال الدّین توفیق

ہندوستان میں دورِ آخر کے فارسی شعراء نے جو جدّت طرازانہ روش اختیار کی تھی اور جس کو ایران کے شعراء اور تذکرہ نگار بدیع الاسلوبی یا تازہ گوئی کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ بیدلؔ اور ان کے معاصرین کے ہاتھوں میں پہنچکر، معنی آفرینی یا خیال بندی کے نام سے بڑی حد تک لفظوں کا گورکھ دہندا بنگئی تھی۔ تاہم اُردو شاعری کے لئے یہ ایک نئے اسلوب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جن شعراء نے پہلے پہل یہ طرز اختیار کی تھی، وہ عام طور پر اردو شعرا میں شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، لیکن بالآخر معاصرین کی تنقیدوں اور دوسرے خاص اسباب نے ان معنی آفریں اور خیال بند شعراء کو ایک ایسے راستہ پر لا ڈالا، جو اردو شاعری کے لئے ایک نئے باب کا آغاز ثابت ہوا۔

اُردو میں اس طرز کے علمبرداروں میں حکیم مومن خاں اور مرزا غالب بہت مشہور ہیں۔ ان دونوں میں مرزا غالب کو ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔ غالب نے ابتداء میں خیال بند فارسی شعراء کی تقلید کرنی چاہی، لیکن انکی طبیعت کی صلاحیت اور معاصرین کی تنقیدوں نے انکی شاعری کو گل و بلبل کی قدیم اردو شاعری اور معنی آفرین شعراء کی طرز سے مختلف لیکن ان دونوں طرز کے بہترین خلاصہ سے مخلوط، ایک جداگانہ طرز کا موجد بنادیا۔ جو آج "غالب کے رنگ" کے نام سے تمام اردو خوانوں سے روشناس ہے

اس خیال بندی اور معنی آفرینی کا دلدادہ ایک شاعر دکن میں پیدا ہوا تھا، جس کا نام جلال الدین اور تخلص توفیق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دکن کے طول و عرض میں اسکے خاص طرز کی خوب شہرت ہوئی، اور بچہ بچہ اسکے کلام سے واقف ہے، لیکن دکن سے باہر اسکی حقیقی عظمت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اسکے کئی اسباب ہیں جن کے منجملہ ایک سبب خود اس شاعر کی افتادِ طبیعت ہے، جس نے اسکو نام و نمود کی خواہش سے دور رکھا۔ دوسرے اسکا دیوان جو اسکی زندگی کے آخری ایام میں چھپنا شروع ہوا تھا، لیکن جس کو مکمل حالت میں دیکھنا اسکے مصنف کو نصیب نہ ہو سکا۔ طبع ہونے کے تھوڑے عرصہ کے اندر نایاب ہوگیا

اور اب مشکل سے اس کا کوئی نسخہ دستیاب ہوتا ہے۔

راقم السطور کی نظر میں توفیق کا دیوان، اردو کے ان دیوانوں میں سے ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان ڈھائی سو صفحات میں فکر سخن کے بعض ایسے نمونے موجود ہیں جس پر زبان اردو بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس میں انسان کے ہر جذبہ اور ہر حالت، رنج خوشی، غنا احتیاج، رفعت پستی، رشک قناعت کے مطابق ایک مشریک مل جاتا ہے۔ پڑھنے والا اپنی پسند کے اشعار پڑھتا جاتا ہے، لیکن اُسے سیری نہیں ہوتی۔ علامہ سید اشرف شمسی مرحوم، پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ، جو ایک عالم متبحر اور با مذاق شاعر تھے، اپنی خاص خاص حالتوں میں توفیق کے بعض اشعار پڑھ پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ ان اشعار میں سے راقم الحروف کو صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں قسمت آئندہ مری ۔۔۔ خواب نادیدہ کی کہنی پڑی تعبیر مجھے

واقعہ یہ ہے کہ ہر صاحب بصیرت شاعر کی طرح توفیق کائنات اور اس کی بوقلمونیوں کو ایک خاص اور عموماً اپنے ذاتی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اور جو خارجی یا داخلی اثرات اور کیفیات ان پر طاری ہوتی تھیں۔ ان کو اپنے خاص اسلوب میں بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک اوپری، دل سے پڑھنے والا ان کے دیوان کے عام تقلیدی مضامین، یا بھرتی کے اشعار (جن کی غزل گو شاعر کے کلام میں کمی نہیں ہوتی) کو پڑھ کر ان کی کاوشوں کی کماحقہ داد نہیں دے سکتا۔ لیکن ان کی شاعری کو سمجھنے کے خیال سے جو شخص ان کے دیوان کو پڑھے گا، اس کو عام تکراری مضامین کے درمیان بکھرے ہوئے اہم حقائق اور شعری تخیلات قدم قدم پر مل جائیں گے۔ وہ یقیناً محسوس کریگا کہ شاعر کا ذہن اکثر ایسے مضامین تک پہنچ گیا ہے جن کو کسی اردو شاعر کی فکر نے آج تک مس نہیں کیا۔ یا پھر وہ دیکھے گا کہ عام مضامین کو شاعر نے ایک ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے جس سے مضمون میں ایک تازگی پیدا ہو گئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ توفیق کی ادبی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس عام ماحول سے کچھ مختلف نہیں تھا جس میں عام طور پر انیسویں صدی کی ابتدا تک اردو کے عام انشا پردازوں یا شاعروں کا نشو و نما ہوتا تھا۔ وہی متداول

فارسی اور عربی کتابیں انھوں نے پڑھیں جو عموماً لوگ پڑھتے آئے تھے۔ حیدرآباد دکن میں جہاں ان کا نشو و نما ہوا تھا اور جہاں یہ پیوند خاک ہوئے، شعر و سخن کے قدیم طرز میں تبدیلی پیدا کرنے والے کوئی اسباب ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ خود غالب، جن کی طرز میں توفیق شاعری کرتے تھے، ابھی شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ توفیق کی طبیعت کی اپج تھی کہ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے ایک نئی راہ نکال لی۔ اسی لئے انکی شاعری دکنی اسکول کی شاعری ہے۔

توفیق کی ولادت ۱۲۱۱ھ میں ہوئی۔ انکا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو عرصہ سے ہندوستان میں ارشاد و ہدایت کا مرکز رہا۔ توفیق کے جد اعلیٰ حضرت سید علی گجرات کے رہنے والے تھے۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں وہ حیدرآباد آئے یہاں بہت سے امراء اور علزئی افغان ان کے مرید ہوئے۔ اسی تعلق کے باعث وہ یہیں رہ گئے۔ توفیق کے والد مولانا سید ابراہیم تصدیق ایک باخدا بزرگ اور عالم تھے۔ شعر و سخن کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ توفیق کی تربیت عام طور پر اپنے والد ہی کے ہاں ہوئی۔ توفیق کے شعر و سخن کے طرف میلان کے متعلق مولانا سید اشرف شمسی دیوان کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا توفیق کی لیاقت نہایت اچھی تھی۔ اور چونکہ ان کے والد بزرگوار کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، اور شعرائے بلدہ میں تحقیق زبان کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے اور رات دن ان کے مکان میں شعرا کا مجمع اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، رفتہ رفتہ مولانا کی طبیعت سخن سنجی کی طرف مائل ہوگئی۔"

مروجہ علوم کے علاوہ، توفیق فن طب سے بھی فی الجملہ آگاہی رکھتے تھے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہندی سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ غزلوں سے اس دلچسپی کا پتہ نہیں چلتا، البتہ چند مثلثات اور ٹھمریاں ہندی بھاشا میں لکھی ہیں۔

مولانا شمسی توفیق کی ابتدائی مشق سخن کا ایک دلچسپ واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ "مجھے خوب یاد ہے کہ توفیق صاحب کے اوائل مشق سخن میں ایک مشاعرہ "باغ عامّ" میں ہوا تھا۔ انکے ایک مطلع پر مشاعرہ گونج اٹھا تھا۔ مطلع یہ تھا۔

گل ہیں خاموش یہ سنسان چمن میں کیا ہے
بات کرتے نہیں غنچوں کے دہن میں کیا ہے

انہوں نے پھولوں کے گملوں کے پاس بیٹھکر یہ مطلع پڑھا تھا، جو بہت لطف دے گیا۔ واقعی مطلع بلحاظ موقع

مشاعرہ نہایت مناسب واقع ہوا ہے۔ غزل بھی خوب کہی تھی"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توفیق نے فارسی شعرا اور اساتذہ کے کلام کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ اسی لئے شاعری کی اصطلاحات تلمیحات اور مسلمات کا وہ بہت صحیح استعمال کرتے ہیں۔ اردو کی طرح ایک دیوان انہوں نے فارسی میں بھی چھوڑا ہے، جس کی مولانا شمسی نے بڑی تعریف لکھی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ توفیق نے اساتذہ اردو میں میر، سودا، درد، مومن اور غالب کا خوب مطالعہ کیا تھا جس کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ فارسی اور اردو کے معنی آفرین، اور خیال بند شعراء کی نازک خیالیوں سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ اور اسی طرز میں وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔

توفیق نے جس وقت شاعری شروع کی، اس وقت حیدرآباد میں حضرت فیض اور ان کے تلامذہ کی سخن سنجیوں کے خوب چرچے تھے۔ خود توفیق کے زمانے میں مشرف جنگ فیاض اور حفیظ الدین یاس اس دبستان کے مشہور اساتذہ تمام شعری تحریکات کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ نوجوان شعرا کے جمگھٹے دن رات ان کے اطراف رہا کرتے۔ توفیق بھی ان مشاعروں میں کبھی کبھی کھنچے چلے جاتے لیکن عملاً اس دبستان کی شعری تحریکات سے یہ علیحدہ رہے۔ میر تقی میر کی طرح وہ ایک عزلت گزیں اور تنہائی پسند انسان واقع ہوئے تھے۔ اسی لئے اپنے گوشہ عافیت کے اندر ہی رہنا انہیں آخر تک پسند رہا۔ یہ توفیق کے لئے اچھا بھی ہوا، کیونکہ وہ فیض اور ان کے اسکول کی شاعری کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ فیض کی شاعری دہلی اسکول سے بہت متاثر تھی جس میں محاورہ بندی، اور روزمرہ کے علاوہ خاص خاص مضامین کا عام طور پر بہت لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اگر توفیق اس طرز سے متاثر ہوتے تو ان کی اپج اور فطرت جس کو خیال آفرینی اور اسالیب کی بداعت سے خاص لگاؤ تھا، دب کر رہ جاتی اور وہ اپنے طرز سخن میں کوئی انفرادیت نہیں پیدا کر سکتے۔

توفیق کی اس افتاد طبیعت نے انہیں مومن اور غالب کے کلام کی طرف مائل کر دیا۔ انکی شاعری عام طور پر مومن خاں کی نازک خیالی اور غالب کی بدیع الاسلوبی کا آمیزہ ہے۔ استاد الملک آغا سید علی شوشتری نے توفیق کے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ مولانا شمسی نے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"ادیب کامل، محقق فاضل آغا سید علی شوشتری المخاطب بہ ثنا والملک نے انکی نظمیں سن کر مجھ سے کہا تھا کہ توفیق بڑے نازک خیال اور جادو بیان ہیں۔ ان کا کلام اسی درجہ پر پہنچا ہے، جس درجہ پر مومن اور غالب کا کلام پہنچا تھا"

ممکن ہے کہ بادی النظر میں آقائے موصوف کی یہ رائے ذاتی اثر کا نتیجہ سمجھی جائے۔ لیکن اس میں بڑی حد تک اصلیت ہے۔ توفیق کے کلام کا طرز مومن اور غالب کے بہت مشابہ ہے۔ یہ مناسبت طبعی کا سبب تھا کہ وہ ان اساتذہ کی طرف بہت راغب تھے۔ جس کا اثر توفیق کے کلام میں مختلف صورتوں سے ظاہر ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ توفیق کے مذاق شاعری پر مومن اور غالب کا اس قدر اثر تھا کہ اگر ان کی اپنی فطرت اور بعض طبعی رجحانات اس اثر سے بغاوت پر کمر بستہ نہ ہوتے اور اپنے لئے راستہ نکال نہ لیتے تو شاید توفیق غالب کے ایک مقلد تصور ہوتے۔

توفیق طبعاً اور نسلاً ایک صوفی تھے۔ ان کے مسلک میں دنیا بالآخر گذشتنی اور گذاشتنی شئے تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے یہ اثرات بھی پختہ ہوتے گئے اس خاص افتاد طبیعت سے متعلق ایک واقعہ قابل لحاظ ہے جو توفیق کے حقیقی بھتیجے مولوی سید اللہ بخش صاحب توحید نے دیوان کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"انتقال کے گیارہ مہینے پہلے جبکہ بعارضہ بخار علیل ہوئے اور حالت نازک ہو گئی تو آئین مذہب مہدویہ کے موافق ترک دنیا، ترک لباس کر کے فقیر ہو گئے۔ اور اسی روپیہ کی ماہوار کی ملازمت چھوڑ دی۔ باوجودیکہ وظیفہ کی مدت پوری ہو چکی تھی مگر ترک دنیا کرنے کے بعد وظیفہ لینا خلاف توکل سمجھا" مطبوعہ دیوان ص۶

توفیق کی اس میلان طبیعت نے انکی شاعری میں چند خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں نظر آئیگا۔ غزل گو شعراء میں درد کو چھوڑ کر تمام اردو شعراء میں توفیق کا کلام اس حیثیت سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ انکی بعض مقبول اور بہترین غزلیں وہ ہیں جس میں تصوف کی چاشنی ہے۔ مثال کے لئے ذیل کی مشہور غزل دیکھئے۔

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردہ راز میں — کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حسرتیں چھا گئیں — کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہ آئینہ ساز میں
کبھی تو بھی طالب رحم ہو کبھی تو بھی غیر پہ جان دے — کبھی جلوہ گر ہو خدا کرے ترا ناز میرے نیاز میں

کہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مری آنکھ سے نہ ٹپک پڑے
کہ گداز عالم خون دل ہے مرے جگر کے گداز میں

تری برق جلوہ چلا چکی تھی اٹھا کے پردۂ رخ مگر
مری بے خودی نے چھپا لیا مجھے اپنے پردۂ راز میں

میری شہرتیں مجھے کھینچ لائیں فریب کے وگرنہ میں
وہ طلسم عالم راز ہوں کہ رہا ہوں مدتوں راز میں

کسی طرح ہو تو گی سحر مگر اب یہ ڈر ہے لگا ہوا
مری شام غم نہ شریک ہو کہیں انکی زلف دراز میں

وہ طلسم گم شدگی ہوں میں کہ فنا ہے اپنی بقا مجھے
مری خامشی ہے نوا گری میں نہاں ہوں پردۂ راز میں

توفیق بزم خیال میں نہ چلے گا میرا پتہ کہیں
نگہ حقیقت شوق ہوں مجھے ڈھونڈ چشم مجاز میں

تصوف کا رنگ توفیق کی طبیعت پر بہت غالب تھا۔ اسکی بدولت وہ ایک صاحب فکر شاعر بن گئے تھے۔ توفیق کی حقائق نگاری اور نفس انسانی کی گہرائیوں تک رسائی اسی کا نتیجہ ہے۔ اسکے علاوہ انکی شاعری میں جہاں کہیں درد پیدا ہو جاتا ہے، وہ بھی اخلاقی اصول اور بلند حوصلگی کا سبب ہے۔

اردو شاعری میں انقلاب سے پہلے تک، عام اردو شاعروں کا کمال، عموماً مقررہ مضامین کو بہ تغیر اسلوب باندھنا تھا۔ یہ کہنا تو درست نہیں کہ قدیم شعرا کے ہاں خیال کی کچھ اہمیت نہیں تھی، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اسلوب اور طریقہ اظہار کو خیال پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی ہمت زیادہ تر صفائی زبان، روزمرہ، محاورہ، بدیعیات اور بیان کی خوبیوں پر صرف ہوتی تھی۔ پہلے پہل نظیر اکبر آبادی نے اس اصول سے بغاوت کی، لیکن مومن اور غالب کی بدیع الاسلوبی نے رفتہ رفتہ محاورہ بندی اور روزمرہ کی دلدادگی کے اثر کو کم کیا۔ بعد کے شعرا کے لئے خصوصاً غالب نے معاصرین کے طعن و تشنیع کو برداشت کر کر کے، راستہ صاف کر دیا تھا۔

توفیق بھی قدیم دبستان کے شاعر ہیں۔ ان کے مضامین بڑی حد تک محدود ہیں، اس لحاظ سے ان کی شاعری کا کمال اسالیب کا تغیر ہی ہونا چاہیے اس نقطہ نظر سے توفیق کے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بڑی کوشش خیالات کو نئے نئے اسالیب میں ظاہر کرنے میں صرف ہوئی۔ پامال مضامین کو بھی وہ اسلوب کے تغیر سے شگفتہ بنانے کے رازوں سے خوب واقف تھے۔ اکثر مروجہ مضامین شعر توفیق کے دیوان میں ایک نیا جنم لیتے ہیں اس خصوص میں ذیل کے

اشعار دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

سنے گا کون مری خود فروشیوں کی صدا
شکست رونق بازار اعتبار ہوں میں

قضا رکاب میں ہے جا رہا ہوں سوئے عدم
سمند ابلق ایام پر سوار ہوں میں

ہوش اڑ جاتے ہیں پابند قفس کر کے مجھے
ہے مرے ساتھ رہائی بھی گرفتاری میں

کیا بنا لینگے شب ہجر بگڑ کر نالے
دل سے اٹھ بیٹھے اگر دل کی طرفداری میں

پاؤں رکھ سکتے نہیں باہر وہ جوش شرم سے
ان کے حق میں خود نگاہیں ان کی دربان ہو گئیں

حیات خضر کا کچھ حال ہم پر کھل نہیں سکتا
کہ اتنی تک جی رہے ہیں کس پہ مرنے کی تمنا میں

توفیق کی طبیعت کا یہ ایک تقاضا تھا کہ وہ غالب کی طرح ہر جگہ پامال اسالیب سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے والا اس چیز کو خاص طور پر محسوس کرتا ہے۔ اس رجحان طبع کے سبب قدیم دبستان کے شاعر کا راستہ بہت کٹھن ہو جاتا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جب تک غالب کے ہاں یہ جذبہ شعوری طور پر زندہ رہا، وہ بڑی کاوش سے شعر سرانجام کرنے میں ضرب المثل بن گئے تھے۔ مومن اس کوشش کی بدولت آج تک ایک مشکل گو شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ان کے اشعار کو چیستاں کا جواب تصور کرتے ہیں۔

توفیق کی جدت نے اس میں شک نہیں کہ انکی شاعری میں ایک انفرادی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس زمرہ کے اکثر شعرا کی طرح ان کے ہاں بھی یہ کوشش بعض جگہ بہت نمایاں ہو گئی۔ نئے اسالیب پیدا کرنے کی خاطر کبھی کبھی انھیں بڑی دماغی کاوشوں سے کام لینا پڑا ہے۔ اور جہاں یہ ہمت ہار گئے، شعر غیر مانوس ہو کر رہ گئے ہیں۔

ایسی شاعری کے لئے ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس میں گھلاوٹ اور جاذبیت کم ہوتی ہے۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ غالب کی کامیابی اور مقبولیت نے راستہ صاف کر دیا تھا۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ توفیق نے ایسی کاوشیں عموماً متصوفانہ اشعار یا حقائق نگاری کے سلسلے میں کی ہیں، اور یہ مضامین بذات خود نازک متصور ہوتے ہیں، اسلئے توفیق اس خطرہ سے بچ گئے ہیں۔

توفیق کے نئے نئے اسالیب دراصل خیال آفرینی کے سلسلہ میں پیدا ہوئے ہیں اور خیال آفرینی توفیق کی شاعری کی

ممتاز خصوصیت ہے۔ خیال آفرینیوں کے سبب وہ نازک خیال شاعر مشہور ہوگئے تھے۔ یہ روش انہیں اس قدر مرغوب تھی کہ وہ بغیر کاوش کے بہت کم شعر سرانجام کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں یہ راہ ان کے لئے آساں ہوگئی تھی لیکن ابتدا میں غالب کی طرح انہیں بھی بہت دور سے مضامین پکڑ لانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسے بہت سے اشعار ان کے دیوان میں موجود ہیں جس کا مطلب سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اور شاید اگر کوئی سختی سے جانچے تو ان کے ایسے اشعار کو بے معنی یا کم سے کم غیر بلیغ ضرور قرار دیگا۔

یہ صحیح ہے کہ توفیق کی فکر تمام تر بلندی کے ایک ہی معیار پر واقع نہیں ہوئی ہے لیکن یہ توفیق کی شاعری کا کوئی مخصوص عیب نہیں ہے۔ "خدائے سخن" میر تقی میر کے کلام کے متعلق نواب مصطفےٰ خاں کی تنقید "پستش بغایت پست وبلندش بغایت بلند" ایک آسمانی آیت کا حکم رکھتی ہے۔ کسی بلند پایہ نقاد نے میر اور سودا کے کلام سے صرف (۲۰) "نشتر" انتخاب کئے۔ غالب کے منتخبہ دیوان میں بھی بعض لوگ انتخاب مزید کی گنجائش سمجھتے ہیں۔ توفیق کی شاعری میں یقیناً انتخاب کی بڑی گنجائش ہے۔ اور ایک اچھا انتخاب ان کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث ثابت ہوگا۔

(۱) حسب ذیل اشعار توفیق کی مضمون آفرینی کا نمونہ ہیں۔

بات مطلب کی کھٹک کر رہ گئی ہنگامِ عرض
مدعائے دل زباں پر آکے کانٹا ہوگیا

میری بیتابی کی مشکل آپ آساں ہوگئی
بڑھ گیا درد دل بیتاب تو کم ہوگیا

مر گئے ہم یار کی شیریں لبی گفتار پر
اتنا اندازِ حلاوت بڑھ گیا سم ہوگیا

اس قدر خوگر فریاد ہوں میں صورت نے
بات بھی منہ سے نکلتی ہے تو نالہ ہوکر

کہئے کیونکر کہ جفائیں تری کم بھی تو نہیں
حوصلہ مانع ارمان ستم بھی تو نہیں

آرزو ہے دل مضطر بر آئے کیونکر
کہ نکل جائے تڑپ کر مرا دم بھی تو نہیں

کم نہیں نقش خیالی سے اگر میرا وجود
نیستی پر مرا اطلاق عدم بھی تو نہیں

جان کر آرزوئے معنی باطل مجھکو
صورت حرف مٹاتا ہے مرا دل مجھکو

ہوں اسیر غم دل بزم طرب ہے زنداں
نغمہ ساز ہے فریاد عنادل مجھکو

سرگرمیٔ وحشت نے یہاں تک مجھے بھٹکایا
ہر نقش قدم میرا داغ دل صحرا ہے

تصویر کو میری صفت رنگ پریدہ
ڈر ہے نہ کہیں حسرت پرواز اڑا لے

(۲) تصوف میں وحدت وجود کے عقیدے کو توفیق نے عجیب عجیب انوکھے اسالیب میں باندھا ہے ذیل کا تیسرا اور ساتواں شعر خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

یاں امتیاز قطرہ و دریا نہیں ہنوز
واں اعتبار حسن تغیر ہے عین بحر

نکلیں حجابِ عنصرِ خاکی سے خاک ہم | منظور ہم کو اپنا تماشا نہیں ہنوز
ہستیِ صانع اپنا رسے ہے ہستی میری | میں وہ دعویٰ ہوں جسے حاجتِ اثبات نہیں

ہے صورتِ حباب بقا اور فنا مری | ایسا ہوں مستعار کہ گویا نہیں ہوں میں
موت اپنا جانتی ہے زندگی اپنا مجھے | تنگ ہوں توفیقؔ میں بے فرصتِ خواب سے

وہ دیکھتے ہیں مجھ میں تو غیر فیضِ جمالِ یار | حیرت نے مری مجھکو آئینہ بنایا ہے
ہے اتصال مانعِ دیدار و توفریب | پھر کس طرح سے تیرا تماشا کرے کوئی

وہ نیست ہوں پابندِ صد نازشِ حیرانی | آئینۂ ہستی میں ہے جلوہ گری میری

(۳) ہر صاحبِ فکر سخن سنج کی طرح، توفیقؔ کے دیوان میں بھی قدم قدم پر کائناتی حقائق، نفسیاتی کیفیات اور جذبات کی نزاکتیں بلیغ اسالیب میں ملتی ہیں۔ بیم و امید کو اس سے کوئی پوچھے کہ جیسے خواہشِ مرگ بھی ہو، مرگ گوارا بھی نہ ہو

ہر چیز کو ہے نسبتِ اعلیٰ سے تفوق | ذرہ کو بھی دیکھو نہ کبھی کم نظری سے
قائل ہم استحالۂ ضدین کے نہیں | تا چشمِ تر گواہیِ سوزِ نہاں نہ دے

جس کو ہم موت سمجھتے ہیں یہی ہے در اصل | قید پابندیِ ارماں سے رہا ہوتا ہے
جا لگی نہ لے قاتل تسلیم کی خو ہم سے | تلوار کے اٹھنے سے جھک جائیگا سر پہلے

پابندِ حسرتِ غمِ پرواز آپ ہوں | پنہاں فریبِ دام مرے بال و پر میں ہے
ہزاروں میں نے کیں سیریں فقیری میں بھی عالم کی | ہزاروں جامِ جم نکلے مرے جامِ سفالی سے

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں قسمتِ آئندہ مری | خوابِ دیدہ کی کہیں پڑتی ہے تعبیر مجھے
وہ جو آ جائیں تو فرطِ رشک سے | آنکھ بھی ان پر نہ ڈالی جائیگی

ممکن نہیں تغیرِ احوال کیوں مرا | تقدیر کا تو کوئی نوشتہ نہیں ہوں میں
نیرنگِ استحالۂ سوزِ دروں نہ پوچھ | ٹپکی سرشک بن کے مری چشمِ تر سے آگ

ہم سمجھتے ہیں کہ دشوار ہے تغیرِ قضا | وہ اگر چاہیں تو توفیقؔ کوئی بات نہیں
ازل سے رخنہ گرِ توفیق محرومِ ترقی ہیں | نہیں دیکھی کسی نے بھی روانی آبِ پیکاں میں

ہو تمہیں ذی مرتبت دنیا میں بے پروائے غیر | شعلہ یاقوت محتاجِ ہوا ہوتا نہیں

(۴) ذیل کے اشعار میں ان مضامین کی بدیع الاسلوبی ملاحظہ کے قابل ہے جو قدمائے کثرت سے باندھے ہیں۔

حیاتِ خضر کا کچھ حال ہم پر کھل نہیں سکتا | کہ اب تک جی رہے ہیں کس بہانے کی تمنا میں
حشر تک جلنے پہ رنگِ شمع لیکن کیا کریں | عمرِ طولِ ہوس پر مختصر رکھتے ہیں ہم

سنے گا کون مری خود فروشیوں کی صدا | شکستِ رونقِ بازارِ اعتبار ہوں میں

(۵) حسبِ ذیل عاشقانہ اشعار سے توفیقؔ کے "لطفِ گویائی" کا اندازہ ہو سکے گا۔

توڑ دے زنجیرِ نام و ننگ لا دے سنت ہو | مار دے سنگِ ملامت شیشۂ ناموس پہ
جب کہا توفیقؔ ملیے، کہا کیوں کس لئے؟ | ہم کو اس نام و ننگِ خانماں سے کیا غرض

آنے لگی کعبہ میں بھی یادِ بتِ کافر | پڑنے لگی بنیاد کلیسا مرے دل میں
آؤ تو کبھی آئینہ خانہ ہی سمجھ کر | دیکھو تو کبھی اپنا تماشا مرے دل میں

وہاں زخم سے پوچھو زبانِ درازیِ تیغ ‎ ‎ مرے بیان کا گر زخم کو اعتبار نہیں
کیا آرزو کسی کی کیا مدعا کسی کا ‎ ‎ میں اپنی آرزوؤں میں پیا مدعا ہوں

چارہ گر روتا ہے میرے سامنے میرے لئے ‎ ‎ رو رہا ہوں بیٹھ کر میں چارہ گر کے سامنے
خداوندا بتوں کو بھی مجال کبریائی ہے ‎ ‎ تری شانِ خدائی ہے تری شانِ خدائی ہے

دل اور اس سحرِ نازِ حسن سے ارمانِ دلجوئی ‎ ‎ خدا کی شان قطرہ کو بھی ہے ذوقِ آشنائی
شرمانے لگے اب تو وہ ملنے کو بھی ہم سے ‎ ‎ کمبخت ہوس کا بھی ارماں کا برا ہو

ہوں اسیرِ غمِ دل بزمِ طرب ہے زنداں ‎ ‎ نغمہ ساز ہے فریادِ عنادل مجھ کو
اللہ رے شوقِ دید کی ہنگامہ کوشیاں ‎ ‎ محشر طلب ہے طولِ شبِ انتظار سے

غمزادانِ قفس بھولے ہوئے پرواز ہیں ‎ ‎ چپکے بیٹھے ہیں صیاد پر چھوڑے ہوئے
اے مہرِ حسن ادھر بھی کوئی پرتوِ جمال ‎ ‎ شامِ غمِ فراق امیدِ سحر میں ہے

اپنے جینے کی حقیقت سے جو واقف ہوتے ‎ ‎ خضر بھی آپ پہ مرنے کی تمنا کرتے
ہوں ازل سے میں اسیرِ دامِ گیسوئے ہوس ‎ ‎ ہے مری جمعیتِ خاطر پریشانی مری

(۶) تشبیہ، استعارہ، کنایہ شعریت اور ادبیت کی جان ہوتے ہیں۔ اس خصوص میں توفیق کو غالب سے خاص مشابہت ہے۔ غالب کی طرح وہ بھی اپنے مافی الضمیر کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں بیان کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ درمیانی عہد کے شعرا کے پاس یہ چیزیں عموماً محاورہ بندی کے شوق میں نکل جاتی ہیں ؎ رہے گا دل اسیرِ شوقِ منزل ہم نہ سمجھے تھے ‎ ‎ بنے گا پاؤں میں جادہ سلاسل ہم نہ سمجھے تھے

یارب خیالِ خندۂ نازِ بتاں نہ دے ‎ ‎ ربطِ ہوائے خرمنِ برقِ تپاں نہ دے
وہ رازِ دل کہ نہاں ہے جو داغِ دل کی طرح ‎ ‎ نکل کے منہ سے کہیں داستاں نہ ہو جائے

دل گیا کام سے اور دل سے محبت نہ گئی ‎ ‎ گل کی پامالِ خزاں ہو کے بھی رنگت نہ گئی
گئے تو تھے طرفِ جلوہ گاہِ ناز مگر ‎ ‎ حیاتِ رفتہ کی مانند جا کے آ نہ سکے

یکایک موسمِ شیب آ گیا بعدِ شباب ایسا ‎ ‎ کہ جیسے دامنِ فصلِ بہاری سے خزاں نکلے
تاچند رہے دل میں خیالِ خمِ گیسو ‎ ‎ آغوش میں کب تک کوئی اس سانپ کو پالے

عمر بھر تڑپا کی وابستگی صیاد کی ‎ ‎ یاد آئیں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہوئے
دلچسپ سہی لاکھ بیانِ دلِ بیتاب ‎ ‎ سنتا رہوں افسانۂ سیماب کہاں تک

جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے توفیق نے کئی غزلیں غالب کی زمینوں میں کہی ہیں ان میں عموماً وہ غالب کے عام متبع شعرا کے خلاف تقلید نہیں کرتے بلکہ بعض وقت خود غالب کے شاعرانہ خیالات کی توضیح یا تشریح کرتے ہیں۔ غالب کی ایک غزل حسبِ ذیل زمین میں ہے۔ توفیق نے اسی زمین میں ایک غزل کہی ہے جس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں ان میں ابتدائی دو شعروں میں گویا غالب کے خیالات کی تصحیح کی گئی ہے۔

ہو گئے خود اسیر ہم ورنہ فریبِ ناز سے ‎ ‎ اس کی بلا کو کیا غرض زلف میں وہ پھنسائے کیوں
جس کو ہو پاس جان و دل تم پہ وہ دل لگائے کیوں ‎ ‎ جس کو ہو زندگی عزیز تم پہ وہ مرنے جائے کیوں

اشکِ فتادہ کی طرح گر نہ پڑوں تو کیا کروں ‎ ‎ شورِ دردِ دل مجھے بزم سے وہ اٹھائے کیوں
مٹ کے غبار بھی مرا ان کی گلی کا ہو تو ہو ‎ ‎ ٹھوکریں مار کر ہوا خاک مری اڑائے کیوں

برق نہ رو دوں اشکِ خوں حیرتِ انتظار میں ‎ ‎ حسرتِ خوں شدہ مری رنگ مرا اڑائے کیوں

سید رضی الدین حسن کیفی

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

(لنڈن)



سیّد رضی الدّین حسن کیفی

سید رضی الدین حسن کیفی

ابوالرضا سید رضی الدین حسن کیفی ۴ ار شعبان ۱۲۹۶ھ کو جمعہ کے دن محلہ مغل پورہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابوالبرکات سید شاہ غازی نظام الدین احمد رضوی مشائخین حیدر آباد سے تھے۔ وہ فقہ و حدیث کے عالم اور نظامت نظم جمعیت سرکار عالی میں منتظم جمعیت تھے۔ انہوں نے دوران ملازمت میں کوئی رخصت سوائے رخصت حج کے نہیں لی۔ اور فرائض منصبی اس خوبی سے انجام دئے کہ ختم خدمت کے بعد بھی ۹ سال تک ملازمت میں توسیع دی گئی۔ ہمعصروں اور خاصکر امراء میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ نواب ظفر جنگ امیر کبیر پائیگا خورشید جاہی سے کہا کہ "کبھی غریب خانہ پر چٹنی روٹی بھی کھائیے" نواب مرحوم نے اس شرط پر دعوت قبول کی کہ "دیکھیے چٹنی روٹی کے سوا اور کچھ نہیں کھاؤنگا" چنانچہ دسترخوان پر شاہ صاحب نے سو سے زیادہ قسم کی میٹھی اور کھٹی چٹنیاں اور جوار کی بریانی' پراٹھے' لقمیاں وغیرہ غرض تمام قسم کے کھانے چن دئے۔ اس دعوت پر بڑی شہرت ہوئی تھی۔ ان کے دوست احباب اور قدردانوں میں نواب ناصر نواز الدولہ' کرنل ولایت حسین' مولوی میر محمود علی (نائب کوتوال) نواب نذیر جنگ' نواب صفدر حسین خاں اور نواب سر نظامت جنگ ابھی بقید حیات ہیں۔

کیفی ان کے اکلوتے بیٹے تھے چنانچہ شاہ صاحب کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو اس قدر متاثر ہوئے کہ سرکار میں ہجرت کی درخواست پیش کی اور مکہ معظمہ چلے گئے۔ بمراحم خسروانہ ان کا پورا وظیفہ سکہ کلدار میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ تین سال زندہ رہنے کے بعد شاہ صاحب نے وہیں ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کے متعدد حیدر آبادی احباب دفن کے وقت موجود تھے۔

کیفی کے اجداد کا تعلق جنیر شریف (قریب پونہ) سے تھا جہاں انکے بزرگوں کی درگاہ کے سالانہ عرس و گل کے سلسلہ میں ان کی جاگیری معاش ہے انکی دادی حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی پوتی ہوتی تھیں اور انکی طرف سے حوالی بلدہ میں کوہ مولا کے دامن میں ایک منقطعہ زمین ان کے حصہ میں آیا تھا ان کے نانا ڈاکٹر سید محمد مرحوم سادات بارہہ سے تھے۔ وہ حیدر آباد کے ان ابتدائی ڈاکٹروں میں سے تھے

جو یہاں کے مدرسہ طبابت میں تعلیم حاصل کرکے نکلے اور ملک میں بہت نیک نام رہے۔

کیفی نے ابتدا میں گھر پر خود اپنے والد اور پھر مولوی عبدالجلیل نعمانی سے تعلیم پائی۔ بعد میں حیدرآباد کی مشہور درسگاہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور یہیں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ اس مدرسہ کو کیفی کی زندگی سے خاص تعلق رہا ہے۔ ان کی متعدد اعلیٰ درجہ کی نظمیں اسی سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ دارالعلوم کی انجمن طلبہ قدیم، ساٹھ سالہ جشن جوبلی اور تمام سالانہ اور دیگر جلسوں کے روح رواں اکثر و بیشتر کیفی ہی ہوتے تھے۔ دارالعلوم میں کیفی نے جن قابل فخر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں حضرت الٰہی بخش، مولوی نادرالدین، علامہ ابوبکر بن شہاب، مولوی عبدالقدیر حسرت اور مولانا جمال الدین نوری خاص کر قابل ذکر ہیں۔

کیفی بہت کم عمر تھے جب شعر کہنا شروع کیا تھا۔ شاعری ان کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی۔ انہوں نے ابتدا میں اپنے استاد مولوی عبدالجلیل نعمانی ہی کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر حضرت فیض کے شاگرد رشید مولوی حفیظ الدین یاس سے اصلاح لینی شروع کی۔ چونکہ استاد اپنے کلام میں زیادہ تر تشبیہ و استعارات سے کام لیتے تھے شاگرد کی شاعری بھی تشبیہ و استعارات کا گنجینہ بن گئی مگر یہ رنگ کب تک باقی رہ سکتا تھا۔ آخر شمس الحق صوفی سجاد علی مبکش کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ مبکش اصل میں ایک فقیر دوست برہمن تھے اور کسی فقیری کی تلاش میں حیدرآباد آئے تھے۔ یہاں حضرت میر امداد علی علوی کے معتقد ہو کر مسلمان ہو گئے۔

کیفی نے سوائے شعر و سخن کے کسی اور کام میں دل نہیں لگایا۔ ان کے والد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ کسی دفتر میں برسرکار ہو جائیں اور چونکہ بہت سے امرا و حکام سے ان کی شناسائی تھی انہوں نے متعدد بار اس کی کوشش بھی کی مگر ہر دفعہ کیفی نے ان مخمصوں اور تعلقات سے خود کو بہت جلد آزاد کر لیا۔ وہ آزاد پیدا ہوئے تھے اور آزاد ہی رہنا چاہتے تھے۔

یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ کیفی کو اپنی اس آزاد منشی اور ملازمت کی بیزاری کے باوجود متعدد بار ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور یہ محض ان کے والد کا نقطہ نظر اور غلط تخیل زندگی تھا کہ کسی طرح اپنے اکلوتے فرزند ارجمند کو بھی اپنی طرح ملازمت کی زنجیروں میں جکڑ دیں چنانچہ انہوں نے ختم تعلیم کے ساتھ ہی کیفی کو اپنے ہی دفتر ناظم جمعیت میں کسی خدمت پر مامور کرا دیا مگر وہاں کیفی کو ان کی فطرت کی افتاد نے عرصہ تک ٹکنے نہ دیا۔ مجبوراً ان کے والد نے وہاں سے محکمہ تعلیمات میں ان کا تبادلہ کرا دیا۔ مگر سات آٹھ مہینوں ہی میں کیفی نے اس قید سے بھی نجات حاصل کر لی۔

ایک اور دفعہ نواب اکبر الملک کوتوال بلدہ کے مواعید اور اپنے والد کے حکم و اصرار کی بنا پر کیفی محکمہ پولیس میں بحیثیت صدر امین ملازم ہو گئے تھے مگر اس قید سے بھی اس قدر جلد بیزار ہو گئے کہ چند ہی دنوں میں ایک دوست کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور چند روز کے بعد واپس ہو کر ملازمت سے معذرت خواہ ہوئے۔

کیفی کی وفات سے تین سال قبل جب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں مصحح کی دو جائدادیں قائم ہوئیں تو جہاں ایک پر مرزا نظام شاہ لبیب دہلوی کا تقرر ہوا تو دوسری کے لیے کیفی کی خدمت میں مراسلہ آیا انہوں نے اسکی نسبت پر ملازمت سے معذرت لکھنے کو تو لکھ دی مگر پھر اپنے والد کی ناراضی اور اصرار پر انہیں ملازمت قبول کرتے ہی بنی۔ مگر اب کی دفعہ تین سال کے اندر ہی اندر اس خوبی سے آزادی حاصل کر لی کہ انکے والد کو بھی مجبور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہیں حضرت خواجہ اجمیری سے خاص عقیدت تھی چنانچہ زیارت کے لئے گئے ہوئے تھے کہ اجمیر شریف ہی میں ۵ رجب ۱۳۴۸ھ کو انتقال ہو گیا اور وہ زندگی اور اسکی جکڑبندیوں سے ہمیشہ کیلئے آزاد ہو کر تارا گڈھ کے راستہ پر ایک قبرستان میں ہمیشہ کے لئے آسودہ ہیں۔

کیفی کی شادی نواب یمین الدولہ شہسوار جنگ مرحوم کی پوتی سے ۱۳۱۱ھ میں اس تکلف سے ہوئی تھی کہ حضرت غفران مکان سے اجازت لے کر محلات شاہی تے پنج محلہ مبارک سے انکی بازگشت کا جلوس دیکھا۔ چونکہ نواب شہسوار جنگ پر حضور مرحوم کی خاص عنایت تھی اسلئے انہوں نے یہ شادی خاص دھوم دھام سے کی تھی اور پر تکلف جہیز دیا تھا۔ جاگیر اور منصب میں بھی حصہ ملا تھا جس سے کیفی کے چھوٹے بھائی سید شمس الدین عالم اب تک مستفید ہیں۔

کیفی یوں تو ایک باخدا خاندان میں پیدا ہوئے اور ابتدا ہی سے اپنی طبیعت کی رندی اور آزادہ روی کے باوجود مذہبی اثر سے بے نیاز نہیں رہے مگر آخر عمر میں مذہبی رنگ پوری طرح حاوی ہو گیا تھا۔ وہ بچپن ہی میں حضرت عبدالرحیم شاہ قادری کے مرید ہو گئے تھے لیکن انکی وفات کے بعد رجب ۱۳۲۴ھ میں حضرت سید شاہ محمد عمر حسینی سے بیعت کی اور بالآخر ان کے خلیفہ ہو گئے تو ان کے مذہبی رنگ میں نمایاں تبدیلی ہوئی اس زمانے سے متعلق بعض انکے خرق عادات ایسے بیان کئے جاتے ہیں جنہیں تحریر میں لانے کے لئے کسی خوش عقیدہ مرید یا شاگرد ہی کی ضرورت ہے

آخر میں کیفی نے استاد داغ کو بھی انکی وفات کے ایک دو سال قبل سے اپنا کلام دکھانا شروع کیا تھا اور اسکے بعد تو یہ عالم تھا کہ کیفی استاد ہی کے ہو گئے چونکہ ملازم نہ تھے اور شعر و سخن کے سوا کوئی اور مشغولیت بھی نہ تھی رات دن استاد ہی کے یہاں رہنے اور استاد کو بھی

اس مخلص اور ذی علم شاگرد سے اس درجہ خلوص اور تعلق پیدا ہو گیا کہ انہیں اپنے ہی خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگے۔

ان کی ابتدائی تصویروں میں جو بالعموم استاد داغ اور ان کے خاندان وغیرہ کے ساتھ لی گئیں ہیں چھریرا بدن خشخشی داڑھی اونچی ترکی ٹوپی اور شیروانی نظر آتی ہے مگر آخر زمانہ میں بالکل فقیرانہ وضع قائم ہو گئی تھی۔ (یہ وضع اس مضمون کے ساتھ جو تصویر شائع کی جا رہی ہے اس سے ظاہر ہے) لکھنی اور گرد داڑھی، سر پر شملہ، جسم میں کرتا اور انگرکھا اس پر تن آرام یا صدری، کندھے پر شال کبھی کبھی دوہرا، پاجامہ ورنہ اکثر لنگی، اور پیر میں وصلی کا جوتا یا نعلین۔ انہوں نے خود ایک شعر میں اپنے ظاہر و باطن کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے ؎

حضرت کیفی سے مل کر دل ہمارا خوش ہوا — عاشقانہ ہے طبیعت شکل درویشانہ ہے

کیفی کی شاعری ان کی طبیعت کے گوناگوں رجحانات اور خصوصیات سخن کے لحاظ سے چار مختلف ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے پہلا دور ۱۳۱۱ھ کے لگ بھگ ختم ہوتا ہے جب ان کی عمر قریب بیس سال کی تھی اس دور میں انہوں نے یکے بعد دیگرے تین تخلص اختیار کئے پہلے اپنے نام کی مناسبت سے رضی تخلص رکھا تھا پھر غالباً اپنے ابتدائی استاد مولوی عبدالجلیل نعمانی (جو مدرسہ آصفیہ میں مدرس تھے اور جن کی اکثر تصانیف مثلاً جواب سابقی اور صحیفہ عثمانی وغیرہ مشہور ہیں) کے ایما پر زخمی تخلص اختیار کیا چنانچہ ان کے کلیات میں اس تخلص کی بھی غزلیں موجود ہیں۔

بعد میں جب حضرت فیض کے شاگرد رشید مولوی حفیظ الدین یاس کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا تو شاید انہی کے مشورے زمانے کے اقتضا اور اپنے طبعی رجحان کی بنا پر ملکی تخلص اختیار کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآبادی شاعروں کو غیر اہل زبان سمجھ کر حقیر نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور اہل ملک میں بعض خاص آشنا کی بنا پر حب وطن کے جذبات موجزن ہو رہے تھے۔ اس دور کا کلام زیادہ تر قدیم طرز میں ہے اور تشبیہ و استعارات اور دیگر صنائع ۱۳۱۱ھ

کیفی کی شاعری کا دوسرا دور حضرت مسکین کی شاگردی کا زمانہ ہے اس دور میں وہ ملکی سے کیفی ہو گئے۔ یہ تخلص ان کی طبعی مناسبتوں کے لحاظ سے بھی نہایت موزوں تھا اور استاد کے تخلص کی مناسبت سے بھی مناسب تھا اس دور میں ان کی شاعری کو عروج ہوا اور اسی زمانہ میں وہ تمام ملک میں مشہور ہو گئے۔

کیفی کی شاعرانہ زندگی کا تیسرا دور استاد داغ کی شاگردی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اسوقت ان کی فطرت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے۔ داغ کی صحبت نے ان کے طبعی رجحانات کو پختہ کر دیا۔ ان کی فطری آزادمنشی، استغنا، خوش طبعی اور ظرافت ان کے کلام میں بھی جھلکنے لگی۔ اس کے علاوہ زبان کی لطافتوں اور اسلوب کی رعنائیوں نے اکثر دفعہ ان کی شاعری کو بذلہ سنجی بنا دیا۔ کیفی کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور ان کی وفات سے قریب چودہ سال قبل شروع ہوتا ہے اس دور میں انہوں نے اپنی وہ روح پرور اور وجد آفریں نظمیں لکھیں جنہوں نے حیدرآباد کے اسوقت کے اکثر و بیشتر علمی و قومی جلسوں میں زندگی پیدا کر دی۔

کیفی کی انفرادی زندگی ختم ہو چکی تھی اور قومی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ یوں تو ہمدردیٔ قوم اور حب وطن کے جذبات شروع ہی سے انکے سینہ میں موجزن ہیں لیکن آخری زمانہ میں زیادہ تر انہی کیلئے وقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس قسم کی تقریباً سو نظمیں لکھیں جنمیں سے اکثر نہایت طویل اور معرکتہ الآرا ہیں اور اگر انکا مجموعہ شائع ہو تو بڑی تقطیع کے دو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اسکے مطالعہ سے جہاں زندگی اور ہمدردی تعاون کے جذبات پرورش پائینگے جامعہ عثمانیہ کے قیام کے تحت اور اس سے قبل کی حیدرآباد کی علمی اور سماجی تحریکات سے بھی واقفیت ہو گی۔ ان نظموں کے علاوہ کیفی نے اپنی نثر کے ذریعہ بھی حیدرآباد کی مشہور آفاق علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی کوشش کی تھی حضرت غفران مکان کے آخر عہد اور حضرت سلطان العلوم کے ابتدائی عہد کی تمام علمی و عملی چہل پہل کیفی اور انکے شرکائے کار ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ کیفی بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ مختلف قسم کی قابلیتوں کے نوجوان انکو ہمیشہ گھیرے رہتے تھے! ور انکی زندہ دلی اور ذوق سخن سے متاثر ہوتے تھے۔ انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی نمایاں کامیابیوں میں کیفی کی مساعی کو بھی کافی دخل ہے۔ انہوں نے ۱۳۲۳ھ سے ماہوار رسالہ صحیفہ نکالنا شروع کیا تھا جو بعد کو روزانہ اخبار کی شکل میں منتقل ہو گیا اور مولوی اکبر علی کی ادارت میں اب تک جاری ہے۔ ماہوار رسالہ صحیفہ کی اعلیٰ ترتیب و تہذیب سے کیفی نے ثابت کر دیا کہ وہ اچھے شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک اچھے مدبر اور قومی خدمت گذار بھی ہیں۔ کیفی کی شاعری اسکے موضوع اور فوائد وغیرہ پر راقم کا ایک تفصیلی مضمون "تنقیدی مقالات" میں بھی شریک ہے اسلیئے یہاں انکی غزلیات ہی کی صرف تین اہم خصوصیتوں کا تذکرہ کیا جائیگا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہی تینوں انکے کردار اور طبیعت کی بھی خصوصیتیں ہیں۔ اردو کے بہت کم شاعر ہونگے جنکی زندگی اور کلام میں اس درجہ ہم آہنگی اور مطابقت ہو۔

کلام کیفی کی سب سے نمایاں خصوصیت شوخی، بذلہ سنجی اور لطف بیان ہے ان کا قریب قریب ہر شعر زبان کی روانی اور اسلوب کی دلکشی کا صحیح نمونہ بن سکتا ہے اسطرح شوخی و ظرافت بھی انکے اکثر اشعار میں نہایت پر لطف انداز میں جلوہ گر ہے۔ یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

جیسے کہ سونے والا ہے کوئی ہمارے پاس
بستر پہ لیٹتے ہیں جگہ چھوڑ چھوڑ کے

کیوں خفا ہوتے ہو مجھ مست پہ اے حضرت شیخ
میں گنہگار خدا کا ہوں تمہارا تو نہیں

دل میں جو شکل تھی زاہد وہ بتادی تجھکو
یہ نہ سمجھا تھا بدل جائیگی نیت تیری

خدا کی یہ خدائی ہے حسیں اکثر نکلتے ہیں
مگر کیفی کہیں ایسے پری پیکر نکلتے ہیں

کیفی تم اور اتنی خوشامد بتوں کی ہائے
اللہ! اس قدر بھی نہ بیجو ہو کوئی

ہر طور ہر طرح کی جو ذلت مجھی کو ہے
دنیا میں کیا کسی سے محبت مجھی کو ہے

تم بھی تو روز دیکھتے رہتے ہو آئینہ
سچ بولو کیا پسند یہ صورت مجھی کو ہے

کیفی شراب خانہ ہی انکا نصیب ہے
رستہ سمجھ کے آئے تھے ہم خانقاہ کا

کل کا کل پھر دیکھ لینگے ہو نہ ہو وعدۂ وفا
آج تو لطف تقاضا ہی بسر ہو گیا

کیسی خلش یہ بعد ملاقات رہ گئی
کیا چوک مجھ سے ہو گئی کیا بات رہ گئی

میں ہوں کہیں جہاں کہیں ہے نظر کہیں
کچھ چیز رکھ کے بھول گیا ہوں مگر کہیں

تم غیر کو دیکھو جو محبت کی نظر سے
تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی ترسے کہ نہ ترسے

کیفی ہے سو برسوں کا بڑا پھر بھی بچہ ہو
ایسا بھی کوئی شخص تمہاری نظر میں ہے؟

آ ادھر آ بات تو سن بات میں کیا ہے
مٹھی تو ذرا کھول ترے ہاتھ میں کیا ہے

مونہہ آنے کو ہے کیفی اور دم آنکھوں میں ہے
ہم کسی سے کیا ملیں ہم سے کوئی کیوں کر ملے

کیفی کی شاعری کی دوسری خصوصیت رندی، کیف و مستی اور عاشق مزاجی ہے اور اس قسم کے اشعار میں جو بے تکلفی اور واقعیت پائی جاتی ہے وہ ان شعرا کے کلام میں بہت کم نظر سے گذر سکتی ہے جو واقعی مست اور عاشق مزاج نہیں تھے۔ چند شعر یہ ہیں

چھوڑ کر تجھ کو کہاں جائے گا کیفی ساقی
تیرے میخانے کے سوا کوئی ہمارا تو نہیں

پڑے رہتے تھے پی کر مست ہو کر پاس ساقی
کہاں کی عید کیسی عید کس کی عید ہوتی تھی

تیرے میخانہ میں سب مست ہیں اے پیر مغاں
کوئی ہشیار نہیں کوئی خبردار نہیں

کون اس پر ستائش کا ہے کیسا انتظار
سو رہو کیفی کہ آدھی رات کی نوبت بجی

گھٹا چھائی فلک پر دم گھٹا جاتا ہے کیفی کا
سلامت میکدہ تیرا رہے ساقی پلا تھوڑی

دل شکستہ تو ہے کر لیتے ہیں نسبت پیدا
ٹوٹ پڑتے ہیں یہ ٹوٹے ہوئے پیمانوں پر

کیفی کی میکدہ میں ہے کیوں اتنی آبرو
یہ وہی تو ایسا کوئی معتبر نہیں

نادم ہوں ذلیل ہوں رسوا ہوں خوار ہوں
سب کچھ ہوں میں مگر ترا امیدوار ہوں

پارسا بن بیٹھنے سے کیا ملا کیفی تجھے
ہائے وہ رسوائیاں وہ ذلت و خواری تری!

توبہ عشق سے کرنے کو تھا تو پر کہ یار آیا
مرے آڑے یہ نیکی کیا کیا اے پروردگار آئی

تم اگر آفتاب حشر نہیں
تیرا محشر خیال تو ہو

غزلیات کیفی کی تیسری اور آخری خصوصیت تصوف و عرفان اور حقیقت نگاری ہے آخر عمر میں وہ اسی رنگ میں ڈوب گئے تھے لیکن انکے کلام میں شروع سے پہلے ہی اس قسم کے اشعار نظر آتے ہیں

اپنے آپ پر ہرگز تصرف کر نہیں سکتا
کسی کے سامنے رکھی ہوئی گویا امانت ہوں

نہ غم ورود الم ہو نہ میں مجبور ہوں کیفی
خدا رکھے مجھے بھی ہیں خدا کی ایک قید میں ہوں

خیال ترا ہے مثال اور خواب ہے میں خیال
ہر رنگ بدلتی ہے تری صورت بھی

میری طرح نہ عاشق مہجور ہو کوئی
نزدیک رہ کے بھی نہ ہوں دور ہو کوئی

گنجائش کلام کہاں حیرت نظر میں ہے
جب تم ہی نظر میں ہو تو کچھ بھی نظر میں ہے

پتہ ترا نہ ملے جب بسیط عالم میں
گلہ کرے نہ کرے پائے جستجو ہم سے

ورنہ کبھی قدم اٹھ نہیں سکتے افسوس
تھک کے کچھ بیٹھ گیا ہوں سر منزل لیکن

اپنے یوسف کے سوا آنکھ کسی پر نہ پڑی
چشم بیدار کو میں خواب زلیخا سمجھا

وہی منظر ہے لیکن نظر نہیں آتا
سمجھ رہا ہوں سمجھ میں مگر نہیں آتا

اب چشم امتیاز کی منت اٹھائے کون
پنہاں ہوا تو کیا کوئی ظاہر ہوا تو کیا

اس سلسلہ میں چند ایسے شعر بھی درج کئے جاتے ہیں جن سے کیفی کے دل کی حقیقت کا پتا چلتا ہے

جو تجھ کو جان دے ہم جانتے ہیں اسکو جان اپنی
جو تجھ کو دل دے اسکو اپنا دل سمجھتے ہیں

یہ دل اور دل تمہارا ہے یہ دل آئینہ تمہارا ہے
ہم اپنا دل سمجھتے ہیں نہ اپنا دل سمجھتے ہیں

چمن کا پھول میخانہ کا شیشہ حرم کا تارا
کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

کیفی نہایت پر گو شاعر تھے۔ انکا کلیات بہت ضخیم ہے مگر افسوس ہے کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی سرپرستی اور انجمن ترقی اردو کی کوشش کے باوجود شائع نہیں ہوا البتہ انکا کچھ حصہ مولوی سردار علی صاحب نے آٹھ دس سال قبل ”نظم کیفی“ اور ”نقش و نگار“ (دو چھوٹی چھوٹی کتابوں) میں شائع کیا تھا چند ماہ قبل انکے پورے کلام کا ایک انتخاب ”کیف سخن“ سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی طرف سے بھی شائع کیا گیا ہے مگر ضرورت ہے کہ انکا پورا کلام ایک ساتھ شائع ہو جائے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت شاد

از

مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب



"Pictorial Hyderabad."

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت شاد یب

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت شادؔ

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بتاریخ ۱۰ شعبان المعظم ۱۲۸۰ھ[1] م ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء اپنے نانا راجہ نریندر پرشاد کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام راجہ ہری کشن پرشاد بہادر تھا۔

جب راجہ نریندر پرشاد حضرت غفران مکاں کے ساتھ گلکنڈہ تشریف لے گئے تھے تو انکی غیر موجودگی میں شادؔ کے والد راجہ ہری کشن پرشاد کے ہاتھ کل انتظام تھا۔ اور اس انتظام میں رزیڈنٹ بہادر بھی متفق الرائے تھے۔ ان کے نانا کو کئی سال تک یہ درجہ حاصل تھا۔ اور انکے جد اعلیٰ مہاراجہ چندو لال شاداںؔ نے تو برسوں دیوانی کی خدمت انجام دی۔

مہاراجہ نریندر پرشاد لاولد تھے اور شادؔ ہی کو اپنا فرزند سمجھتے تھے۔ انکی تعلیم میں انہوں نے بہت دلچسپی لی اور گھر پہ ہی انتظام کیا گیا۔ اچھے اچھے جید فارسی و عربی داں اساتذہ مقرر کئے گئے۔ ابتداءً چار سال آغا میر لطف علی صاحب اور آغا میر پرورش علی صاحب درس دیتے رہے اسکے بعد مرزا علی بابا شیرازی مقرر ہوئے۔ مولوی سید خلیل صاحب ہراتی عربی پڑھاتے تھے مہاراجہ بہادر نے نہ صرف عربی، فارسی، تلنگی اور مرہٹی میں استعداد حاصل کی بلکہ خوشنویسی اور سپاہیانہ فنون تیر اندازی و غیرہ بھی میر عظمت علی صاحب اور مراد شاہ مرحوم کے فرزند سے سیکھے اور مدرسہ عالیہ میں انگریزی۔

وہ اپنی تربیت و عقائد کے متعلق خود اپنی تصنیف "جذبات شادؔ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کمسنی سے حضرت خداوند نعمت ظل سبحانی مدظلہ (حضرت غفران مکاں) کے مبارک قدموں میں حاضر رہنے کی عزت حاصل کی ہے اور حضرت کے نصائح گراں بہا سے گوش و دل بچپن سے متمتع ہوتے رہے ہیں۔ دین و دنیا کے آئین اسی دربار گہربار سے زیادہ حاصل ہوئے آئین شاہی کا آئینہ بردار اسی بافیض صحبت سے ہوا"

---

[1] بعض کتابوں میں مہاراجہ کا سن پیدائش ۱۲۸۱ھ بتلایا گیا ہے لیکن ہم نے جو تاریخ پیدائش لکھی ہے وہ خود شادؔ کی تصنیف "جذبات شادؔ" سے لی گئی ہے۔

"اگرچہ ابتداء میں تلون مزاجی کی بدولت بہ لحاظ اقتضاء سن میرے جبین دل پر مختلف گروہ اور فرقوں کے مسحور کرنے والے اثرات تھے اور یکے بعد دیگرے میرے رگ و پے میں سرایت کر چلے تھے اور ایک دوسرے کی مذہبی مقناطیسی قوت اپنے جوشیلے جذبات سے مجھے اپنی اپنی طرف کھینچ رہی تھی لیکن سالک مسالک طریقت اور حقیقت شناسان معرفت اور توحید پرستان رب العزت کی بافیض صحبت نے مجھے سوا وحدت پرستی کے کسی خاص گروہ یا فرقے کا فیدی مذہب نہیں بنایا بلکہ دید، درشن، اذکار و اشغال اور مختلف مجاہدات کا بالطبع شوق پیدا ہوا اور برگزیدگان رب العزت یعنی فقراء سے بھی تعلیم حاصل ہوتی رہی اور چونکہ مجھے علم موسیقی سے ازلی انس ہے، مجاہدات چشتیہ اور ذوق و شوق نے سماع کی طرف مائل کیا اور رفتہ رفتہ یہی ذوق سماع فقرائے چشتیہ کے دربار میں کشاں کشاں لے گیا اور انکے فیض صحبت سے مستفید کیا"

"آخر اس خاندان کے بانی یعنی قبلہ و کعبہ خواجہ معین الدین اجمیری رح کا دل و جان سے بندہ بے دام ہوں اور جس طرح دنیاوی ملک و املاک میرے جد کی مجھے مل گیا ایسے باخدا اور مہربان شفیق جد بزرگوار اور ایسے ہمہ داں آفتاب کے زیر سایہ پرورش پاکر میں ان موروثی حسنات کو حاصل نہ کرتا۔"

حضرت شاد کے نانا، مہاراجہ نریندر پرشاد کے متعلق خود شاد نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ وہ سچے دل سے مطیع اسلام اور بڑے صوفی المذہب و محقق اور عارف باللہ تھے ان کا مشرب صلح کل تھا اور سلطان علی شاہ قدس سرہ العزیز سے انہیں عقیدت تھی۔ بھلا ایک ایسے صوفی المذہب سرپرست کے زیر تربیت رہنے کے بعد کہ جس کا مشرب صلح کل ہو مہاراجہ بہادر کیونکر اس رنگ سے بیگانہ رہتے۔ اسی کتاب "جذبات شاد" میں اسی سلسلہ میں لکھا ہے :-

"شکر ہے کہ پروردگار عالم جل شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے جیسا کہ دنیاوی حقوق میں انکا وارث قرار دیا ویسا ہی دینی امور میں بھی انکا پیرو کیا اور دولت عرفان سے سرفراز فرمایا۔ بہر حال میں سچے دل سے صوفیوں کے مذہب کا پیرو ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ خدا مجھے میرے ارادے میں کامیاب کرے اور میں اس مبارک اور بے لوث اور بے تعصب صلح کل مشرب کے طریقے کا رہرو بن کر منزل مقصود کو پہنچ جاؤں۔

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم   کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن"

شاد نے اسی کتاب میں مذہب کی ایک جامع تعریف کی ہے اور اپنے مذہب کے متعلق احباب کی چہ میگوئیوں کا جواب دیا ہے
ان کا فلسفہ مذہب نہایت وسیع ہے کائنات کے جملہ مذاہب میں سے وہ کسی کو برا نہیں کہتے۔ دنیا میں نیک کام کرنا اور نیک رہنا جملہ
مذاہب کا بنیادی اصول رہا ہے۔ انکا بھی یہی مسلک ہے۔ فقرائے اہل اسلام اور فقرائے اہل ہنود سے مہاراجہ بہادر کو برابر عقیدت
رہی ہے اس کتاب میں ۳۸ فقرائے اہل اسلام اور ۱۲ فقرائے اہل ہنود کے نام درج ہیں اور یہ سب وہ ہیں جن سے انہیں حد درجہ
عقیدت تھی انکی تمام زندگی میں یہ چیز بہت نمایاں ہے وہ ایک سچے تارک الدنیا خرقہ پوش فقیر کو سکندر و جم سے برتر تصور کرتے
ہیں اور ایسے بزرگوں کی خدمت گزاری کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔

جس کی تربیت حضرت غفران مکاں کے سایہ عاطفت میں ہوئی ہو جس کا عالی مرتبت خاندان اپنی خوش اخلاقی
حسن سلوک، رواداری، جود و سخا میں چار دانگ ہند میں مشہور ہو ایک ایسے فرد کے اخلاقی محاسن جو ہر طرح اپنے سلف اور اپنے
مالک کا سچا پیرو ہو، آسانی سے تصور میں آسکتے ہیں۔ مہاراجہ بہادر ان چند امرائے سلطنت میں سے ہیں جو نہ صرف مشرقی تمدن
کی ایک زندہ مثال ہیں بلکہ اس امر میں دوسروں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیرہے ہیں۔ آپکی ذات و الاصفات میں وہ سب خوبیاں
موجود ہے جو مشرقی امیروں کیلئے امتیاز کا باعث ہے۔ آج دنیا میں مشرقی تمدن کے حامل و حامی شاید کم ملینگے لیکن انکی
بدولت جو سکون قلب، سچی خوشی، اور روحانی مسرت مشرقیوں میں پائی جاتی ہے اسکا عشر عشیر بھی دنیا میں کہیں نہیں۔
حیدرآباد ابتدا ہی سے علم و عمل اور تہذیب و شائستگی کا مرکز رہا ہے یہاں آج بھی جو امن، سچی خوشی، خوشحالی اور روحانی
مسرت پائی جاتی ہے کسی اور جگہ نظر نہیں آتی۔

مہاراجہ بہادر خوش اخلاقی و مروت میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ہفتہ میں ایک روز دربار عوام کیلئے کھلا رہتا ہے ادنیٰ
سے ادنیٰ کیلئے بھی کسی قسم کی روک ٹوک نہیں وہ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور ہر کسی کی حتی الامکان امداد فرماتے ہیں
یوں تو حیدرآباد کا ہر فرد بشر بادشاہ پرستی کے جذبہ سے سرشار رہتا ہے اور اس ملک کے رہنے سہنے والے کی یہ ایک
امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ ہر وقت، ہمیشہ اور ہر حالت میں اپنے بادشاہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار رہتا ہے۔

لیکن مہاراجہ بہادر اس خصوصیت سے جامع صفات ہیں وہ اپنے شاہ ذیجاہ کی خوشی کو نہ صرف اپنی خوشی بلکہ اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں اور اعلیحضرت کے ایک ادنیٰ اشارے پر ہر قسم کی قربانی کرنے تیار رہتے ہیں۔

حضرت غفران مکاں رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت پیر و مرشد ظل سبحانی ہمیشہ اپنے الطاف و عنایات سے اس کا ثبوت دیتے رہے ہیں کہ دکن میں ابھی قدر دانی باقی ہے اور اس میں اب تک پوری مشرقی آب و تاب بھی موجود ہے۔

اس قدر دانی کا حال ذیل کی چند رباعیات سے معلوم ہوگا۔ یہ شاد کی وہ رباعیاں ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بادشاہ کے عطایا کی سپاسگزاری میں کہی ہیں۔

۱۳۲۶ھ میں ایک قبضہ شمشیر پیشگاہ خداوندی سے عطا ہوا تھا اسکی سپاسگزاری میں لکھتے ہیں:-

وہ صاحب دکن جو صاحب جوہر ہے ۔۔۔ شوکت میں جم اقبال میں سکندر ہے

کی شاد کو شمشیر عطا از رہ لطف ۔۔۔ واللہ یہ شمشیر ظفر پیکر ہے

اسی سال پیشگاہ خداوندی سے آم بھی عنایت ہوئے تھے اسکی شکر گزاری میں سات رباعیاں پیش کی تھیں جن میں سے صرف ایک یہاں نقل کی جاتی ہے:-

آموں سے سرفراز ہوا خانہ زاد ۔۔۔ پھولو پھلو اے شاہ و مہ و قمر آباد

سرسبز رہے یہ باغ آصفجاہی ۔۔۔ اور شاد کو ملتی رہے منہ مانگی مراد

۴ رجب المرجب ۱۳۲۶ھ کو پیشگاہ خسروی سے دو گھڑیاں مرحمت ہوئیں۔ اس موقع پر چند رباعیاں گزرانی گئیں ان میں سے ایک رباعی یہاں نقل کی جاتی ہے۔

گھڑیاں ہیں یہ وہ جن پہ دل و جاں ہو نثار ۔۔۔ ہے عمر کی گھڑیوں کا انہی پر تو مدار

آتی ہے گھڑی گھڑی زباں پہ یہ دعا ۔۔۔ پل پل کی دکھیں خوشی کی گھڑیاں سرکار

پھر پانچ روز کے بعد حضور پر نور سے تصاویر شاہزادگان بلند اقبال عطا ہوئے جس کی سپاسگزاری میں ستر رباعیاں پیش کی گئیں، ان میں سے دو یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

تصویریں عطا ہوئیں جو شاہزادوں کو
عزت بڑھی عظمت بڑھی توقیر بڑھی

کیا وصف ہو شاد سے اک اک تصویر
ہے دیدۂ اقبال کی گویا پتلی

آئینے کو بھی میری طرح سکتا ہے
حیران ہے تصویروں کا منہ تکتا ہے

جو شان ہے جو آن ہے جو ہے انداز
اے شاد بیاں کس سے وہ ہو سکتا ہے

اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے کہ مہاراجہ بہادر اردو، فارسی، عربی، انگریزی، تلنگی اور مرہٹی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں اور انکا مطالعہ بہت وسیع ہے انکا ایک نہایت ہی شاندار کتب خانہ ہے جس میں بعض نایاب کتب بھی موجود ہیں انکا دربار ہمیشہ علماء و فضلاء سے معمور رہتا ہے وہ ہمیشہ سے علماء و فضلاء کی سرپرستی کرتے آئے ہیں اور ضرورت پر انکی ہر طرح مدد فرماتے ہیں۔ مہاراجہ چندو لال شاداں کی طرح انکی سخاوت کا بھی دور دور تک شہرہ ہے وہ بعض شاعروں کو مستقل طور سے تنخواہ دیتے ہیں۔ انکے یہاں ماہانہ ایک خاص مشاعرہ منعقد ہوتا ہے ان میں جو شعراء اکثر مدعو ہوا کرتے ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہیں:۔

ضیا یار جنگ ضیاء۔ عزیز یار جنگ عزیز۔ نواب یار جنگ سعید۔ اصغر یار جنگ اصغر، شبیر حسن خاں جوش۔ شوکت علیخاں فانی۔ آغا محمد علیخاں اعلی الاسلام۔ مہدی حسین الم۔ مسعود علی محوی۔ عبداللہ عمادی۔ حبیب الدین صغیر۔ اکرام الدین اکرام۔ وحید الدین بیخود۔ وحید۔ عبدالصمد واصفی

آپ کئی علمی اداروں کے سرپرست ہیں، ڈرامہ سے بہت دلچسپی ہے، خود آپ نے بھی ڈرامے لکھے ہیں اور اکثر ڈرامے جو تمثیل کئے جاتے ہیں انکی سرپرستی و امداد میں ایک خاص مسرت محسوس فرماتے ہیں۔ ان کے یہاں اکثر تصانیف و تالیفات اس غرض سے پیش کئے جاتے ہیں کہ ان پر تقریظ لکھی جائے یا تعارف یا رائے تحریر کی جائے اور وہ اپنی روایتی خوش اخلاقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے باوجود عدیم الفرصت ہونے کے ایسی خواہشات کو مسترد نہیں فرماتے۔ اُن کی علم دوستی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک کی تصانیف کا ایک قابل لحاظ حصہ اُن کے نام نامی سے معنون کیا جاتا ہے۔ بہت کم ایسی ہستیاں ملینگی جنکے نام اسقدر کتابیں معنون کی گئی ہوں۔

شاد اُردو زبان کے دلدادہ ہیں، اور یہ ہر نوع اُردو زبان کی خدمت کرتے رہتے ہیں، انکی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔ وہ ایک اخبار بھی ترتیب دیتے تھے جس کا نام "دبدبہ آصفی" تھا اسی زمانہ میں ایک رسالہ محبوب الکلام بھی مرتب کرتے تھے، جس میں کثیر شعرائے معاصرین کا کلام شائع ہوتا تھا اور حضرت غفران مکاں کا بھی کلام

بغرض اشاعت مرحمت فرماتے تھے۔

شاد کی طبیعت ابتدا ہی سے شعرگوئی کی طرف مائل تھی اور یہی سبب ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے سے قبل ہی انہوں نے شعر موزوں کرنا شروع کردیا۔ مولف تذکرہ شعرائے دکن لکھتے ہیں کہ شاد ابتداءً راجہ سجوال لال تمکین سے اصلاح لیتے رہے۔ شروع ہی سے کلام میں تصوف کا رنگ جھلکنے لگا۔ چند ہی روز میں انہوں نے ایک خاص رتبہ حاصل کرلیا۔ اگرچہ متعدد اساتذہ فن سے مشورہ کرتے رہتے تھے لیکن آخر میں اعلیحضرت غفران مکاں کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اسکے بعد سے تو ان کے کلام میں چار چاند لگ گئے اور انہیں "شاگرد خاص" کا لقب عطا ہوا۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔ ورنعتیہ کلام میں تو انہوں نے ایک خاص درجہ حاصل کرلیا ہے جسکا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔

شاد کے کلام سے ان کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام کتب کے ساتھ انہوں نے خاص طور سے متقدمین شعراء کے کلام کا بہت غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ انکا کلام شاعرانہ محاسن اور فصاحت و بلاغت سے مالامال ہے۔ مثل انکے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولال شاداں کے ان کے کلام کا بھی غالب حصہ تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے وہ ہر جگہ فقر و فقیری اور عشق حقیقی میں مستغرق نظر آتے ہیں۔ انکا شعر ہے ؎

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی
شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

میرے والی میرے مولیٰ میرے سلطان عرب
میرے محبوب خدا پیارے نبی جان عرب

لاکھوں مبعوث پیمبر ہوئے اس عالم میں
کون حضرت سا ہوا شان عجم جان عرب

چشم وحدت سے دیکھتا ہو جدھر
نظر آتا ہے تو ہی تو مجید کو

۱۲۹۱ھ میں شاد کو راجہ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۳۰۱ھ میں جب نواب سر وقار الامراء بہادر شملہ تشریف لیگئے تو مہاراجہ بہادر ۲۴ دن تک عہدہ مدار المہامی پر منصرمانہ کارگزار رہے۔ ۱۳۰۶ھ میں انہیں انکی موروثی خدمت پیشکاری مشاہرہ چھ ہزار روپیہ مرحمت ہوئی اور ساتھ ہی وزارت فوج کی خدمت سے بھی عزت افزائی کی گئی۔ ۱۳۱۱ھ میں حضرت غفران مکاں کی سالگرہ کے

موقع پر خطاب راجہ راجایاں مہاراجہ بہادر سے سربلند ہوئے اور ہفت ہزاری منصب، پانچ ہزار سوار علم ونقارہ و پالکی جھالر دار عنایت ہوئی اور ساتھ ہی چھ عدد جواہر مرحمت ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انہیں اپنی جاگیرات میں دیوانی و فوجداری اختیارات ملے جب ۱۳۱۹ھ میں سرفقار الامرا بہادر نے چھ ماہ کی رخصت لی اور عہدہ مدار المہامی سے سبکدوشی چاہی تو اعلیحضرت نے مدار المہامی کی خدمت پر مہاراجہ بہادر کا منصرمانہ تقرر فرمایا۔ پھر ۲۶ رجب المرجب ۱۳۲۰ھ کو مستقلانہ تقرر کردیا گیا وہ بارہ سال تک اسی خدمت پر سرفراز رہے ۱۳۳۲ھ میں عید الضحیٰ کے موقع پر خدمات کے مدنظر یمین السلطنت کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

سابقہ کارگزاریوں اور ملکی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلیحضرت آصف جاہ سابع نے کونسل کی صدارت پر مہاراجہ بہادر کا تقرر فرمایا ہے۔

حکومت ہند کی طرف سے ۱۹۰۳ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای اور ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب عنایت ہوئے۔ آخر الذکر خطاب وہ ہے جو صرف باعظمت حکمرانوں کو ملا کرتا ہے۔

حضرت شاد اردو کے ایک بہت بڑے محسن ہیں نہ صرف اسلئے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ اسلئے بھی کہ وہ چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مولف ہیں جن میں افسانے، مجموعہ مضامین، دواوین، مجموعہ رباعیات خاص، سفرنامے اور مذہبی مسائل کی کتابیں وغیرہ شامل ہیں یہ تمام کتابیں مختلف عنوانات پر لکھی گئی ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

۱۔ باغ شاد۔ ۲۔ سفر دو ہفتہ۔ ۳۔ جذبات شاد۔ ۴۔ ضلع جگت۔ ۵۔ ترانۂ شاد۔ ۶۔ آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں۔ ۷۔ رباعیات شاد۔ ۸۔ مثنوی نسیم سحر۔ ۹۔ نغمۂ شاد۔ ۱۰۔ خمکدۂ رحمت۔ ۱۱۔ ایمان شاد۔ ۱۲۔ صبح امید ۱۳۔ خمار شاد۔ ۱۴۔ آشوب عظیم۔ ۱۵۔ سیر پنجاب۔ ۱۶۔ دسہرا۔ ۱۷۔ بزم خیال حصہ اول۔ ۱۸۔ حصہ دوم۔ ۱۹۔ حصہ سوم ۲۰۔ مطلع خورشید۔ ۲۱۔ ارمان وزارت۔ ۲۲۔ مخزن القوافی۔ ۲۳۔ مثنوی آئینہ وجود۔ ۲۴۔ مثنوی سروجود۔ ۲۵۔ شگوفۂ بہار ۲۶۔ ارمغان زیبا۔ ۲۷۔ نذر سلطان۔ ۲۸۔ گلبن تاریخ۔ ۲۹۔ فریاد شاد در فراق آصف بر شاد۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

باغ شاد:۔ شاد کے کلام کا یہ سب سے پہلا مجموعہ (دیوان) ہے جو ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوا ہے اسمیں ۱۹۶ غزلیں ہیں

جن میں کل ۹۸۴ اشعار ہیں، دو خمسے اور چار قصیدے ہیں اور آخر میں کچھ رباعیات ہیں۔ دیوان کے آخر میں حسبِ ذیل اصحاب کی تقاریظ اور رائیں ہیں۔

حاجی محمد مظفر الدین صاحب، ابوالقاسم مولانا فضل رب صاحب عرشی۔ محمد عبدالجبار خاں نشاط، محمد محبوب صاحب فرنگی محل، منشی محمد عبدالقدوس صاحب قدسی، میر حشمت علی صاحب حشمت، محمد عبدالوارث خاں صاحب وارث، محمد سراج الدین صاحب شاکر میر تراب علی صاحب زور وغیرہ وغیرہ۔

رباعیاتِ شاد :۔ یہ انھیں رباعیات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ حضرت غفران مکاں علیہ الرحمہ شاد کو مختلف گراں بہا اشیاء مثلاً گھڑیاں، آم، تصاویر، جواہر وغیرہ مرحمت فرماتے رہتے تھے یہ جملہ رباعیات انہیں کی سپاسگزاری میں کہکر مطبوعہ پیش کئے گئے۔

رباعیات و قطعات تاریخی :۔ اس میں شاد نے اپنی تقریباً تمام رباعیاں ایک جا جمع کر دی ہیں اسی مجموعہ میں قطعات تاریخی بھی ہیں۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے حصہ اول میں ایک سو چار رباعیاں ہیں، حصہ دوم میں متعدد تاریخی قطعات ہیں اور حصہ سوم میں تین سو رباعیاں ہیں جن میں بیسیوں وجد آور ہیں اور ایک خاص کیفیت میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں

خمکدۂ رحمت موسوم بہ ہدیۂ شاد :۔ یہ ایک نعتیہ دیوان ہے جو انوار وحدت اور درد محبت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ دیوان بہت بلند مرتبہ ہے اور فصاحت و بلاغت کا ایک دریا ہے، اسکی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ ایک خاص خوبی اس کی ترتیب میں یہ ہے کہ ہر نعت کے لکھنے کی تاریخ اور سن ساتھ ہی درج ہے جس سے میکدۂ عشق کے مست سرالانیے والے شاد کے تدریجی چڑھتے ہوئے نشۂ وحدت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کلام صاف بتلا رہا ہے کہ شاد کے دل میں عشقِ محمدی کی ایک تڑپ ہے۔ شاد مئے الفت کے ایک بادہ خوار ہیں انہیں جنت سے سروکار نہیں "عشق بسازد عشق بسوزد" یہی ان کا دین اور ایمان ہے فرماتے ہیں :۔

مشرب عشق اور ہی شئے ہے — تو نہیں اسکو جانتا واعظ
شاد ہے مست بادۂ توحید — تو نہ پہنا ہے اسکو کیا واعظ

مئے توحید، عشقِ رسول، حقیقت، و معرفت کے چراغ کے سامنے شاد یہ تمنا کرتے ہیں کہ وہ ایک پتنگے کی طرح جلیں۔

قندیل بن کے روضۂ حضرت پہ میں جلوں — یارب یہ چاہتا ہے مرادا غدار دل

شاد عشق محمدی میں جذب ہوکر عطّارؒ کی طرح احد اور محمد میں کچھ زیادہ فرق نہیں پاتے

احد میں اور محمد میں کچھ نہیں ہے فرق — وہ عین ذات ہے اور یہ صفت جدا کیا ہے

شاد کا خمکدہ حضرت خیام کا مجازی ابریق مئے نہیں، یہ توحید اور عشق محمدی کا خمکدہ ہے اور شاد اسکے بلانوش ہیں۔ تعنیہ دیوان سے چند اشعار نمونتہً اس مضمون کے آخر میں دیگر منتخب کلام کے ساتھ پیش کئے جائینگے۔

ترانۂ شاد :۔ یہ ایک مجموعہ ہے جس میں تمام ٹھمریاں اور ترانے ایک جا جمع کئے گئے ہیں انکے پڑھنے سے شاد کی کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایک اچھے غزل گو اچھے قصیدہ گو تھے، بلکہ اچھی اچھی اعلیٰ پایہ کی ٹھمریاں بھی لکھتے تھے۔ اس مجموعے میں ۵۰ ٹھمریاں ہیں۔ مثنویوں کا ذکر آگے آئیگا۔

ضلع جگت :۔ یہ کتاب اعلیحضرت غفران مکاں کے نام نامی سے معنون کی گئی ہے اس میں بتلایا گیا ہے کہ ضلع اور جگت کن کن زبانوں کے لفظ ہیں اور ضلع جگت کی شاعری میں کیا اہمیت ہے اور اس سے مراد کیا ہے۔ کل ۶۶ چیزوں کا ضلع قلمبند کیا گیا ہے۔ خود شاد دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اس سے قبل ایسی کوئی کتاب نہیں شائع ہوی۔

آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں :۔ شاد کے اس سفرنامے میں وہ حالات درج ہیں جو حیدرآباد سے ناگپور، ایک بزرگ کی تلاش میں جانے پر اثنائے راہ میں یا وہاں پیش آئے واقعات کچھ ایسے دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنا تقریباً ناممکن ہے۔

دسہرا :۔ یہ کتاب دو سوانح عمریوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون سری رام چندرجی کی بہادری، سکھ رام داس صاحب ایڈیٹر راجپوت گزٹ لاہور کے معروضہ کی بناء پر راجپوت گزٹ کے "ویر نمبر" کے لئے لکھا گیا تھا۔ دوسرا مضمون الیا رام شرما ایڈیٹر سناتن دھرم پرچارک امرتسر کی خواہش پر سناتن دہرم پرچارک کے "رام نمبر" کیلئے لکھا گیا تھا۔ انہیں دونوں مضامین کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ فاضل مضمون نگار نے اپنے وسیع معلومات کو سلیس اردو میں پیش کیا ہے دونوں مضمون اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ضرور پڑھنے کے قابل ہیں۔

سیر پنجاب :۔ شاد کی یہ تصنیف ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ہے ادبی حیثیت سے یہ ایک اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے ۶ر جون ۱۹۱۵ء م ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ کو شاد ولی الہند خواجہ اجمیری کے عرس میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے اس میں اجمیر کی عام حالت اور ہندوستان کے "حقیقی اور مستقل شہنشاہ" خواجہ اجمیری کی سوانح حیات درج ہے۔

اجمیر، ڈیرہ دون، ہردوار، رڑکی، کلیر، امرتسر، لاہور، پانی پت، متھرا، فتحپور، الہ آباد، جبل پور وغیرہ کے حالات بھی درج ہیں۔ ادبی حیثیت سے ایسے سفرنامے بہت کم ملتے ہیں۔ ہندوستان کے متذکرہ بڑے بڑے شہروں، مثلاً قوموں اور فرقوں کے حالات کا شاد نے بہت غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ شاد کی یہ تصنیف ہندالمانی تہذیب و تمدن اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک صحیح نمونہ پیش کرتی ہے اسکے پڑھنے سے مصنف کی وسعت نظری، بے تعصبی اور پاکیزہ مذاق کا پتہ چلتا ہے اس افراتفری کے زمانہ میں اس قسم کے سیاح اور ایسے سفرنامے شعور ہم جنسیت اور قومی یکسانیت پیدا کرنے میں بے حد ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔

انتخابِ کلامِ شاد

اب ہم ذیل میں شاد کے مختلف مجموعوں اور دواوین سے چند منتخب اشعار پیش کرتے ہیں۔ عاشقانہ مضامین :۔

کیا خوب لطف ہو جو ہو موسم شراب کا ۔۔۔ دلبر ہو بر میں ہاتھ میں ساغر شراب کا
اسوقت کوئی غیر نہیں ہے شب وصال ۔۔۔ باقی کہاں ہے وصل میں موقع حجاب کا
وہ ولولہ نہیں وہ طبیعت نہیں رہی ۔۔۔ پیری میں یاد آتا ہے عالم شباب کا
آسماں پر گر گرے برق نگاہ شند یار ۔۔۔ ابر میں رہ جائے چھپ کر اسکے ڈر سے آفتاب
حسن میں دلبر مرا ہے مہر و مہ سے بیشتر ۔۔۔ کوئی کب دنیا میں ہوگا ایسے دلبر کا جواب
وصل کی شب میں نے چھیڑا تو کہا ۔۔۔ یہ نئی طرز شتاب اچھی نہیں
قیامت یوں بپا کی ہے انہوں نے آج محفل میں ۔۔۔ مرے پہلو سے اٹھکر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں

کسی کی شامت آئیگی کسی کی جان جائے گی — بناکر صبح سے زلفوں کو وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
اسکی جھوٹی شراب ہے واعظ — تم نہ سمجھو اگر حرام تو لو
غمزہ و ناز سے دل زخمی ہے — تیر پر تیر لگایا نہ کرو
محرم کی چڑیا جان کے کڑتی کے جال میں — باندھا ہے مرغ دل کو بھی بند قبا کے ساتھ
ایک بوسے کے طلب پہ بخل یہ — مالکوں کا دل تو دریا چاہیئے

معشوق کا سراپا :—

آنکھ میں سرمہ لگائے آتے ہیں بہر قتل — رنگ نیلا ہو رہا ہے جوہر شمشیر کا
اشارے غیر سے کرتے ہوئے چتون کے بیٹھے ہیں — تنی ہے تیغ ابرو قتل پر وہ تن کے بیٹھے ہیں
اس کے مژگاں کی ہے کھٹک شب و روز — گویا چبھتا ہے دل میں خار عجیب
گرچہ زہری مار زلف سیاہ — مو بمو شانہ ہے وبال اس کا

انتخاب از خمکدہ رحمت

پیمبروں میں کوئی ایسا آفتاب نہیں — حضور احمد مختار کا جواب نہیں
حضور سرور عالم کی شان صل علیٰ — کہ کائنات میں انکا کوئی جواب نہیں
ہے احمد بے میم کا دربار مقدس — جو عرش خدا ہے وہ ہے ایوان مدینہ
خاکِ رہ یثرب کو بنا دونگا میں سرمہ — دیکھوں گا ان آنکھوں سے جو میدان مدینہ
مومن جو نہیں ہوں تو یہ کافر بھی نہیں شاد — اس رمز سے آگاہ ہیں سلطان مدینہ
زاہد کو ہے جنت کی تمنا تو مبارک — ہم کو بھی حسرت ہے کہ ملجائے مدینہ
عاشق ہوں مجھے جنت فردوس سے کیا کام — ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ
در احمد کی گدائی سے ہے فخر شاہی — زر و دینار و درہم کی مجھے پرواہ کیا ہے

نہیں کچھ فکر ہے میزان عمل کی مجھ کو
مرے پلے میں ہیں حضرت مجھے پروا کیا ہے

چشمۂ فیض سے لاکھوں ہی کو سیراب کیا
بھر دے اب جام مرا بھی مرے کوثر والے

دین و دنیا میں وقار اپنا بڑھانے کے لئے
تیرے کوچہ کے گدا بنگئے کشور والے

محمد پہ دل اپنا شیدا ہوا ہے
ستارہ نصیبے کا چمکا ہوا ہے

خداوند عالم ہے جس طرح واحد
حبیب خدا بھی تو یکتا ہوا ہے

احد اور احمد ہے کس طرح واحد
وہی جانتا ہے جو سمجھا ہوا ہے

موحد ہوں عارف ہوں صوفی ہوں کیا
مرے حال پر فضل مولیٰ ہوا ہے

فقط نعت گوئی سے ہی شاد تجکو
یہ عزت ملی ہے یہ رتبہ ہوا ہے

باغ یثرب سے محبت کی ہوا آتی ہے
غنچے غنچے سے مجھے بوئے وفا آتی ہے

ہوں فنا ذات میں ایسا کہ مجھے ہر سو سے
ذکر ما کان محمد کی صدا آتی ہے

تجکو اے شاد مبارک ہوں مئے عشق کے جام
کالی کالی وہ مدینہ سے گھٹا آتی ہے

احمد کے در پہ اسلئے میں جبہ سا رہا
سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا

کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی
رنگ شاد اب عاشقانہ ہو گیا

انتخاب از ترانۂ شاد :- ٹھمری (دھن دیس میں)

رات اندھیری بدریا کاری
مدھوا بلا موہے کیہو متواری

چمکت بجلی گرجت بادل
بوند پڑت ہیں بھاری بھاری

رات اندھیری بدریا کاری

کا جانو کا کینو پیارے
سدھ بدھ اپنی بھولی ساری

رات اندھیری بدریا کاری

شیام روپ ڈارے کاندے کمریا — من موہن کی ہے چھب نیاری

رات اندہیری بدریا کاری

مور چکور پپیہا بولے — جیا لیت مورا باری باری

رات اندہیری بدریا کاری

سرن پری کی لاج رکھو خواجہ (غریب نواز م) — شاد پلہاری چرنن پر واری

رات اندہیری بدریا کاری

انتخاب از مثنوی نسیم سحر (درصنعت توشیح)

یہ نظم اعلیحضرت غفران مکاں کی سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی ہے کتاب میں شروع یا آخر میں کہیں سن اشاعت درج نہیں البتہ نظم کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غفران مکاں کی تینتیسویں سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی ہے۔ مثنوی اس ترتیب سے لکھی گئی ہے کہ غفران مکاں کے نام کے جملہ حروف مفرد کے مطابق ہر شعر ایک حرف سے شروع ہوتا ہے۔ مثنوی کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ **نام** ۔ اعلیحضرت ظل سبحانی نواب میر محبوب علیخاں شاہ دکن

حروف مفرد ۔ ا ع ل ی ح ض ر ت ظ ل س ب ح ا ن ی ن و ا ب م ی ر م ح ب و ب ع ل ی خ ا ن ش ا ہ د ک ن ۔

ا	اللہ کی حمد لکھہ رہا ہوں	مداح رسول کہہ رہا ہوں
ع	عاشق ہوں دل سے پنجتن کا	وصّاف حسین اور حسن کا
ل	لاساقی پلا شراب توحید	ہو جائے ہمارے گھر میں بھی عید
ی	یاروں کو ہے خواہش صبوحی	صدقے تیرے فداک روحی
ح	حاصل ہے جہاں کی آج شادی	کردو ہر شہر میں منادی
ض	ضرغام دکن سکندر اقبال	تینتیسواں آج انکا ہے سال

ر — راحت کے ہیں بجتے شادیانے — کیا دن یہ دکھائے ہیں خدا نے
ت — تابندہ ہے مہر آصفی آج — لیتے ہیں شہان ہند سے باج
ظ — ظل سبحاں ہے نام ان کا — اور عدل و سخا ہے کام انکا
ل — لائی ہے چمن میں باد نوروز — یہ مژدہ جاں فزا دل افروز
س — سال گرہ نظام ہے آج — دشمن کیوں ہو نہ تاخت و تاراج
ب — بھر کر دے ساقیا مجھے جام — آیا ہے خوشی کا آج پیغام
ح — حاکم جو ہے ملک آصفی کا — تقریب ہے اسکی۔ دن خوشی کا
ا — ارمان دلوں کے سب نکالیں — جھولے باغوں میں جا کے ڈالیں
ن — نوبت کی ٹکور آرہی ہے — شہنائی مزا دکھا رہی ہے
ی — یہ دن ہے کہ روز عید ہے یہ — تقریب خوش و سعید ہے یہ

یہ نظم صنعت توشیح میں لکھی گئی ہے اور لاجواب ہے۔

صبح اُمید :-

یہ ایک مجموعہ ہے جس میں قطعات و رباعیات ہیں حضور نظام حضرت غفران مکاں ۱۳۱۷ھ میں لارڈ کرزن بہادر وائسرائے سے ملنے کلکتہ تشریف لے گئے تھے آپکی مراجعت پر شاد نے یہ مجموعہ شائع کیا ہے اس سے صرف ایک قطعہ تاریخی یہاں پیش کیا جاتا ہے

کلکتہ کو جا کے شاہ آصف — تشریف دکن میں جبکہ لائے
کی عرض مراجعت کی تاریخ — بالنصرت و فتح واپس آئے

۱۳۱۷ھ

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)


July '35

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز حیدرآباد کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو دولت و ثروت کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور شعر و سخن سے بھی بہرہ ور رہا ہے۔ انکے والد نواب مشرف جنگ فیاض بھی اپنے زمانے کے اچھے شاعروں اور مصنفوں میں شمار کئے جاتے تھے ان کے جد امجد کی درگاہ پونہ کے قریب جنیر شریف میں واقع ہے جسکے سلسلہ میں وہاں انکے خاندان کا جاگیری معاش بھی موجود ہے پیشواؤں کے عہد حکومت میں اس خاندان کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی چنانچہ انکے جد اعلی محمد سلطان الدین خاں بہادر کو انکی علمی و اخلاقی فضیلتوں اور فوجی خدمات کی وجہ سے حکمران پونہ پنڈت پردہان "ماموں" پکارا کرتا تھا اور اس نے سرکاری طور پر بھی ان کو یہی خطاب دیا تھا۔ انکے دادا محمد ابراہیم الدین خاں حضرت آصفجاہ اول کے ہم رکاب تھے اور خود محمد سلطان الدین خاں بہادر آصفجاہ ثانی کی ایما پر حیدرآباد آئے اور متفرق مہمات میں ان کے ہمراہ رہے۔ ان کے بعد ان کے فرزندوں (قائم الدین خاں اور دائم الدین خاں) کو آبائی حقوق اور اعزازات کے ساتھ صوبہ برار میں جاگیرات سرفراز ہوئیں۔ محمد قائم الدین خاں کے پوتے محمد فیاض الدین خاں مشرف جنگ صاحب تذکرہ کے والد تھے۔ اس خاندان کے ایک فرد نواب حمد الدولہ کو ممالک محروسہ میں ایک وسیع علاقہ بطور تعہد کے دیا گیا تھا۔ عزیز کے دادا (محمد عزیز الدین خاں بہادر) ابھی دوآبہ ضلع رائچور کے مدت العمر تعلقدار رہے غرض عزیز کا خاندان حیدرآباد کے ان قابل قدر خاندانوں سے ہے جو ابتدا سے فوجی اور انتظامی قابلیتوں اور انہماک کے ساتھ شعر و سخن اور علم و فضل کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔

عزیز سنہ ۱۲۹۰ میں پیدا ہوئے۔ اسوقت میر شمس الدین فیض کو انتقال کئے ہوئے چند ہی سال ہوئے تھے اور ان کے تلامذہ عصر، مزاج، باقی، فیاض، رمز اور پاس وغیرہ کی مسیحا نفسیوں نے ان کے بعد بھی حیدرآباد کی شعر و سخن کی محفلوں کو عرصہ تک سرگرم کار رکھا تھا اور یہی وہ مغتنم ہستیاں تھیں جن میں سے اکثروں نے عزیز کی نشو و نما اور علمی و ادبی تربیت میں بھی کافی حصہ لیا فیاض (نواب مشرف جنگ) جنھوں نے اپنے استاد کا دیوان مرتب کیا تھا اور اپنی وفات تک ان کی یادگار میں ایک

ایک عالیشان سالانہ مشاعرہ کر کے گلدستۂ فیض شائع کیا کرتے تھے' اور جن کی شاعری' اخلاق' اور علم و فضل کا تذکرہ ان کی ہمعصر کتابوں کے علاوہ اسی کتاب میں گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ مندرج ہے' عزیز کے والد تھے انہوں نے ۱۳۲۶ھ میں اسوقت انتقال کیا جب عزیز کی عمر ۳۸ سال کی تھی اور وہ ذوق سخن میں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم چل رہے تھے۔

مزاج (حکیم مظفر الدین خاں) جنہوں نے اپنے استاد (فیض) کے دیوان کو ۱۳۱۳ھ میں چھپوایا' اور خود بھی اپنا ایک مکمل دیوان مرتب کر کے چھپوا رہے تھے کہ ۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا عزیز کے نہایت قریبی عزیز تھے اور ان کے ذوق سخن کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا تھا جیسا کہ کہا جاتا ہے عزیز نے انہی سے اپنے کلام کی اصلاح لینی شروع کی تھی۔

عصر (مولوی احمد علی) جو اپنے زمانہ کے جید عالموں اور بلند مرتبہ شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے عزیز پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے معاصرین اور خصوصاً تلامذۂ فیض کا ایک تذکرہ مرتب کیا تو اس میں عزیز کا حال اور نمونۂ اشعار بھی درج کیا حالانکہ اسوقت عزیز نہایت کمسن تھے اور عصر کے یہاں [illegible] پڑھا کرتے تھے۔

غرض جن بزرگوں کے زیر سایہ عزیز نے نشو و نما حاصل کی اور علم و فضل اور اعلیٰ ذوق سخن سے بہرہ ور تھے اس لحاظ سے عزیز کی خوش قسمتی قابل رشک ہے ایسے موثر ماحول میں اگر ان کی فطرت میں ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق صحیح جاگزیں نہ ہو جاتا تو مقام حیرت تھا۔

دوسری خصوصیت جس کا اظہار کلام عزیز کا مطالعہ کرنے والے کے لئے [illegible] کا باعث ہوگا ان کی مرفہ الحالی اور طبعی استغنا ہے۔ وہ ایک مقتدر اور خوش بخت خاندان میں پیدا ہوئے [illegible] ایک ذی اثر عہدہ دار کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کے والد علاوہ صوبہ [illegible] (جو بعد میں ان کے حصہ میں آئے) نواب صف نواز الملک معتمد [illegible] سے کیا گیا اور بعد میں عرصہ تک [illegible] کے علاوہ کئی سال تک مجلس وضع قوانین اور مجلس [illegible] اعلیٰحضرت غفران مکاں نے اپنی سالگرہ کی تقریب میں آبائی اعزاز [illegible]۔

غرض عزیز کوئی پیشہ ور شاعر نہیں تھے بلکہ فطری مناسبت اور بزرگوں کے فیضان صحبت کی وجہ سے بچپن ہی سے شعر و سخن کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا اسی کے اقتضا سے شعر گوئی پر مجبور رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں شگفتگی، شوخی اور رنگینی ہیں انکی طبیعت کی خودداری، استغنا اور رندمزاجی اُن کے کلام میں جگہ جگہ اپنی جھلکیں دکھاتی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

آپ بدلیں ہزار رنگ تو کیا | میری قسمت بدل نہیں سکتے
کچھ قناعت کچھ تو اے حرص چاہیئے | آدمی اچھے سے اچھا کیوں نہ ہو
خوشی ہے میری بہت کام نکلے | سمجھتا نہیں کوئی کیا چاہتا ہوں!
آدمی ناموس رہ کر دیکھ لے | مانگنے والے کو ملتا کچھ نہیں
وضعداری کا گلا دباتی ہے | منہ سے نالے نکل نہیں سکتے
چار دن کی زندگی کے واسطے! | اس کی خواہش اس کا ارماں کیا کریں!
دیکھ کر اپنا حال آپ عزیز | شکر پروردگار کرتا ہوں!
بیش و کم کی خواہشیں تو ہیں اضافی صورتیں | مے ملی اتنی مجھے جتنا مرا پیمانہ تھا
وضعداری ہے تو آنکھیں بھی نہیں ہے اُمید | درد جو دل میں ہے چہرے سے نمایاں ہو جائے

انہوں نے نہ تو کسی کی تعریف یا مذمت میں کوئی قصیدہ لکھا اور نہ کبھی کوئی ایسی نظم لکھی جو کسی ذاتی منفعت یا اس قسم کی کسی غرض پر مبنی ہو۔ انکی تمام شاعری انکے فطری ذوق اور ذاتی مسرت پر منحصر ہے، وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے شاعری کرتے رہے اگرچہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎ ۱

آخر الامر فن شعر عزیز | نقص اپنے کمال کا نکلا

۲ عزیز کی شاعری اور طرز سخن پر اثر ڈالنے والے اسباب میں داغ دہلوی کی ہمسایگی اور فیض صحبت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ حیدرآباد میں داغ کا قیام کئی سال تک محلہ ترپ بازار میں اُس کوٹھی میں رہا جو عزیز کی

قیام گاہ سے بالکل ملحق تھی اس طرح عین عنفوان شباب میں بھی عزیز کے ذوقِ سخن میں اضافہ کرنے والے اسباب مہیا ہو گئے۔ انہوں نے داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور اوقات دفتر کے بعد ان کا زیادہ وقت داغ ہی کے ساتھ گذرتا۔ غرض عزیز نے اس موقع سے ایسا فائدہ اٹھایا کہ حیدرآباد میں داغ کے تلامذہ میں شاید ہی کوئی ان کا ہمسر ہو سکا چنانچہ داغ کے ایک مشہور شاگرد احسن مارہروی نے "یادگار داغ" اور "جلوۂ داغ" میں عزیز کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور عزیز نے نہایت وفاشعاری کے ساتھ خود بھی اپنے کلام میں جابجا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بعد استاد داغ آج عزیز — تیری شہرت کو دیکھتے ہیں ہم

یہ ندا آئی دمِ فکرِ سخن مجھ کو عزیز — شاعری میں روشِ حضرت استاد نہ چھوڑ

تقلیدِ داغ باعثِ شہرت ہوئی عزیز — چرچا مرے کلام کا ہر انجمن میں ہے!

یہ واقعہ بھی ہے کہ داغ کے اس قابل ذکر فیضِ صحبت نے عزیز کے طرزِ سخن کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کا قدیم رنگ بالکل محو ہو گیا اور وہ داغ کے رنگ میں ایسے رنگے گئے کہ حیدرآباد تو کجا تمام ہندوستان میں بھی شاید ہی داغ کے کسی شاگرد نے اس خصوص میں اتنی کامیابی حاصل کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طبعی مناسبت اور خانگی حالات نے بھی اس رنگ کی تکمیل میں ان کی خاص طور پر مدد کی اس لحاظ سے ان کے حسبِ ذیل شعر نہایت دلچسپ ہیں!

کیا اور کوئی دل کو نہ لے گا بسبتِ در! — بے کار غم نے کہہ دیا بے کار ہو گیا

یہ شیوۂ وفا یہ عنایت غلط غلط — غم اور غم کو مجھ سے محبت غلط غلط

اس بے وفا کو دل جو دیا چوک ہو گئی — قسمت کا کیا گلہ ہے مرا انتخاب تھا

ان کو اس درجہ تنفر ہے دلِ عاشق سے — خط بھی لکھا تو کہیں دال نہیں لام نہیں

وفائیں کہاں کی کہاں کی محبت — انہیں تو مجھے دیکھے دم دیکھنا تھا

ہم سے جو ہوئی چوک محبت میں خطا کیا — ہوتی ہوئی آئی ہے یہ ہوتی ہے بشر سے

کلامِ عزیز کی سب سے اہم خصوصیت زبانِ دہلی کا غیر متزلزل اتباع ہے۔ حیدرآباد میں بہت کم ایسے شاعر ملیں گے

جنہوں نے دہلی کی ٹھیٹ زبان استعمال کرنے کا اتنا شدید التزام کیا ہو عزیز ہی ایسے شاعر ہیں جو اسکو برابر نباہتے رہے حالانکہ اس اثنا میں یہاں اکثر شاعر ایسے بھی پیدا ہوئے جو اس قسم کے التزام کے خلاف تھے اور ان میں بعض تو اپنے وطن (حیدرآباد) کی زبان اور محاوروں کو نظم میں استعمال کرنے پر کمربستہ رہے مگر عزیز اس رجحان سے متاثر نہیں ہوئے۔ انہوں نے دہلی (اور خاصکر اپنے استاد داغ) کی زبان کی پابندی اس استواری و وفاداری کے ساتھ کی ہے کہ ادبیات کی تاریخوں میں اس کی نظیر بہت مشکل سے ملے گی۔ انہوں نے ہمیشہ دہلی کے محاوروں کے صحیح استعمال پر زیادہ زور دیا وہ کہتے ہیں ؎

حیرت ہے کیوں عزیز یہ ہوتا ہے اشتباہ ۔۔۔ استاد کی زبان کا تیری زبان پر

داغ کے بعد لطف شعر عزیز ۔۔۔ ہم نے تیری زبان میں دیکھا

غرض یہی وہ اہم خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے عزیز کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا ہو گیا ہے اور اسی کیفیت نے انکی شاعری میں ایک جدا انداز پیدا کر دیا جس کی بنا پر وہ سب سے علیحدہ ایک نئی طرز کے مالک نظر آتے ہیں انکے اشعار ہیں ؎

سب سے انداز جدا ہے ترے کہنے کا عزیز ۔۔۔ آج ہم رنگ نہیں کوئی سخنور تیرا

کیا کیا ہیں خوبیاں ترے اشعار میں عزیز ۔۔۔ لفظوں کے اختراع کی ان کے نشست کی

یہ بیاں اور یہ انداز یہ ترکیب عزیز ۔۔۔ کون ہے جو نہیں قائل تری گویائی کا!

عزیز کی شاعری کے متعلق اس وقت تک متعدد اصحاب بہت کچھ لکھ چکے ہیں اسلئے ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ انکی شاعری کی ہر خصوصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ متعدد رسائل مثلاً "زمانہ" کانپور، "رہنمائے تعلیم" لاہور، "مجلہ مکتبہ" "حیات سخن" حیدرآباد کے علاوہ کئی کتابوں مثلاً "تاریخ النوائط" (از عزیز جنگ مرحوم) "دکن میں اردو" (از مولوی نصیر الدین ہاشمی) اور "جدید اردو شاعری" (از پروفیسر عبدالقادر سروری) میں بھی عزیز کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ موجود ہے لیکن "رہنمائے تعلیم" کے جوبلی نمبر بابت ۱۹۳۱ء میں داغ ہی کے ایک تلمیذ رشید جناب نوح ناروی (رئیس نارہ ضلع الہ آباد) نے عزیز کی شاعری پر جو بسیط مضمون ۔۔ صفحات کا شائع کیا ہے اس میں عزیز کے ڈیڑھ سو سے زیادہ اشعار پیش کئے گئے ہیں جس میں سے قریب قریب انہی اشعار ایسے ہیں جن پر انہوں نے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان انہی اشعار سے ہم یہاں

صرف آٹھ شعر توضیح کی رائے کے ساتھ نقل کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ عزیز کے کلام کے نسبت ان کے ہم استاد بھائی کیا خیال رکھتے ہیں!

۱۔ کچھ اس طرح مرے لب پہ خدا کا نام آیا　　ہوا یہ شور کہ موسیٰ کا ہمکلام آیا

کچھ "اس طرح" اس ٹکڑے کی وسعت اور خدا کے نام کی تخصیص کی داد کیا دی جائے۔ پھر "موسیٰ کا ہمکلام آیا" صرف ہمکلام ہی نہیں موسیٰ کا لفظ بھی موجود ہے۔ اس لفظ نے شعر میں جان ڈال دی اور لطف معنی نے مطلع کو مطلع خورشید بنا دیا" (رہنمائے تعلیم صفحہ ۳۵۴)

۲۔ چھوڑ کر پھولوں کا دامن باغ میں　　اڑ رہی ہے نکہت برباد کیا

"اڑ رہی ہے" اس شعر میں خاص ٹکڑا ہے۔ اور اسی ٹکڑے نے اس شعر میں دو معنی پیدا کر دیے۔ اڑنے کے معنی فخر کرنے کے بھی ہیں جب پھولوں کا دامن چھٹ گیا تو نکہت کیلئے فخر کا موقع کیا رہ گیا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ پھولوں کا دامن چھوڑ کر اڑ رہی ہے۔ یعنے آوارہ و سرگشتہ پھرتی ہے "نکہت برباد" اس موصوف صفت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ نکہت اور وہ بھی برباد سبحان اللہ (رہنمائے تعلیم صفحہ ۳۵۶)

۳۔ جھوٹے وعدوں پہ تھی اپنی زندگی　　اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا

یہ شعر حسرت و یاس کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ پہلے معلوم تھا کہ سب جھوٹے وعدے تھے۔ اور ان جھوٹے وعدوں کو بھی غنیمت جان کر ہم جی رہے تھے۔ لیکن اب جھوٹے وعدے بھی نہیں ہوتے۔ کوئی صورت زندگی کی باقی نہ رہی۔ ہائے! ہائے!! اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا" "وہ بھی آسرا جاتا رہا" خوب کہا ہے (صفحہ ۳۵۹)

۴۔ کیا اور کوئی دل کو نہ لگتا بجا درست　　بیکار تم نے کہہ دیا بیکار ہو گیا

اس شعر کی ترکیب اور انداز بیان پر حضرت داغ کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے عزیز صاحب پردے میں داغ بول رہے ہیں۔ کیا اتنا صاف شعر کوئی کہہ سکتا ہے۔ پہلے مصرعہ کی شان اردو محاورے کی زبان ہے جس قدر بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔ طرز بیان پر دل لوٹ پوٹ ہوا جاتا ہے۔ صفحہ ۳۶۰

بام پردہ تو کسی روز ترا ، رنہ ہوئے ۵ دیکھنے والوں کا میلا ہیں دیوار ہا

"وہ تو" یہ ٹکڑا قیامت ہے ۔ ایسے الفاظ تلاش سے

نہیں ملتے حسن اتفاق سے مل جاتے ہیں" (ص ٣٦١)

حال ابتر ہے شب غم نالہ شبگیر کا ۶ اس اندھیرے میں پتہ چلتا نہیں تاثیر کا

اس مطلع کو بار بار پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں ۔
دل لطف اٹھاتا ہے زبان بیان نہیں کر سکتی ایسے ہی مطلع شاعر کا
نام روشن کرتے ہیں کہاں تک اس کی شرح لکھوں ، دفتر درکار ہے"
(ص ٣٦٢)

بے ثباتی کا اگر رنگ یہی ہے تو عزیز ۶ رونق عالم ایجاد کہاں تک آخر

یہ زمین بھی نئی ہے ۔ اب تک کسی کی غزل اس ردیف قافیہ

میں نظر نہیں آئی ۔ دنیا کی بے ثباتی کا خاص مرقع ہے ۔ دوسرے

مصرعہ میں غضب کا درد ہے ۔ ہائے ۔ رونق عالم ایجاد کہاں تک آخر ! (ص ٣٦٣)

دیکھنا راہ پر آجائیگی آتے آتے ۷ گردش چشم تری گردش ایام نہیں

شعر سے مشتاقی ظاہر ہوتی ہے ۔ گردش ایام ایک ایسی چیز

ہے جس پر کسی کا زور نہیں لیکن تیری گردش چشم آتے آتے کسی

نہ کسی طرح راہ پر آہی جائیگی "پھر دیکھنا" یہ لفظ توجہ کے قابل ہے خصوصاً گردش

چشم کے لحاظ سے تو بہت ہی موزوں ہے" (ص ٣٦٧)

غرض ایسی بلند پایہ ہستیوں کے مضامین ناعزیز کی شاعری کے متعلق اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں انکی شخصیت مزید تعارف کی محتاج نہیں رہی ۔ انکی شاعرانہ قوت غزل ہی پر صرف ہوتی رہی انہوں نے نہ تو کوئی قصیدہ لکھا نہ کوئی مثنوی ۔ غزل اور صرف غزل ہی انکی شاعری کا بہترین سرمایہ ہے ۔ شیریں الفاظ ، چست بندش ، جدت ادا کے علاوہ محاورات کی موزونیت اور انکا برمحل استعمال روزمرہ کی پابندی ، زبان کی سلاست ، انداز بیان کی ندرت ان کی سخن طرازی کے چند مخصوص صفات ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا ۔

ساقی کہاں کی بھول ہے کہنے کی بات ہے
والستہ تو نے غیر کو دی میرے نام کی

ہر گام پہ یاس ہے آہی !
وہ چال نہیں ہے نامہ بر کی

٢ کچھ ناز ہی جیسا بھی ہے
اس بناوٹ کی انتہا بھی ہے

محبت تیری کیا تیری وفا کیا
ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا ؟

یہ تجھ سے چوک ہوئی [illegible] قاصد
ہمارا ذکر ذرا چھیڑ کر کہا تو کیا ؟

تم سے کب تھی وصال کی امید
یہ بھی اک اتفاق ہے گویا

٣ کیا چھوٹا اڑ رہی ہے زمانہ کی [illegible]
بچھے سجانے کی کوئی صورت نہیں آج

مٹ جائے ولیے ایسا آرزو جھوٹ
الجھا ہے سر سے ہجر کی آفت [illegible] ٹلا

معلوم نہیں تجھ کو ادا ہیں کہ انجام
لڑنے کو تو لڑتی ہے نظر دیکھیے کیا ہو

ترے دل میں امری قسمت ہی ظالم
کسی کو کیا خبر کیا جانے کیا ہے ؟

شب فرقت میں کیا کرے کوئی　　کچھ اندھیرے میں سوجھتا بھی ہے
ہم سے جو ہوئی چوک محبت میں خطا کیا　　ہوتی ہوئی آئی ہے یہ ہوتی ہے بشر سے

بڑی کیا ہے اسیران قفس کو　　گلستاں میں بہار آئے نہ آئے
تماشا ہے وہ جب کرتے ہیں عذر　　اچھل پڑتی ہے حسرت ایک پر ایک

دیوانگی عشق کا کھلتا نہیں کچھ حال　　دھڑکا ہے یہی آنکھ پہ پھر کچھ نہ کیا ہو
مجھ پہ ڈورے ڈالتی ہے رات دن　　سحر آگیں فتنہ گر عیار آنکھ

نگاہوں میں سمانا اسکا جلوہ　　اگر میں دیکھتا بھی دیکھتا کیا
شام غم کا فقط نہیں کھٹکا　　مجھ کو اندیشۂ سحر بھی ہے

چشم پوشی بھی ہے انہیں منظور　　مری تقصیر پر نظر بھی ہے

تشبیہات اور استعارے ہر شاعر کے کلام میں کم و بیش موجود ہیں خصوصاً مضمون آفریں شعراء نے مستعمل اور مفرد تشبیہات کو سو سو دفعہ دھرایا ہے اور اس میں ندرت پیدا کرنے کی گنجائش کم ہے اگرچہ مرکب تشبیہات میں جدت کا موقع ہے لیکن یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، کہیں کہیں عزیز کے کلام میں اچھی تشبیہیں نظر آتی ہیں اور باوجود تکلفات معنوی کے خواہ اسکو تشبیہ سے تعلق ہو یا استعارے سے انکا وہ جو ایک خاص رنگ اور انداز بیان ہے" زائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

ہوتے ہی صبح وصل کی شب دیکھتا کیا　　تلوار بن گئی ہے کرن آفتاب کی
دشمن پہ گر رہا ہے یہ بن بن کے بجلیاں　　اتنک تو میرے دل میں اضطراب تھا

اپنی خوشی سے طایر جاں کس طرح اڑے　　الجھا ہوا ہے تار نفس میں نہیں کیا
روز ازل آئے تھے کا پردہ حجاب تھا　　تار نگاہ و رشتہ بند نقاب تھا

چھوٹ جاؤں قید غم سے زندگی میں کیا مجال　　ربع مسکوں ہے احاطہ خانۂ زنجیر کا
تسنیم جسکا نام ہے کوثر ہے جسکا نام　　سوتیں ہیں دونوں مری چشم پر آب کی

سرد آہوں سے بھبکا جاتا ہے سینے میں جگر　　آتش غم تیز ہوتی ہے ہوا کے سانس سے
تڑپ فرقت میں جان ناتواں کی　　ہے تصویر مرگ ناگہاں کی

غزل کا حسن ردیف کی پابندی پر موقوف ہے خصوصاً مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیے اور ردیف کی ہم آہنگی جو معنوی لطافت اور ظاہری حسن پیدا ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں چنانچہ حیدر یار جنگ نظم طباطبائی اپنے دیوان (صوت تغزل) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ وصف متاخرین میں سوا داغ کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا" اس رائے سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن یہ سعادت بزور بازو نہیں تھی اور نہ ساخت سے شعر میں بے ساختگی پیدا ہو سکتی ہے" یہاں عزیز کے دیوان سے چند مطلعے نقل کئے جاتے ہیں نظم طباطبائی کے خیال کی روشنی میں اسکا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

نہ بدلنا تھا نہ بدلا دل شیدا اپنا　　رنگ ہر وقت بدلتی رہی دنیا اپنا
چشم عبرت کیلئے دنیا کچھ نہیں　　یہ نہ سمجھے کوئی دنیا کچھ نہیں!

عیاں یا نہاں اک نظر دیکھ لیتے ۔۔۔ کسی صورت انکو مگر دیکھ لیتے
کوشش ایسی چاہیئے تدبیر ایسی چاہیئے ۔۔۔ غیر بھی کہنے لگیں تقدیر ایسی چاہیئے

بزم دشمن میں دیکھ کر تم کو ۔۔۔ کیا گذرتی ہے کیا خبر تم کو
ہجر کا غم ہجر کا آزار رہنے دیجئے ۔۔۔ عشق کے بیمار کو بیمار رہنے دیجئے

ماہ کامل ہلال ہو ہی گیا! ۔۔۔ حسن کو بھی زوال ہو ہی گیا!!
نالوں کا شب ہجر اثر دیکھیے کیا ہو! ۔۔۔ کٹ جائیگی جب رات سحر دیکھیے کیا ہو!

اپنی روش کو دیکھ کے دل ناتواں نہ چھوڑ ۔۔۔ نالے سحر کے شام کی آہ و فغاں نہ چھوڑ
مٹی ہے گلشن عالم میں طرح آشیاں کیا کیا ۔۔۔ چلی ہیں آندھیاں کیا کیا گری ہیں بجلیاں کیا کیا

غزل کی ساخت دوسرے اصناف سخن سے جدا ہے اس میں مضمون کا تسلسل نہیں ہوتا ایک شعر میں حسن کی تعریف اور دوسرے شعر میں عشق کا ذکر تیسرے میں اخلاق چوتھے میں تصوف اسی طرح مختلف اور متضاد مضامین پر غزل ختم ہو جاتی ہے انہیں متضاد مضامین کے متعلق مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔"

اس اہتمام کے باوجود غالب کے کلام میں تصوف کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے جتنا میر درد کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اسکا سبب ظاہر ہے اُسی شعر میں اثر ہوتا ہے جو دل سے نکلے ؛ جو اشعار تقلیدی مضامین سے آراستہ ہوتے ہیں وہ اثر سے خالی رہجاتے ہیں۔ عزیز کا رنگ تقلیدی نہیں ہے وہ ہر مضمون کو اپنے مخصوص رنگ میں بیان کرتے ہیں مثلاً ذیل کے چند اشعار میں تصوف، اور اخلاق وغیرہ سے متعلقہ مضامین کی جھلک موجود ہے۔

میرے جملہ صفات میں پنہاں ۔۔۔ تیری اک ذات کے سوا کیا ہے
تشنۂ رنگ ہے ہر پھول کی پتی پتی ۔۔۔ اور خالی نہیں پھولوں سے گلستاں کوئی

اٹھ گیا پردۂ غفلت تو ہوا یہ معلوم ۔۔۔ دل سے بڑھ کر نہیں آئینۂ عرفاں کوئی
مجھ کو کریم تیرے کرم پر ہے اتکا ۔۔۔ تکیہ ہے صوم پر نہ بھروسہ صلوات پہ

بے سر و پا نہیں ہے یہ دنیا ۔۔۔ ابتدا بھی ہے انتہا بھی ہے
آدمیت ہے آدمی کی یہی! ۔۔۔ آپ اپنا بُرا بھلا جانے!

چمن دہر میں ناقص کو ملے کس طرح فروغ ۔۔۔ کہیں اچھے ثمر خام ہوا کرتے ہیں؟
دشمنوں سے ہے مناسب دوستی! ۔۔۔ دوستوں سے دشمنی اچھی نہیں!

بلبلوں کے ہجوم کی خاطر ۔۔۔ گل چراغ مزار کرتا ہوں
اپنوں کا پاس چاہیئے مہماں کا لحاظ ۔۔۔ انسان کو ضرور ہے انساں کا لحاظ

کچھ عرصہ سے نوجوان مدعیان "طرز جدید" قافیے اور ردیف کی پابندی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ شاید یہ بیزاری حالی کے اس خیال کا اثر ہو جو انہوں نے مقدمۂ شعر و شاعری" میں ایک مقام پر ظاہر کیا ہے۔

اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے" مگر قافیہ شاعر کو بلا شبہ اسکے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے" صلا ۳

لیکن باوجود ان مشکلات کے عزیز نے اپنی قوت بیانیہ اور پختہ مشاقی سے قافیہ اور ردیف کے دشوار گزار منازل کو کس حسن سے طے کیا ہے اور ردیف کی پابندی نے شعر کے مرتبہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا!

وصل سے کم نہیں امیدِ وصال / ناامیدی فراق ہے گویا
رہو گے حسن پہ مغرور کب تک / نہ بدلے گی زمانے کی ہوا کیا!

باغباں بھی تاک میں صیاد بھی! / کس طرح چھوڑیں گلستاں کیا کریں
گر نکلتا ہو تو نکلیں حسرتیں / دل میں یارو رکھ کے کھٹکا بھی نہیں

آرزو کا گوشۂ دل سے نکلنا تھا محال / آپ کہتے ہیں اگر دشوار نہ سمجھیے
داد خواہی ہے کہاں فریاد کی! / اس سے بڑھ کر اور ہو بیداد کیا

اگر ٹوٹا کوئی ساغر تو ساقی / بنے گا میکشوں کی خاک سے پھر
گُل نازک پہ جب پڑنے لگی دھوپ / کیا بلبل نے سایہ اپنے پر سے

ہزاروں بار دامِ فکر سے ہم / یہ رنگ طائرِ ادراک نکلے
جرس دل کی جو سنئے آواز / راہ بھٹکے نہ مسافر کوئی

کبھی تو سامنے بے پردہ آؤ / کبھی تو حسرتِ دیدار نکلے
راز تھا یہ عشق جب تک راز تھا / اب تو واقف اک زمانہ ہو گیا

کل تک تو رہا حشر کا ساماں آہی / پھر آج سرِ راہ گزر دیکھ لیجئے
نادم ہوا ہے جب دغا کوئی / درد کی انتہا نہیں ہوتی

تقدیر میری وصل ہو جب تو کیا کرو / چھوٹی نہ ہم سے بات کوئی نیاز کی
منہ نہ کھلوائیے خطا تو دیجئے / کچھ کہوں گا تو شکایت ہو گی

ذرا دستِ جنوں ہشیار رہنا / تو پابار ہے گر بکار دامن کا
نہ کرتے وفا کے نہ بن کے شکوے / مرے دل کو بھی وہ اگر دیکھ لیتے

چنانچہ ہم وزن الفاظ یا چند افعال یا اسما جمع کر کے مصرع یا شعر موزوں کرنا ان کی شاعری کا مخصوص انداز ہے وہ مناسب اور شیریں الفاظ مصرعوں میں اس حسن سے چن لیتے ہیں کہ ان سے موسیقیت اور ایک متانت ادا ایسی پر کیف پیدا ہوتی ہے جس سے سامعت لطف اندوز اور دل مسرت سے مدہوش ہو جاتا ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

نہ پڑھتے نہ پڑھتے بلا سے نہ پڑھتے / مرا خط تو وہ نامہ بر دیکھ لیتے
کہاں ساقی کہاں یہ صحبت / کہاں ڈوبے کہاں ہیرا نکلے

کہنے کو ہم نے کہہ بھی دیا اضطرار / سننے کو کس نے سن بھی لیا ماجرا دل
ہنس ہنس کے مجھے کھو لیے باتوں میں / وہ لے تو گئے دل کو مگر دیکھئے کیا ہو

نکلنے کو ترستی ہے تمنا / نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے
کہا کیا حشر کی سی حشر اٹھاتا / عذاب دیا ہوا آئی عذاب سے پہلے

حلق میرا جگر میرا گردن میری تیغ تیری ہے چھری تیری خنجر تیرا نہیں اٹھتی نظر انکی نہیں ملتی نہیں تھمتی نہیں کھلتا کہ دیکھا کسنے کا کسے چھپا لگا
امید وصل بر آتی ضرور بر آتی طریقہ سہل کوئی اختیار کرتا تھا گھٹا اور فرقت میں صبر و تحمل بڑا اور درد جگر بڑھتے بڑھتے

شاعری میں معاملہ بندی کے علاوہ معشوق کا حلیہ، زیور و لباس، ناز و انداز کا بیان غیر معتدل طریقے پر ہوتا رہا ہے اس رنگ میں لسان دہلی کے بعض متبعین نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر عزیز اس خصوص میں زیادہ محتاط ہیں، ان کے یہاں کنگھی چوٹی مسّی کاجل کرتی انگیا وغیرہ الفاظ قطعاً نظر نہیں آتے۔ زلف و گیسو، رخ و عارض، یہ الفاظ کہیں کہیں نظم میں آگئے ہیں مگر انداز بیان سب سے الگ ہے اور اس خوبصورتی سے یہ الفاظ موزوں ہوئے ہیں جس سے بندش میں دل آویزی اور مضمون میں ندرت پیدا ہوگئی ہے مثلاً

زلفوں نے وہیں بلائیں لے لیں رخ سے جو ذرا نقاب سرکی دمبدم تم جو سنورتی ہیں تمھاری کاکلیں دمبدم بننے بگڑنے کو ہمارا دل بنا
کس نے بوسے لئے کف پا کے کیوں ہے پھیکا تری حنا کا رنگ رہ رہ کے یہ نکھرتی ہے رخ پہ ہوا کے تیغ رہ رہ کے وہ الجھتے ہیں زلف دراز سے

اگرچہ دیوان کی ترتیب کا طریقہ ردیف وار حروف ابجد کی پابندی پر موقوف ہے اور یہ بدعت شعری قدامت سے اب تک برابر چلی آتی ہے اسلئے عزیز کے دونوں دیوان بھی اس سے خالی نظر نہیں آتے تاہم انھوں نے ردیفوں کیلئے جن الفاظ کی تلاش کی ہے وہ انکے مذاق اور رنگ کے لحاظ سے سب سے الگ اور زیادہ پر لطف ہیں جن کی چند مثالیں ذیل میں لکھی جاتی ہیں ؎

انکے وعدہ کا جب آتا ہے خیال مجھ کو آتی ہے ہنسی آپ ہی آپ انہیں اسکی محبت میں خبر کیا چلی آتی ہے کیونکر چوٹ پر چوٹ
کہتی ہے شان امکان دل کی ہستی کون و مکاں ہیچ ہمہ ہیچ او جفا جو تجھے کرنی ہے خدا سے فریاد او ستمگر مجھے ایک آہ تری آتی ہے یاد
خون تمنا نے ابھارا عزیز ان کو ہوا رنگ حنا پر گھمنڈ نقشہ کھینچوں جو اپنے دل کا صدقے ہو قلم نثار کاغذ
مصروف جور ہو وہ جفا جو ذرا ٹھہر تو بھی گردش کی ابھی آسمان تھم مبارک ہم صفیرو تم کو گلشن ہمارا تو ٹھکانہ ہے قفس بس
وقت سے پہلے ترے خنجر میں کیونکر مرا کہیں نالے ہی سے ٹلتی ہے قضا کی تلوار عام ہے قاتل کو سر و کار کیا سر بھی کٹے اپنے قلم خاص خاص
جدائی تو اپنے مقدر میں تھی کہ لکھتے ہیں دل کے سیہ حرف حرف نہیں ہوتا ہے ہلکا بار عصیاں اٹھائے بوجھ یہ انساں کہاں تک

حاصل کلام انھوں نے غزل گوئی میں ایک خاص طرز اختیار کی ہے تنگ قافیوں اور غیر معمولی ردیفوں میں بھی انکی غزلیں ہیں ان کا کلام اگرچہ بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر ایسا کہنا دشوار ہے ان کے اشعار سہل ممتنع کا مرقع ہیں اور فصاحت کا دفتر

جس میں دماغ کی نمائش کم اور دل کا حال زیادہ ہے، ثقیل الفاظ و مصادر فارسی سے احتراز کرتے ہیں۔ بقول داغ ؎

کہتے ہیں اسے زبان اردو　　　　جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ان کا کلام صاف و شستہ شیریں و برجستہ ہے اور اردو زبان کے محاورات و روزمرہ کا گنجینہ، بلاغت معنوی اور فصاحت لفظی سے معمور ہے۔ دو غزلوں کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں اس سے ان کے مخصوص رنگ اور انداز بیان کا اندازہ ہو جائے گا۔

چرخ کیا ہے چرخ کی بنیاد کیا　　رائیگاں جاتی مری فریاد کیا
تھم گیا ہے کس لئے درد جگر　　رک گیا ہے خنجر بیداد کیا

چھوڑ کر پھولوں کا دامن باغ میں　　اڑ رہی ہے نکہت برباد کیا
داد ملتی ہے کہاں فریاد کی　　اس سے بڑھکر اور ہو بیداد کیا

ڈورتا ہے میری رگ رگ میں لہو　　ڈھونڈتا ہے نشتر فصاد کیا
دور منزل اور دل ہے ناتواں　　کیا خبر اسکی پڑی افتاد کیا

کیوں نہ کھلتے ہجر کی شب بھی عزیز　　بند ہی رہتے لب فریاد کیا

نالے دم لیتے نہیں آہ و فغاں رکتی نہیں　　گو قفس میں بند ہوں لیکن زباں رکتی نہیں
عرش پر جائیگی جائیگی برابر جائیگی　　آہ میری آہ زیر آسماں رکتی نہیں

ڈر رہا ہوں ٹوٹ جائینگی قفس کی تیلیاں　　کیا مصیبت ہے ہوائے بوستاں رکتی نہیں
تذکرے ہوں جور کے یا ہو وفا کی داستاں　　سامنے اغیار کے میری زباں رکتی نہیں

آ رہی ہے کھینچ کے فرقت میں لبوں پر بار بار　　ناتوانی میں بھی جان ناتواں رکتی نہیں
اڑ کے ہم پہنچینگے منزل پر ہوائے شوق میں　　کارواں رکجائے گرد کارواں رکتی نہیں

دقتیں حائل ہیں فن شعر میں لیکن عزیز　　ایک ندی ہے مری طبع رواں رکتی نہیں

عزیز کا پہلا دیوان آج سے اٹھائیس سال قبل شائع ہوا تھا۔ اس کے نسخے اب بہت کم یاب ہیں۔ دوسرا دیوان ۱۳۴۹ھ میں چھپا۔ آج سے سینتیس ۳۷ سال قبل ۱۳۱۷ھ میں ان کا ایک نہایت دلچسپ واسوخت "ایاغ شباب" شائع ہوا تھا جس نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ اسکے نسخے اصل قیمت سے کئی گونا زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے رہے۔ اسکی سب سے اہم خصوصیت زندگی اور زندہ دلی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ قریب قریب ایک ہزار شعر کی طویل اور مسلسل نظم ہونے کے باوجود شروع سے آخر تک نہایت ہی دلچسپ ہے مجلہ مکتبہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں جو تفصیلی مضمون "نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں اس واسوخت کا کچھ انتخاب بھی درج ہے۔ چونکہ یہ عزیز کے نہایت قدیم کلام میں سے ہے اسلئے یہاں اس کے تین بند بطور نمونہ درج کرتے ہیں جنکے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کو عنفوان شباب میں بھی کس درجہ قدرت حاصل تھی۔ وہ ساقی نامہ کے طور پر بہاریہ اشعار کے سلسلہ میں کہتے ہیں :۔

پھر طبیعت کی روانی میں دکھاؤں ساقی! — پھر نئے سر سے جوانی میں دکھاؤں ساقی
اپنی پھر سحر بیانی میں دکھاؤں ساقی — شان الفاظ و معانی میں دکھاؤں ساقی
رنگ جم جائیں مضامین کے گل ایسے پھولیں
بلبلیں فصل بہاری کے ترانے بھولیں

باغ کی تعریف میں سے ایک بند یہ ہے :۔

غنچے پھولوں کے نمایاں در دنداں کی طرح — سرو استادہ روش پر قد جاناں کی طرح
روشنی تھی زرِ گل میں رخِ تاباں کی طرح — بکھری سنبل تھی کہیں زلف پریشاں کی طرح
قابل دید تھی جادو نظری نرگس کی
ایک کی دو کی ہو تعریف کروں کس کس کی

عشق و محبت کی تعریف میں لکھا ہے :۔

نامور اس کی بدولت ہوئے کیسے کیسے — رونق بزم محبت ہوئے کیسے کیسے
صاحب شوکت و عظمت ہوئے کیسے کیسے — اس سے اعجاز و کرامت ہوئے کیسے کیسے
دی زلیخا کو نئے سر سے جوانی کس نے
اور کی قیس کی مشہور کہانی کس نے

عزیز نے بعض اچھی تاریخیں بھی کہی ہیں جن میں سے تین خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اعلیحضرت غفران مکاں کی ولادت کی تاریخ استاد فیض نے "چراغ دکھن" سے نکالی تھی، اور انکی وفات کی تاریخ عزیز نے "چراغ بہشت" سے چنانچہ انکا آخری
۱۹۱۱ء — ۱۲۸۳
مصرعہ ہے۔ "چراغ دکھن شد چراغ بہشت"۔

نواب سر آسمان جاہ اعظم الامراء کے صاحبزادہ نواب معین الدولہ بہادر امیر اکبر جب ان کے زمانہ وزارت میں پیدا ہوئے تو عزیز نے قطعہ تاریخ لکھا تھا جس کا آخری مصرع ہے۔ "خلف الصدق وزیر سلطان"

اعلیحضرت آصفجاہ سابع کی خدمت میں جب جامعہ عثمانیہ نے خطاب "سلطان العلوم" کی نذر پیش کی تو عزیز نے یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا:۔

قدردانِ علم تو ہے علم تیرا قدرداں اے نظام الملک آصفجاہ خاقانِ علوم

ایک تیری ذات سے سرسبز ہے کشتِ عمل ایک تیرے دم سے تازہ ہے گلستانِ علوم

مصرعِ تاریخ کہہ کر نذر کو لایا عزیز

محسنِ عالم ہے تو اے شاہ سلطان العلوم

۱۳۴۴ ف

عزیز کو اپنے گذشتہ پچاس سالہ عہد شاعری میں جتنے شعر کہنے کا موقع ملا ہوگا ان کی تعداد تو شاید انھیں کبھی نہ معلوم ہو کیونکہ مشہور ہے کہ وہ اپنے تلامذہ اور دوستوں کو بھی بہت سے شعر دیدیا کرتے ہیں۔ مگر جو کلام اس وقت تک مدون ہو چکا ہے اس میں بھی قریب قریب دس ہزار شعر ہیں ان میں سے موقتی نظموں، سلاموں، رباعیوں اور سوخت وغیرہ کو نکالنے کے بعد تقریباً آٹھ ہزار شعر محض غزل کے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ایک ہزار شعر کا ایک مختصر سا انتخاب "متاعِ سخن" چند ماہ قبل "سلسلہ انتخابات شعرائے دکن" کی سرپرستی میں شائع ہو چکا ہے۔

مرزا غلام مصطفیٰ رسا

از

محمد اکبر الدین صدیقی سابق مدیر الموسیٰ

مرقع سخن



غلام مصطفیٰ رسا

مرزا غلام مصطفےٰ رسا

مرزا غلام مصطفےٰ رسا حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ نو سال تک اس پیشہ کو انجام دیتے رہے پھر ۱۳۱۵ف میں سررشتہ امور مذہبی میں ملازم ہوئے اور ۱۳۱۶ف میں مددگار ناظم امور مذہبی کے عہدہ پر ترقی پائی۔ پانچ سال تک اسی عہدہ پر فائز رہنے کے بعد یکم شہریور ۱۳۲۱ف کو مال میں منتقل ہوگئے اور سوم تعلقداری ڈویژن رائچور پر متعین ہوئے کچھ دنوں بعد مددگاری مال ضلع اورنگ آباد پر تبادلہ ہوگیا پھر تعلقہ جالنہ پر کارگذار رہے اور بتاریخ یکم خورداد ۱۳۲۹ف سررشتہ مال سے سررشتہ کروڑگیری میں بہ مہتمم محصولخانہ کی حیثیت سے منتقل ہوگئے۔ مختلف محصول خانوں پر کارگذار رہے اور مختص گریڈ بھی پایا۔ مہتمم صاحبان علاقہ کروڑگیری کے کمیشن تحقیقات میں سرکاری پیروکار رہے جس کا بھتہ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ کے علاوہ ملا کرتا تھا۔

رسا نے امتحانات عہدہ داران مال و جوڈیشل میں بدرجہ اعلیٰ کامیابی حاصل کی تھی وہ اسوقت خدمت نائب نظامت کروڑگیری پر مامور اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رسا کو بچپن سے شاعری کا چسکا ہے۔ گیارہ بارہ سال کے سن سے شعر کہتے تھے لیکن اسوقت انکا تخلص بجائے رسا کے رسوا تھا اس زمانے کا ایک شعر جو کہ کم سنی کا کہا ہوا ہے قابل داد ہے ؎

رسوا اندھیری رات میں چلنے کا خوف کیا　　　مانا کہ کوئی ساتھ نہیں ہے خدا تو ہے

حضرت فیض رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد غلام محی الدین خاں جگر ان کے ہم محلہ اور کہنہ مشق شاعر تھے چنانچہ رسا نے اپنا کلام ابتداً انھیں کو دکھایا جگر نے انکو ہونہار دیکھ کر بہت حوصلہ افزائی کی یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت داغ کی شاعری کے چرچے سنے جاتے تھے اور وہ ابھی دہلی میں تھے لیکن دکن انکے کلام سے واقف ہوچکا تھا آخر کار داغ بھی دکن آگئے اور بزم شعر گرم ہونی شروع ہوئی

ایک دن رسا بھی داغ کے یہاں جا پہنچے جب داغ نے آنے کا سبب دریافت کیا تو رسا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ شوق شاگردی کھینچ لایا ہے۔ داغ ہنسنے لگے اور تعجب سے کہا کہ "کچھ پڑھو" اس وقت وہاں اور لوگ بھی موجود تھے سبھوں نے غزل سنی۔ اصلاح بھی

دیدی گئی لیکن اس کمسنی میں ایسی اچھی غزل کہنے پر سب متعجب تھے استاد داغ نے رسا سے روزانہ آنے کیلئے کہا غرض وہ اس دن سے داغ کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے۔ پہلے روز تو کیا کئی دن تک بھی کسی کو یقین نہ تھا کہ رسا کی غزلیں انھیں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں یا کسی مشاق شاعر کی دیکھی یا کہی ہوئی ہیں لیکن جب رسا داغ کی محفل کے سرگرم رکن ہوگئے تو سب ہی ان کی شعر گوئی کے قائل تھے۔ وہ تیرہ سال تک استاد کی فیض صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں حضرت غفران مکانؒ کے خانساماں محمد ابراہیم خاں حکماً داغ کی بزم میں عموماً آیا کرتے اور انکو رسا کے اشعار بھی سننے کا موقع ملتا۔ ایک دن وہ رسا کو ڈیوڑھی مبارک پر لے گئے اس طرح رسا کو حضرت غفران مکانؒ کی خدمت میں نذر گذراننے کا شرف حاصل ہوا۔ خانساماں نے ان کے اشعار کی خوب تعریف کی اسکے بعد وہ عموماً دربار شاہی میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سے محظوظ کرتے رہے۔ بارہا اتفاق ہوا ہے کہ غفران مکاں نے مصرعہ طرح مرحمت فرمایا اور رسا نے اس پر طبع آزمائی کی۔

لیکن ایک ناگوار واقعہ نے رسا پر بجلی کا کام کیا۔ یہ اپنی وکالت کے زمانہ میں ایک دن کہ وہ وکلا میں تھے شعر و سخن کا ذکر ہو رہا تھا اور استاد داغ کی ایک غزل پڑھی جارہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

یہ پوچھو دل سے نیم بسمل نگاہ یار کیسی ہے　　　کرے جو میاں ہی میں کام وہ تلوار کیسی ہے

رسا نے بھی اسی زمین میں غزل کہی تھی جو اسوقت اپنے احباب میں سنائی گئی منجملہ دیگر اشعار کے ایک شعر جس میں تلوار قافیہ باندھا گیا یہ تھا ؎

نہ مارا تیغ سے تم نے ادا سے کردیا بسمل　　　کوئی تلوار کیسی ہے کوئی تلوار کیسی ہے

وکلا میں ایک اور صاحب کو بھی حضرت داغ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ایک وکیل صاحب نے ان کے چھیڑنے کیلئے رسا کا یہ شعر ان کے سامنے پڑھا اور استاد کے شعر پر ترجیح دی وہ بجد برانگیختہ ہوئے اور استاد سے جاکر شکایت کردی کہ رسا آپ کا شاگرد ہو کر آپ سے اشعار لڑاتا ہے۔ اس طرح استاد بھی ناراض ہوگئے [illegible] رسا ان کے یہاں گئے تو انہوں نے خفگی کا اظہار کیا اور صاف کہدیا کہ " تمہاری اصلاح اب [illegible] پانا ہوگی [illegible] " ہر چند رسا معذرت خواہ ہوئے لیکن داغ مرحوم کے دل سے یہ داغ نہ مٹ سکا بلکہ انہوں نے [illegible] سامنے بھی شکایت کردی۔

رسا نے معذرت چاہتے ہوئے ایک قطعہ بھی لکھا تھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔ قطعہ

جب سے یہ میں نے سنا ہے کہ خفا ہیں حضرت — شاعری ہی سے مجھے ہو گئی ہے کچھ نفرت
اپنے اشعار دکھانے سے رہا اوروں کو — پست اس درجہ طبیعت ہے نہ ایسی عزت
آپ کا شکوہ کرے مجھ سا عقیدت آگیں — منحرف آپ سے ہو مجھ سا قدیم الخدمت
آپ کے شعر پہ دوں شعر کو اپنے ترجیح — ہے تعجب کی یہ جا اور مقام حیرت
اپنے استاد کا بدخواہ جو ہوا سے رسوا — ایسے شاگرد پہ سو بار خدا کی لعنت

اس قطعہ کے پیش ہونے کے بعد صفائی تو ہو گئی لیکن پہلی بات باقی نہ رہی دل کی امنگیں سرد ہو گئیں اور رسا نے شاعری بھی چھوڑ دی محمد ابراہیم خاں ماں نے رائے دی کہ اب ڈیوڑھی مبارک پر حاضر ہونا بیکار ہے لیکن ایک دوست نے ایک عرصہ دراز کے بعد ان کو مہاراجہ سر سین السلطنت بہادر کی خدمت میں پیش کیا اور پھر شاعری شروع ہو گئی لیکن لفظ رسوا کی نحوست سے انھیں نقصان پہنچا تھا اسلئے مہاراجہ بہادر نے رسا تخلص تجویز فرمایا اور یہی اب تک قائم ہے۔

رسا نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک قصیدہ مولوی سید حسین بلگرامی ناظم تعلیمات کی مدح میں کہا تھا جس کا مطلع ہے

نخل امید کے پھل پانے کا آیا سیزن — مژدہ اے دل گئے وہ دن کہ تھا لامن ٹیشن

تمہید کے بعد کہا تھا:—

ہوں میں شاگرد قدیمی سٹی ہائی اسکول — ماسٹر جس کا ہے ای ڈراس سا یوروپین
میں ابھی مدرسہ میں پڑھتا تھا آبی سی ڈی — دل ابھی فضل کہ ہوتا ہے ٹمل میں لیین

قصیدہ کا صلہ یہ ملا کہ فیس معاف ہو گئی اور غالباً کچھ وظیفہ بھی منظور ہوا لیکن جب تک رسا سٹی ہائی اسکول سے اپنی تعلیم ختم کر کے نکل چکے تھے۔ رسا نہایت پر گو شاعر ہیں اور شعر بہت جلد کہتے ہیں زبان میں سلاست ہے اور بیان صاف ستھرا ہوتا ہے اشعار میں سادگی اور روانی ہے چند اشعار ذیل درج ہیں۔—

ہیں یاد وصل کا خواہاں وہ ہجر کے مارے — اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دعا میں

دعوائے محبت ہے تو ہو ان کی بلا سے — وہ چاہیں گے کیوں کونسی خوبی ہے رسا میں
پروانہ صفت اے دل جل سوز محبت میں — جو خاک ہوا اس سے اکسیر نکلتی ہے
دن رات عجب جلوے ہیں شاہد دنیا کے — ہر وقت جواں بنکر یہ پیر نکلتی ہے
لاتی ہے انہیں کھینچے لیے آہ شب وعدہ — زنجیر لئے گویا تاثیر نکلتی ہے
مرنے والے کیا عدم میں دم نہ لینے پائینگے — کیا عدم والے لحاظ میہماں رکھتے نہیں

رسا حتی الامکان پیچیدہ خیال کو بھی سلجھے ہوئے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس خصوص میں کامیاب نظر آتے ہیں اس میں شک نہیں کہ تخیل میں بلند پروازی نہیں لیکن کلام کے پراثر ہونے میں کبھی کلام نہیں ہو سکتا۔ انکا شمار حضرت داغ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے انکی شاعری غزل تک محدود نہیں بلکہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ قصائد، رباعیات، متفرق نظمیں وغیرہ غیر مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں جنکی عنقریب طبع ہونے کی توقع ہے۔ رسا اپنے معاصرین کی طرح حتی الامکان فارسی کے بے محل الفاظ اور متوالی اضافات سے احتیاط کرتے ہیں۔ ہم یہاں انکے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں جس میں ہر قسم کے اشعار کی مثالیں ملینگی اور جسکے مطالعہ سے رسا کی شاعرانہ قوت اور انکے گوناگوں خصوصیات کا اندازہ ہوگا۔

شوخی سے بچا دل تو پھنسا دام حیا میں — سو طرح کے انداز ہیں ظالم کی ادا میں
کس منہ سے کروں میں ستم و جور کا شکوہ — وہ دیکھتے ہیں میری وفاؤں کو جفا میں
میں وصل کا خواہاں وہ مری مرگ کے طالب — اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دعا میں
صحت ہوئی بیمار کو آتے ہی کسی کے — کیا شربت دیدار ملا یا ہے دوا میں
ہوتا نہیں کیوں خشک الٰہی شجر غم — کیا پرورش اس کی ہوئی جنت کی ہوا میں
شعلہ دل پروانہ کا آہوں سے ہوا تیز — یہ شمع جلا کرتی ہے دامان ہوا میں

آنکھوں سے نظر اسکی ایک تیر نکلتی ہے — کیا تیر کی صورت شمشیر نکلتی ہے
پیچیدہ بہت خط ہے پیشانی انساں کا — ہر ایک سے کب ایسی تحریر نکلتی ہے

ناکام محبت کو تدبیر سے کیا حاصل / پہلو سے مرے بگڑی تقدیر نکلتی ہے

ابرو کا تو کیا کہنا ہے تیغ نظر کچھ اور / خنجر سے ترے ظالم شمشیر نکلتی ہے

دشمن کا جو ذکر آیا کیوں آپ بگڑ بیٹھے / کیا آپ کی کچھ اس میں تحقیر نکلتی ہے

افسردہ رسا ہم ہیں اس درجہ شب فرقت / جو آہ نکلتی ہے دلگیر نکلتی ہے

وحشت صیاد و خوف باغباں رکھتے نہیں / ہم وہ بلبل ہیں چمن میں آشیاں رکھتے نہیں

جب سے اس در کے ہوئے ساکن بنے بالانشیں / جس زمیں پر ہم ہیں اُس پر آسماں رکھتے نہیں

ہیں ازل سے ہی اکیلے رہروان کوئے یار / یہ مسافر احتیاج کارواں رکھتے نہیں

کیا کروں میری وفا کا بھی نہیں تم کو یقین / پھر طبیعت وہ کہ تاب امتحاں رکھتے نہیں

بے نشانی ہے نشان بندہ سلطان عشق / نام لیوا تیرے کچھ نام و نشاں رکھتے نہیں

جن کے دل گویا ہیں ان کے لب پہ ہے مہر سکوت / کہتے ہیں سب کچھ مگر منہ میں زباں رکھتے نہیں

ہر طرف سینہ میں ہے اپنے محبت یا وفا / دل میں ہم گنجائش آہ و فغاں رکھتے نہیں

مخلص ہم رنگ بنکر محفل رنداں میں آ / اے رسا اغیار کو شامل یہاں رکھتے نہیں

جلوہ سے پہلے فدائے جلوۂ جاناں نہ تھا / شمع سو پردوں میں تھی میں شمع پر پروانہ تھا

جب حریم ناز میں پہنچا میں خود بیگانہ تھا / مہماں تھا آپ وہ اور آپ صاحب خانہ تھا

ناامیدی سے تباہی خانۂ دل کی ہوئی / ورنہ ارمانوں سے کیا آباد یہ ویرانہ تھا

منحصر ہے کیف پر دل کے سبب دل تنگی / واسطے مجنوں کے اچھا شہر سے ویرانہ تھا

فیصلہ اچھا کیا بادِ فنا نے صبحدم / شمع رونے کو نہ جلنے کے لئے پروانہ تھا

کم نصیبی کا گلہ ساقی سے اے دل ہے عبث / مے تجھے اتنی ملی جتنا ترا پیمانہ تھا

کر دیا مست شراب عشق ملتے ہی نظر / چشم ساقی میں الٰہی کیا کوئی میخانہ تھا

کیوں در دل سے نہیں آتی صدائے بازگشت — یارب آخر کوئی اس گھر میں بھی تھا یا نہ تھا
زندگی و مرگ کا قصہ ہوا کیا مختصر — آفرینش کا تو میرے اک بڑا افسانہ تھا
ولولے عشق و جوانی کے رسا سب مٹ گئے — اب خدا کا گھر ہے وہ دل جو کبھی بتخانہ تھا

وصل ہر چند تمہیں گو مجھے منظور نہیں — گر خدا چاہے تو وہ دن بھی کوئی دور نہیں
اسکو پی جائے یہ ہر ایک کا مقدور نہیں — بادۂ عشق ہے یہ بادۂ انگور نہیں
حوصلہ دعوی الفت کے لیئے لازم ہے — کیوں انا الحق وہ کہے جو کوئی منصور نہیں
بچ کے جاؤ گے کہاں چشم تصور سے مرے — دور آنکھوں سے ہو تم دل سے مگر دور نہیں
ورق دل پہ حسینوں کے نہیں نقش وفا — دفتر عشق میں یہ لفظ ہی مذکور نہیں
بیٹھیے سنیے تو فریاد ہماری بھی ذرا — آپ کیوں ڈرتے ہیں نالے میں مرے صور نہیں
وصل کی کوئی تو تدبیر نکالی ہوتی — میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں
مجھ سے محفل میں تری چپ نہیں بیٹھا جاتا — آہ کرتا ہوں اگر نالہ کا مقدور نہیں
ایک ہم ہیں کہ نہیں دل کے بھی اپنے مختار — ایک تم ہو کہ کسی طرح سے مجبور نہیں
گلہ دوست کرو تم جو رسا حیرت ہے — یہ تو عشاق وفا کیش کا دستور نہیں

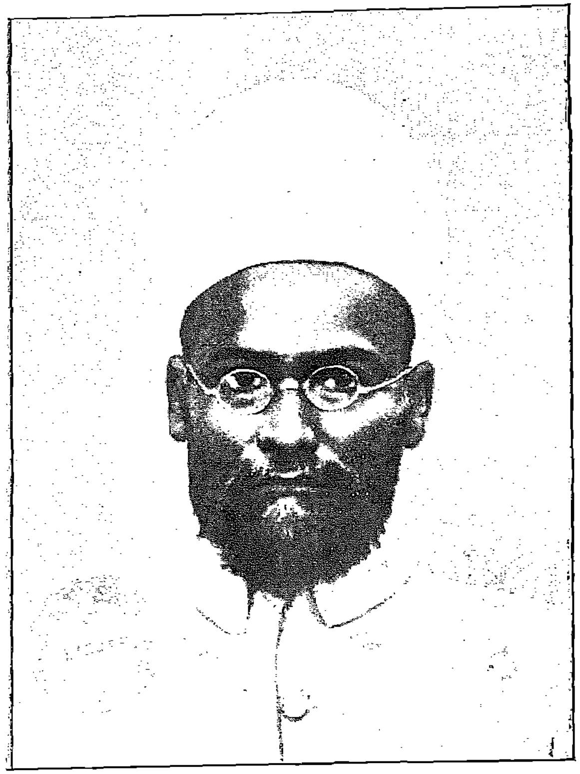
ہر چند حسن پہ انہیں ناز بیجا ضرور تھا — ہم سے غرور شیوۂ الفت سے دور تھا
پابند وضع کیجیے تو دل نا صبور تھا — میں ان کے پیچھے پیچھے مگر دور دور تھا
کیا لطف یوں مرے جو ہم آمرگ بھی — مرتے کسی پہ کاش جو مرنا ضرور تھا
ڈالی بنائے میکدہ [illegible] نہ تھیں — وہ رند کوئی مرشد کامل ضرور تھا
ایسا مٹا کہ نام و نشاں تک نہیں رہا — کیوں اے فلک میں مظہر شان ظہور تھا
کیا جلوہ دیر ہی تھی شب وصل چاندنی — چاند اس طرف ادھر رخ روشن کا نور تھا
دل پر گری ہے برق تجلی ہزار بار — ہوتا جو خاک جل کے وہ دیکھا کوہ طور تھا
شام فراق مرغ سحر کا کسے خیال — میں ہی رات کو غش پر آواز صور تھا
بجلی ہے یا یہ رنگ قلاخن آنکھ میں — دیکھا جو آئینہ شیشۂ دل چور چور تھا
حیراں ہے عقل حال تجلی طور پر — کیا امتزاج کیفیت نار و نور تھا
دل میں تھی جو تاب تحمل تو اے رسا — [illegible] کیا نہ [illegible] تھا



نواب لقمان الدولہ دل



نواب احمد نواز جنگ فانی



قاضی صدیق احمد فہیم



منشی محمد امیر حمزہ حمزہ



عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری



سید مہدی حسین الم



میر محمد مہدی خاں صاحب مہدی



سید اعظم اللہ حسینی صاحب اطہر

پانچواں دور

۱۳۳۰ھ سے ۱۳۵۴ھ تک

یہ درحقیقت دکن کی اردو سرپرستی کا عہدِ زرین ہے۔ اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خود بلند پایہ شاعر اور قدردانِ سخن ہیں۔ ولیعہد والاشان اعظم جاہ بہادر اور شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر شجیع کے علاوہ دوسرے شہزادگانِ والا تبار کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی ہے۔ اور نواب معظم جاہ بہادر شجیع نے تو دیوان بھی مرتب کر لیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ امرائے سلطنت میں مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت شاد، نواب حسام الملک خانخاناں، نواب تہور جنگ، نواب معین الدولہ معین اور نواب لطف الدولہ لطف وغیرہ کو بھی شعر و سخن کا خاص ذوق رہا ہے۔

اس وقت حیدرآباد میں سیکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن اس مرقع میں فی الحال انہیں شعرا کے نام اور تصویریں شریک کی گئی ہیں جو اپنی عمرِ عزیز کے چالیس سال گذار کر سخنۂ مشق ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض اپنی تاریخِ پیدائش کے لحاظ سے یوں تو دورِ گذشتہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہوں نے شاعر کی حیثیت سے اسی دور میں شہرت حاصل کی ہے۔

آئندہ صفحات میں اس دور کے صرف پانچ شاعروں یعنی مسرور، صفیر، امجد، سعید اور قیصری کے حالاتِ زندگی ان کی شاعری پر تبصرہ اور نمونۂ کلام شریک ہے۔ اس موقع کے [illegible]
اس دور کے شعرائے حیدرآباد سے غلام مصطفیٰ [illegible]

قدرت نواز جنگ قدرتؔ، عبدالقدیر حسرتؔ، اعجاز علی شہرتؔ، خواجہ غلام غوث عشقؔ، بدیع اللہ قیسؔ، عبدالوہاب عندلیبؔ، ابوالحسن قیصرؔ، محمد حسین آزادؔ، نرسنگھ راج عالیؔ، ابوالاشرف مجیدؔ، راگھو بیدر راؤ جذبؔ، رگھوناتھ راؤ دردؔ، ریاض الدین ریاضؔ، عبدالرزاق شمیمؔ، عبدالرزاق بسملؔ، عبدالرزاق راشدؔ، زین العابدین عابدؔ، مختزم شاہ امیدؔ، شہید یار جنگ شہیدؔ، غلام شاہد شاہدؔ، اللہ بخش توحیدؔ، اکرام الدین خاں اکرامؔ، عباس علیخاں لمعہؔ، حبیب اللہ وفاؔ، آفتاب علی مہرؔ، نصیر الدین اصغرؔ۔ راجہ راجیشور راؤ اصغرؔ

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے:۔ وحید الدین سلیمؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ، نظیر حسین سخاؔ، سید صادق حسین غبارؔ، نظام شاہ لبیبؔ، ابن الحسن بسملؔ، ناظر الحسن ہوشؔ، شبیر حسن خاں جوشؔ، خلیفہ عبدالحکیم، سید علی شبیر شبیرؔ، کاظم علی باغؔ، نثار یار جنگ مزاجؔ، سید ہاشمیؔ، واجد حسین یگانہؔ، عظمت اللہ خاں عظمتؔ، شوکت علیخاں فانیؔ۔

اس دور کے شمالی ہند کے مشہور شعراء:۔ جعفر علی خاں اثرؔ، اصغر حسین اصغرؔ، علی سکندر جگرؔ، عبدالباری آسیؔ، فضل الحسن حسرتؔ، ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؔ، نارائن پرشاد ورماؔ مہرؔ، رضا علی وحشتؔ، برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، ابوالاثر حفیظؔ، اقبال احمد سہیلؔ، ناطق لکھنوی، دل شاہجہانپوری، ثاقب لکھنوی، بے باک شاہجہانپوری، آزاد لکھنوی، جوش ملسیانی۔

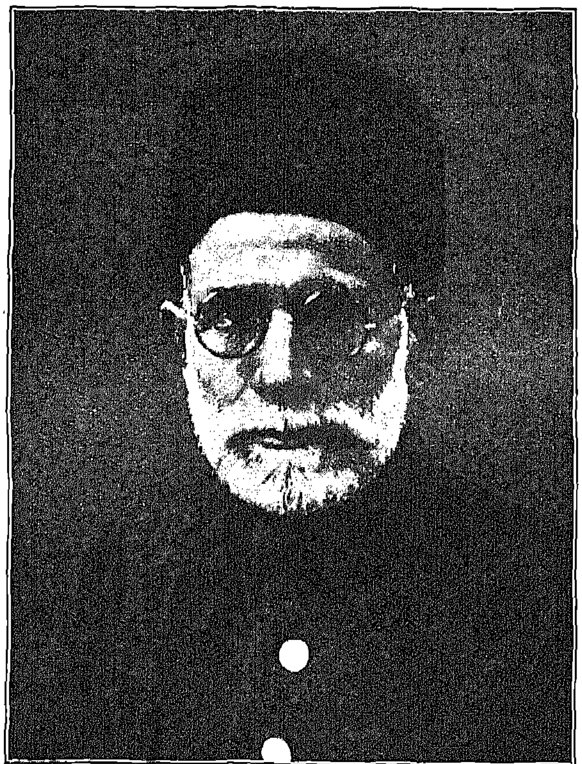
میر محمد علی مسرور

از

میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔ اے (عثمانیہ)

سابق صدر بزم اردو و مدیر مجلہ عثمانیہ

مرقع سخن



میر محمد علی مسرور

میر محمد علی مسرور

میر محمد علی نام۔ مسرور تخلص۔ نجیب الطرفین ہونے کے علاوہ حیدرآباد کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دادیہالی سلسلہ دہلی کے قلب الملک امیر الامراء سے اور ننھیالی وحید الدولہ سے ملتا ہے۔ انکے والد میر جعفر حسین مقبول علاوہ منصب رکاب سعادت سے سرفراز ہونے کے مددگار ناظم دارالانشا کی خدمت پر بھی فائز تھے۔ انہیں علوم مشرقیہ میں تبحر حاصل تھا چنانچہ عربی۔ فارسی اور اردو میں کئی مرثیے اور مثنویاں لکھی تھیں لیکن انقلاب زمانہ نے صرف چند ایک دو نوحے باقی چھوڑے ہیں جنسے انکی استعداد شعری کا پتہ چلتا ہے۔

مسرور بھی منصب سے سرفراز ہیں۔ جوڈیشل کا امتحان دیکر چند روز وکالت کرتے رہے آخر میں نواب بہرام الدولہ کے اسٹیٹ میں منتقی پر مامور ہوئے۔ کچھ عرصہ سے خانہ نشین ہیں۔ طبیعت میں انتہائی انکسار ہے۔ گوشہ نشینی کے دلدادہ ہیں لیکن ہم مشرب احباب کی صحبت میں ہمیشہ شمع محفل بنے رہتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی کو ان کے اکلوتے فرزند کی ناگہانی موت نے ملیامیٹ کر دیا اسوقت سے کچھ تو خرابی صحت اور کچھ افسردہ دلی کی وجہ سے بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔

۲۔ تعلیم اور تلمذ۔ تحصیل علم کا ابتدا سے انہیں شوق رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جس فن کا جو کامل انہیں نظر آیا اس سے اکتساب علم کرنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ چنانچہ آغا سید علی شوستری شاد الملک۔ مولوی حسنو میاں صاحب۔ مولوی سید علی نقی قبلہ مولوی عبدالصمد منطقی کے ایک شاگرد سے عربی۔ فقہ۔ حدیث اور منطق وغیرہ کا درس لیا۔ فارسی میں پہلے تو اپنے والد کی اور بعد میں مولوی [illegible] اور مولوی میر غلام [illegible] کی شاگردی اختیار کی۔ تحصیل علم کا جسے فطری ذوق ہوتا ہے وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا چنانچہ جب انہوں نے سنہ [illegible] میں عراق کا سفر کیا تو اوروں کی طرح صرف زیارت مقامات مقدسہ سے کام نہ رکھا بلکہ کربلائے معلیٰ [illegible] کا درس [illegible] اور آقا سید کاظم طباطبائی سے شرح کبیر کے مشکل مقامات حل کئے۔ اسکے علاوہ حدیث اور تفسیر وغیرہ میں ذاتی مطالعہ سے کامل دستگاہ پیدا کی۔

شاعری میں حضرت اصغر حسین ناجی کے سوا کسی اور کے آگے زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ ذوقِ شاعری چونکہ ورثتاً نہیں ملا تھا اسلئے حضرت ناجی کے متعدد شاگردوں میں مسرور نے اپنی ذاتی جودت سے بہت جلد ایک خاص جگہ پیدا کرلی اور اپنے استاد کے ارشد تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔

۳۔ **خصوصیات کلام** ۔ چودہ سال کی عمر سے انہوں نے مشقِ سخن شروع کی اور سب سے پہلے ایک سلام لکھا اسکو افتادِ طبیعت کہیئے یا حسنِ اتفاق اسی صنفِ کلام کی طرف انکا رجحان رہا۔ اگرچہ غزلیں بھی کہیں اور اتنی کہیں کہ اگر آج وہ سب جمع کیجا سکتیں تو ایک ضخیم دیوان ہوجاتا لیکن جو رنگ سخن اور زورِ طبیعت ان کے مرثیوں میں پایا جاتا ہے وہ غزلوں میں نہیں سلام رباعی نوحوں اور مرثیوں کے علاوہ قصاید میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نوحہ اور سلام اگرچہ مرثیہ کے تحت آجاتے ہیں اور کوئی مستقل صنفِ شاعری نہیں لیکن مرثیہ گو کے لئے ابتدائی مشق کا کام دیتے ہیں۔ مسرور کے نوحے ایک خصوصیت رکھتے ہیں وہ یہ کہ انہوں نے قدیم اردو نوحوں کی بہت کچھ اصلاح کی جس کے وجوہات انہوں نے اپنے مجموعہ نوحہ جات کے دیباچہ میں تفصیلاً بیان کیے ہیں۔ نوحہ کے خصوصیات کیا ہونا چاہیئے اور سلام اور نوحہ میں کیا فرق ہے اسے نہایت واضح طریقہ پر دلائل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کے نوحے کئی سو ہیں اور دو حصوں میں شائع ہوکر حیدرآباد میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ایامِ عزا میں تقریباً ہر عاشور خانہ میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں نمونتاً دو نوحوں کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جس سے انکا اصلاحی رنگ ظاہر ہوگا

دنیا میں یتیموں کو رلایا نہیں کرتے — سہمے ہوئے بچوں کو ڈرایا نہیں کرتے
مہمان کو دیتے ہیں صدا راحت و آرام — پانی کے عوض خون بہایا نہیں کرتے
بازاروں میں بے برقع و بے مقنع و چادر — اک رات کی بیاہی کو پھرایا نہیں کرتے
زنجیر پہناتے نہیں بیمار کو تپ میں — دُرّے تن لاغر پہ لگایا نہیں کرتے
گو لاکھ عداوت ہو مگر نیزے سے پہلو — بے شیر کی گردن پہ لگایا نہیں کرتے

آپ کے باغ پہ جنگل میں ہوا ایسی چلی' یارسول عربی — پھول مرجھا گئے باقی نہ رہی ایک کلی' یارسول عربی
باغیوں نے چمن صاحب دلدل لوٹا' نہ رہا گل بوٹا — موسم گل میں خزاں ہوگیا گلزار علی' یارسول عربی

ایک بیکس کو ہزاروں نے تھا بن میں گھیرا رحم سے منہ پھیرا   زخم پر زخم تھا تلوار پہ تلوار چلی، یا رسول عربی
ننھی بچی یہ ہوئی ایسی جفائے کفار، ہوا جینا دشوار   مر گئی قید میں شبیر کے نازوں کی پلی، یا رسول عربی

مسرور کے رباعیات کے موضوع زیادہ تر اخلاقی اور علمی ہوتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً سو سے زیادہ رباعیاں کہی ہونگی اکثر رباعیوں کا چوتھا مصرعہ ضرب المثل بننے کے قابل ہے۔ مثلاً:۔

انداز دیانت کے نرالے دیکھے   زخم جگر صدق بھی آلے دیکھے
پایا نہ سوا جلوۂ نفسی نفسی   دنیا دیکھی دنیا والے دیکھے

ناحق ہے یہ کہنا کہ قضا آتی ہے   یہ زحمت بے جا اسے کب بھاتی ہے
ہے زیست ہی انساں کیلئے باعث مرگ   یہ بڑھ کے قریں موت کے خود جاتی ہے

مجبور ہیں ہم خالق یکتا جانے   ہم جانیں کہاں جائیں اندھیرا جانے
ہوتے ہیں سر قبر ہمارے شکوے   کیا ہم پہ گذرتی ہے کوئی کیا جانے

امید ہی انسان کو غم انگیز ہوئی   زحمت ہی نتیجتاً دلآویز ہوئی
مرنے پہ وہ دیکھا جو نہ دیکھا تھا یہاں   جب بند ہوئی آنکھ نظر تیز ہوئی

سلاموں کا رنگ ہی ہے جو دراصل ہونا چاہیئے دوسروں کی طرح نہ بالکل نعت و منقبت میں ہیں اور نہ نوحے کی صورت میں بلکہ مدح اور واقعات شہادت دونوں کے حامل ہیں ان کا رنگ طبیعت انکے ہر کلام میں موجود ہے۔ یہاں دو سلاموں کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

جز ولائے حق مرے دل میں کسی کی جا نہیں   کچھ دنوں جس میں رہے ہوں بت یہ وہ کعبہ نہیں
داغ جلتے ہیں جو دل کے منہ سے کیوں نکلیگی آہ   گلشن خورشید سے ہرگز دھواں اٹھتا نہیں
بند ہیں آنکھیں تصور میں مزے ہیں دید کے   چاند زہرا کا نگاہوں سے کبھی ہٹتا نہیں
کیوں مرے سینہ پہ دامن ڈالتے ہو اے کلیم   یہ مرا داغ جگر ہے کچھ ید بیضا نہیں
آبلہ پائی عابد سے بڑھی شان کرم   کربلا سے شام تک پیاسا کوئی کانٹا نہیں
اپنا بس کیا یہ خدا کی دین ہے وہ جس کو دے   کیا کرے مسرور گر لطف زباں پایا نہیں

چاہیئے رونا بھی شہ پہ مدحت حیدر کے ساتھ   لطف ہے گر گلفشانی میں در افشانی بھی ہو
عشق ہو ہاں عشق کیسں کا یوسف زہرا کا عشق   چاک دامانی سے ظاہر پاکدامانی بھی ہو
زیر خنجر کہتے تھے شہ نذر سر تو کر چکا   پردہ پوشِ عاصیاں لاشہ کی عریانی بھی ہو

کہتے تھے شہ کس طرح اکبر ضامر کی دوں — رشک یوسف بھی جو اس بھی احمد ثانی بھی ہو
جان دے تم پر نہ کیوں مسرور اے پیارے حسین — جان زہرا ہو حبیب حق کے تم جانی بھی ہو

قصاید اور مرثیے ان کا خاص عنوان شاعری ہے۔ ہر قصیدے میں وہ چاروں اجزائے ترکیبی موجود ہیں جو ایک اہم جزو سمجھے جاتے ہیں یعنے تشبیب۔ گریز۔ مدح اور دعا مسرور کے قصائد کی تشبیب عموماً عاشقانہ، عالمانہ یا ناصحانہ ہوتی ہے گریز کا خیال خاص طور پر رکھتے ہیں اور تشبیب اس سے علیحدہ نہیں ہونے دیتے۔ ایک خاص بات جو ان کے قصاید میں نمایاں ہے وہ صداقت بیان ہے۔ مدح کرتے وقت عام قصیدہ گویوں کی طرح مبالغہ سے کام نہیں لیتے بلکہ مفروضات کے عوض سچے واقعات نظم کرتے ہیں۔ بعض شعرا آئمہ معصومین کی مدح کرتے ہوئے اعتقاداً غلو کر جانا بھی جائز سمجھتے ہیں لیکن مسرور آل رسول کے انہی اوصاف کو پیش کرتے ہیں جو قرآن اور احادیث معتبرہ سے ثابت ہوں اگر کہیں اتفاقاً کوئی بات خلاف واقعہ نظم بھی ہو جائے تو اسکو اس خوبی سے ادا کر دیتے ہیں کہ اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے دو قصیدوں کے اقتباس ذیل سے اس کا ثبوت ملیگا۔

دکھایا حضرت عباس نے جمال پدر — علی نے پائی ہے آج اپنی تیسری تصویر

چونکہ حضرت عباس حضرت علی کے چوتھے فرزند تھے اسلئے تیسری تصویر کہنا خلاف واقعہ تھا اس اعتراض کو اسطرح رفع کیا ہے

درود پڑھ کے یہ پوچھا کہ رہ گئی اک بات — کچھ اور بھی تو ہیں فرزند شاہ خیبر گیر
ہیں ان میں ایسے بھی جو ان سے پہلے خلق ہوئے — وہ ہونگے تیسرے یا یہ بزرگی و توقیر
کہا کہ یہ تو بہت صاف بات ہے حضرت — کہا ہے تیسرا بیٹا کہ تیسری تصویر
پسر کچھ اور ہے تصویر اور ہی کچھ ہے — بہت لطیف ہے یہ لسان شاعر کی تقریر
کمی زیادتی ہوتی ہے باپ بیٹے میں — نظر میں نقل ہی آتی ہے دیکھ کر تصویر
کہاں علی کی سب اولاد اور کہاں عباس — [illegible]

مدح حضرت عباس :—

ترا وہ حسن جو مقصود خامۂ تقدیر　علی کے بیٹے تو بالکل علی کی ہے تصویر　علی کی جان تو ہے روح قوت تقدیر　ہر اک نفس ہے ترا کن کے راز کی تفسیر

خدا کی آیت محکم ہے تیرا استقلال　صداقتیں تری ہم رنگ صدق رب قدیر　وہ تیرا حسن کہ موسیٰ کو جس سے غش آئے　گواہ ہے مرے دعویٰ پہ شعلۂ تنویر

تری نمود نمود حقیقت اسلام　ترا وجود وجود ارادۂ شبیر

دعا

کٹے جو سر تری الفت میں زندگی پاؤں　ضیائے شمع بڑھے کام جب کرے گلگیر　قدم جبیں پہ جو میری رکھو تو لطف آئے　لکیریں نور کی بن جائیں گی خط تقدیر

شب فراق کی تاریکیاں ہیں پر مسرور　علی کے چاند دکھا دے وہ چاند سی تصویر

تشبیب

عالم انوار ہے تا نیر اسرار بقا　جاں فزا ہے پردۂ ناموس اکبر کی ہوا　جلوۂ انوار کا ہر جا انوکھا رنگ ہے　ہے تحیر زا تماشا گاہ عالم کی فضا

کچھ نہ سمجھے خوب سمجھے۔ خوب سمجھے کچھ نہیں　گر فنا سمجھے بقا، گر بقا سمجھے فنا　گم ضیاؤں سے کہیں انساں کامل کے سوا　اور کہیں کہئے سو تحیر میں تہمت انا

ہے مثل مشہور جتنے آدمی اتنی بات　ہے کہیں فاخلع کہیں ہے حکم نعلین آ　شاہد مقصود نے چہرے سے الٹی نقاب　پیکر انساں بنا۔ آئینہ جلوہ نما

معنی روحی سے خود عیسیٰ مسیحا بن گئے　کام کس نے کر دیا اور نام کس کا ہو گیا　بند آنکھیں ہیں گوش ولید و حیراں خموش　یہ ہے تصویر جگر پریشاں میدان بقا

کن کا اک عالم ہے جو ہو کر رہا پابند قید　ہے وجود ہستی انساں خیالی آئینہ　آمد انساں بھی تھی بیان عجب کچھ راز ہے　کس نے بھیجا کون آیا۔ کون ہے اور کون تھا

کیا کیا دنیا میں آ کر گر نہ سمجھے اپنی بات　کیا تھے ہم کیا ہیں کیا بنتے گئے کیا ہو گیا　ختم ہو آسانیوں سے یہ سفر آساں نہیں　راستے میں فرش کانٹوں کا ہے بچھا جا بجا

گریز

ہے گذر مشکل بہت مشکل مگر آساں ہے　ہاتھ میں محکم ہو گر دامان شرع مصطفیٰ　جائیں گر اسکے سہارے پھر نہ ٹھوکر اور نہ خار　راستہ طے ہو نہیں سکتا کبھی اسکے سوا

پنجتن کر کے حیدر و زہرا کی اک محکم مثال　اپنی امت کو نبی نے راستہ دکھلا دیا　کچھ نہ تھی باہم جدائی دونوں تھے اک ہی　نور تھا وہی نور علی جو نور بنت مصطفیٰ

اس حقیقت سے تو حیدر بھی نامحرم رہے　سب ہوئے محرم جو شرعاً عقد کا صیغہ پڑھا　عقد زہرا کو علی سے مل رہا ہے یہ پتا　حافظان شرع کا قائم ہوا یہ سلسلا

مدح حضرت علی و جناب سیدہ

شان یہ زہرا کی ہے بابا نبی بیٹے امام　نو اماموں کی ہے دادی زوجۂ نفس خدا　عبد ہی معصوم کے حیدر مگر اس شان کے　آپکی مرضی تھی تا نیر احکام قضا

ہے بدیہی بات بے سایہ ہے تو مثل نبی　تو ہے ظل حق نہیں سایہ کو سایہ مطلقاً　فاطمہ وہ ہیں جو ہیں جس کی آرزو　وہ علی جس کا ارادہ شاہد امر خدا

پردہ دار محرمان حیدر تو لائے علی　عاصیوں کی آس زہرا کے جلے دل کی دعا

دعا

جائیں جان آئے لبوں پہ جو میری تیغ بیا　اس نو حیدر ہیں اس ہیں فاطما　ان کے چہرے پر نظر اور نکلے میرا دم　ہاتھ ہو دامن پر ان کا ہوں ملک لقا

میر انیس کے حیدر آباد آنے کے بعد سے دکن کے مرثیہ گویوں نے بھی وہی طرز اختیار کر لی جو لکھنؤ کے مرثیہ گویوں نے

رائج کی تھی یعنے مرثیہ محض واقعات کربلا پر مشتمل نہ رہے بلکہ ان میں چہرہ، سراپا، گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ ساقی نامہ اور جنگ بھی داخل ہوگئے۔ مسرور کے مرثیے بھی اسی شکل کے ہیں انہوں نے تقریباً پچاس سے زیادہ مرثیہ اسی رنگ کے کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی نمایاں خصوصیت ابتدائی بند یعنے مرثیہ کا چہرہ ہوتا ہے۔ مرثیہ کی ابتدا خواہ بہاریہ ہو یا مدحیہ یا اس میں کسی علمی موضوع سے بحث کی جائے مطلع کا بند پڑھتے ہی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مرثیہ کس شہید کے حال میں کہا ہے۔ دوسری خصوصیت ان کے مرثیوں کی وہی ہے جو ان کے قصائد میں نظر آتی ہے یعنے واقعات کی صداقت اکثر مرثیوں میں سامعین کو رلانے کے لئے بے تحقیق واقعات بھی نظم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب تک کسی واقعہ کی صداقت کی اچھی طرح تحقیق نہیں کر لیتے اس وقت تک اسکو نظم نہیں کرتے۔ مرثیہ کا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے اکثر مرثیہ گو کسی ایک شہید کی شہادت کا ذکر بعض وقت ویسے سخت الفاظ میں کر جاتے ہیں کہ سامعین پر ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ مسرور کے کلام کی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ محض اشارہ اور کنایہ میں وہ تصویر نظروں کے آگے آجاتی ہے جس سے سخت سے سخت دل بھی پگھل جائے اور بے اختیار آنسو ٹپک پڑیں۔ مرثیہ میں جہاں دو اشخاص کا مکالمہ نظم کرتے ہیں تو گفتگو کرنے والوں میں حفظ مراتب کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ روایت کے نظم کرنے میں انہیں خاص مہارت ہے۔ ترجمہ بعض وقت اصل ہی نظر آتا ہے تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں تخیل کی بلند پروازی اور مبالغہ ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن اتنا نہیں جو بالکل بے محل اور بے معنی ہو کر رہ جائے۔ بین لکھتے ہیں بھی حقیقت کو حتی الامکان مدنظر رکھتے ہیں اور ان کو موثر بنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں جس کا سراپا لکھتے ہیں اسکے متعلق ممکن الوقوع سے زیادہ امر واقعہ کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی دعا ہمیشہ محبت آل محمد میں ثابت قدم رہنے اور عاقبت بخیر ہونے کی ہوتی ہے۔ دنیوی مراتب کے طالب نہیں۔ خود ستائی ان کے کلام میں کہیں نہیں۔ انکساری ہی ان کے نزدیک سرفرازی کی دلیل ہے۔ البتہ اس پر ضرور ناز کرتے ہیں کہ وہ مداح آل رسول ہیں اور انہیں یقین ہے کہ اس مداحی کا صلہ دنیا میں نہیں عقبیٰ میں انہیں ایک ممتاز حیثیت دیگا۔ اسی اعتقاد نے انہیں سوائے محمدؐ و آل محمدؐ کے کسی اور کی بیجا یا بیجا تعریف سے اپنی زبان آلودہ کرنے نہ دیا۔

۴۔ **زبان اور اسلوب بیان** ۔ مسرور بہت پرگو ہیں اور زبان پر انہیں کامل دسترس ہے۔ انکے مرثیوں اور قصیدوں کی مضامین میں تنوع نظر آتا ہے کہیں سلاست ہے کہیں بلاغت کہیں سادہ پرکاری تو کہیں تکلف کی

جہاں وہ کوئی علمی مضمون یا مسائل شرعیہ نظم کرتے ہیں تو بیان میں بھی علمیت کا رنگ آجاتا ہے اور جہاں سیدھی سادی باتیں ہیں وہاں زبان میں بھی کوئی ثقل نہیں۔ مسرور چونکہ عربی کے عالم ہیں اسلئے ان کے کلام میں فارسی کے بجائے عربی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن انہیں انتخاب الفاظ کا خاص ملکہ ہے جس کی وجہ سے باوجود عربی الفاظ کی بہتات کے طرزِ بیان سے غرابت محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہوتی ہے دقیق سے دقیق علمی مضمون یا مشکل سے مشکل شرعی مسائل کے نظم کرنے میں انکا اسلوب بیان پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اپنا مافی الضمیر اچھی طرح واضح کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ اسلوب بیان میں انتہا کی روانی اور تسلسل ہے۔ آخر تک وہ کہیں اپنے موضوع سے ہٹے ہوئے نہیں نظر آتے۔

اردو مرثیوں میں اسلوب بیان کے اعتبار سے سب سے زیادہ مشکل مقام ' بین ' کا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اکثر مرثیہ گو لغزش کر جاتے ہیں۔ بین کو حقیقی اور موثر بنانے کیلئے خاص خاص محاورے۔ منتخب الفاظ اور جذبات کو ٹھیس لگانے والے طرز بیان کی ضرورت ہے۔ مسرور کے پیش نظر یہ سب چیزیں رہتی ہیں اور ان کے مرثیوں میں بین کا حصہ نہایت اچھا ہوتا ہے۔

ان کی نمایاں خصوصیت یعنے علمیت ان کے ہر کلام میں پائی جاتی ہے۔ قصیدہ۔ رباعی۔ سلام۔ سب کا یہی رنگ ہے۔ نوحے چونکہ ' بین ' ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے ان کی زبان اور اسلوب بیان سادہ اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہرحال وہ اپنے رنگ میں مستقل اور قادر الکلام شاعر ہیں۔

۵۔ انتخاب مراثی ۔حضرت عباس کے حالات میں جو مرثیہ ہے اسکے چہرے کے چند بند یہ ہیں۔

رایت لشکر توصیف ہے خامہ میرا — روکش مہر ہے قرطاس مصفا میرا
رزم کی صف ہے ہر اک مصرع زیبا میرا — فیض مدحت سے ہوا اوج دوبالا میرا
نہیں مسرور جو اس بین قدم رک جائے — ہاتھ کٹواؤں جو چلنے میں قلم رک جائے

مستقل رہتا ہے ہر وقت ارادہ میرا — ہوگا انبوہ سے نقصان بھلا کیا میرا
لشکر حشو سے رکتا نہیں رستا میرا — گھاٹ پر سحر فصاحت کے ہے قبضا میرا

توسن طبع رسا تیز تو بہت آمادہ ہے — فتح ہاتھ آئی ہے جب کمر باندھی ہے

دل کو مرغوب ہے دریائے ثنا کا دامن — لطف ملتا ہے بس دیکھ کے لہروں کا

میں ہوا اسکے لئے میرے لئے دریائے سخن — اسی دریا کی ترائی میں بنیگا مدفن

روح پائیگی مزہ آب رواں بہنے کا — عمر جاوید ہے نام اس میں سدا رہنے کا

میرے قبضہ میں رہا قلزم مواج سخن — میں نے حاصل کیا لڑ بھڑ کے سدا باج سخن

جان دیتا ہوں لئے آبروئے تاج سخن — میرا عہدہ ہے علمداری افواج سخن

راہ پر خوف میں مدح کا فتاح ہوں میں — کیوں نہ ہو حضرت عباس کا مداح ہوں میں

امام حسین علیہ السلام اپنی رجز کے سلسلہ میں دنیا کی بے ثباتی کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں :-

کون سی شئے ہے وہ جس کو ہے بقا یاں حاصل — سوچ لو دل میں تو ہو جاؤ گے تم خود قائل

دیکھو جب رات ہوئی دن ہے عدم میں داخل — دن جو پہنچا تو ہوئی رات فنا پہ مائل

دھوپ نے چھاؤں کو اکدم میں فنا کر ڈالا — چھاؤں باقی نہیں جب دھوپ نے بستر ڈالا

نام بچپن کے فنا ہونے کا رکھا ہے شباب — آئی پیری تو جوانی پہ عدم کا ہے حجاب

ہوشیاری کے نہ رہنے کو کہا کرتے ہیں خواب — حلم مٹ جائے تو انسان کو آتا ہے عتاب

بدر کا نام فنا کر کے ہلال آتا ہے — نقص معدوم ہو جب لفظ کمال آتا ہے

سب پہ ظاہر ہے ہوئی سلطنت کے فانی — دولت و شوکت روم و حلب و رے فانی

سوچے عاقل تو یہ کہدے کہ جہاں ہے فانی — بالیقیں عالم امکاں کی ہر اک شئے فانی

گر ہے باقی تو فقط خالق عادل باقی — یا اسی ذات کا ہے مظہر کامل باقی

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے مرثیہ کا چہرہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

نور خدا تجلی عرفان حسین ہے — قرآن گواہ معنی قرآن حسین ہے

۱ شاہ امم خلیفۂ رحمان حسین ہے — ایمان ہے حسین مری جان حسین ہے

اس کے قدم سے دورِ جہاں کا ثبات ہے — روح امام مرکز روح حیات ہے

مہر وقار علم رسالت حسین ہے — آئینہ دار نور مشیت حسین ہے

خطِ سفید مطلع وحدت حسین ہے — صبح سعید عالم قدرت حسین ہے

اک جوہر لطیف ہے طینت حسین کی — مجموعہ رموز ہے خلقت حسین کی

شبیر کی ہر روح یہ ہے فاطمہ کی روح — جو اس کی روح پاک وہی مرتضیٰ کی روح

روح حسین اصل میں ہے مصطفیٰ کی روح — کلمہ ہے یہ خدا کا ہے اسمِ خدا کی روح

انساں کی روح میں کہاں اختصاص ہے — نسبت جو خاص ملکی جوہر بھی خاص ہے

ہے تیری ابتداء خبر قدرت مبیں — خصلت ہے تیری سیر اولیٰ کے قریں

ہر فعل تیرا فعل الٰہی ہے بالیقیں — فطرت کو تیری حاجت تبدیل ہی نہیں

مفروض حیات کا دخل اک خیال ہے — ادراک عقل دنگ و تیر الکمال ہے[1]

حضرت عباس کی رجز خوانی ملاحظہ ہو:—

تھم کے نعرہ کیا عباس نے ہم آئے ہیں — جن کو آتا نہیں ہٹنا وہ قدم آئے ہیں

ساتھ رنجِ عطش اہل حرم آئے ہیں — لیکے مشک و علم و تیغ بہم آئے ہیں

۲ نہر پہ جائیں گے ہم ٹوک لیں آ کے بڑھ کر — روکنا ہو جنھیں وہ روک لیں آ کے بڑھ کر

پیاس نے بچوں کی ڈالے ہیں جگر پر چھالے — پھوٹ کر روؤ تو شاید یہ شقی ٹالے

جان پیاری ہو تو ہٹ جائیں سنانوں والے — شیر جائیگا سوئے نہر فرس کو ڈالے

فکر اسکی ہے نہ پیاسا کوئی بچہ رہ جائے — راہ روکو تو ابھی خون کا دریا بہ جائے

۱۔ [illegible] کے حاشیے پر سرور نے ان آیات قرآنی اور احادیث کا حوالہ دیا ہے جن سے انہوں نے مضمون اخذ کیا ہے۔

بزدلوں سے کبھی میداں میں غضنفر نہ رکا
پہلوانوں سے کبھی بازوئے سرور نہ رکا

فوج میں گھر کے بن حیدر صفدر نہ رکا
یہ وہ ہے ہاتھ جو صفیں میں چلکر نہ رکا

اب کوئی آن میں باقی سپہ جور نہیں
اسد اللہ کا بیٹا ہوں کوئی اور نہیں

حضرت عباس کی جنگ :۔

جس طرف رخ کیا صفدر نے پراں ہو گئے ہوش
شعلہ خو سارے بھڑک کر ہوئے اکدم خاموش

جو نمودار تھے کٹ کٹ گئے انکے سر دوش
نبضیں چلنے سے رکیں سرد ہوا خون کا جوش

دست و پا ناریوں کے خوف سے تھرانے لگے
بر ذاطراف کے بیمار نظر آنے لگے

گھاٹ روکے ہوئے بیٹھے تھے جو چالیس ہزار
شیر گونجا تو جگر ہل گئے کانپے دل زار

نہر میں کود گئے پھینک کے جنگی ہتیار
غرق دریائے فنا ہونے لگے کج رفتار

کشش نار کے پائے جو اشارے نکلے
نہر میں ڈوب کے دوزخ کے کنارے نکلے

گھوڑے کی تعریف :۔

بوئے گل سمجھیں عنادل کے جو سر پر دوڑے
پھیلنے پائے نہ بو جب گل تر پر دوڑے

آب میں فرق نہ آئے جو گہر پر دوڑے
پتلیاں جھاڑ کے یہ تار نظر پر دوڑے

حرکت نور بصر کی ہو مچلنا اس کا
چشم مردم کو نہ معلوم ہو چلنا اس کا

بیکلیاں چال کی دکھلائے جو گٹکٹ چل کے
گل سمجھ جائیں کہ جھونکے ہیں ہوا کے ہلکے

اشک بھر لائے جو راکب کبھی آنکھیں مل کے
ساغر چشم سے آنسو کا نہ پانی چھلکے

اپنی جا سے نظر راکب مضطر نہ ہٹے
سایہ موئے مژہ بال برابر نہ ہٹے

چلے زمیں پہ تو اونچا سر غبار نہ ہو
چمن میں آئے تو سبزہ کو انتشار نہ ہو

صدا کا نام دم سیر کو ہسار نہ ہو
گلوں پہ دوڑے تو رنگہائے گل پہ بار نہ ہو

زمیں کی طرح چلے گاہ نکہتِ گل پر
کبھی رواں ہو بہ جسم صدائے بلبل پر

تلوار کی تعریف :—

خوش قد بھی خوش لباس بھی اور خوش جمال بھی
آئینہ رو بھی حسن میں ہے بے مثال بھی
گہنا پہن کے پھولوں کا ظالم نہال بھی
معشوق کی ادائیں بھی مستانہ چال بھی
چالاک بھی ہے اور اکہرا بدن بھی ہے
عاشق مزاج کیوں نہ ہو بانکپن بھی ہے

جاں بھی بڑھ کے لیتی ہے جانباز بھی ہے
سرفروشی بھی اصالت بھی سرانداز بھی ہے
مایۂ ناز بھی ہے جال میں انداز بھی ہے
سرنگوں بھی ہے حیاؤں سے سرفراز بھی ہے
جھک کے ملنے میں کرم والوں کی طینت پائی
کھنچے رہنے میں حسینوں کی طبیعت پائی

گردشِ بخت سے دور ہو گئی اٹھی جو سپر
طائرِ تیر پھڑک کر جو چلا کاٹے پر
وہ حسیں ہے کہ نہیں بد نظری کا جسے ڈر
آنکھ ڈالی جو کسی نے تو کٹے تارِ نظر
بے زبانوں سے ہو کیا مدح یہ غم کھاتے ہیں
مردمِ چشم بھی منہ کھول کے رہ جاتے ہیں

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کس طرح نظم کی ہے ملاحظہ ہو:—

غش میں بیٹھے ہے پسرِ شاہ مرسلیں
گھیرے ہوئے ہیں آپ کو چالیس اہل کیں
گذریں جو تین ساعتیں تو چونکے امامِ دیں
چاہا اٹھیں پر اٹھ نہ سکے سرورِ حزیں
آیا جو ضعف بادلِ صد چاک گر پڑے
نانا کو یاد کر کے سرِ خاک گر پڑے

گرنا تھا شاہ کا ہوا اک حشر آشکار
نزدیک آ گیا عمرِ سعدِ نابکار
کھینچی کمر سے تیغ بڑھا شمرِ بد شعار
کیا جانے کیوں نہ پھٹ گیا چرخِ کج مدار
ظالم کے بس میں فاطمہ کا گلعذار ہے
ہوتا ہے ورد سینۂ اقدس فگار ہے

دیتا ہے دکھ یہ دیکھ شہِ والا کو بدگہر
آتا ہے غیظ قولِ پیمبر کے ذکر پر

کافر میاں تنہا کی شقاوت کا ہے اثر ۔۔۔ بسمل یہ ہے وہ آفتِ تازہ کہ الحذر
سہنا پڑا یہ ظلم شہ مشرقین کو ۔۔۔ اب آسماں نظر نہیں آتا حسین کو

صاحبزادوں کی شہادت پر حضرت زینب کے دل خراش بین مسرور کی زبان سے سنئیے :-

تم پہ اماں ہو فدا بچو تو کارو آیا لیں ۔۔۔ بچو برباد ہوئے سب مرے دل کے ارماں
میرے دلدار و تمھیں پائے یہ دلگیر کہاں ۔۔۔ ہائے آخر نہ ملی موت کے پنجے سے اماں
چل بسے گلشنِ فردوس کو پیارے دونوں ۔۔۔ مجھ کو بے آس کیا اور سدھارے دونوں

چرخ نے کو ظلم مجھ پہ یہ کیسا ڈھایا ۔۔۔ ہائے باقی نہ رہا ایک بھی میرا جایا
گود خالی ہوئی قسمت نے یہ دن دکھلایا ۔۔۔ میں نے کو ساتھ تھا کیسے جو مرے آگے آیا
گود پھیلا کے لیا موت نے دلداروں کو ۔۔۔ کھا گئی کس کی نظر ہائے مرے پیاروں کو

بچو یہ کیا کیا اب ہو مری کس طرح گذر ۔۔۔ جیتی میں رہ گئی دنیا سے کیا تم نے سفر
کون اب نزع کے ہنگام مری لیگا خبر ۔۔۔ کون تا گور مرے ساتھ رہے ننگے سر
پوچھ کر بھی تو نہ دیکھینگے زمانے والے ۔۔۔ اٹھ گئے میرے جنازے کے اٹھانے والے

عدم گنجائش کی وجہ سے ہم جس طرح مسرور کے مرثیوں پر لکھنا چاہتے تھے نہ لکھ سکے اس کا ہمیں اعتراف ہے آئندہ کسی اور موقع پر اسکی تلافی کی جائیگی ۔

محمد حبیب الدین صغیر

از

ابو الخیر سید شاہ ابراہیم حسینی صاحب بی اے
صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ و سابق معتمد بزم اردو

مرقع سخن



محمد حبیب الدین صغیر

محمد حبیب الدین صغیر

حیدر آباد کے مشہور محلہ مغلپورہ کو دکن کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ عہد قطب شاہیہ سے آجتک یہ محلہ شرفا و عمائدین شہر کا مسکن و مامن رہا ہے۔ ادبی اس شہر کی اکثر و بیشتر شعر و سخن کی محفلیں سرگرم رہی ہیں۔ اسی ادب پرور ماحول میں آج سے چوپن سال قبل جمعہ کے دن بائیس رجب سنہ ۱۳[illegible]ھ کو محمد حبیب الدین صغیر پیدا ہوئے۔ انکے تخلص صغیر کے اعداد میں سن ولادت بھی موجود ہے۔ وہ تعلقہ قندھار شریف (ضلع ناندیڑ) کے خطیب اور تعلقہ پالم (ضلع پربھنی) کے مفتی ہیں لیکن انکا آبائی وطن قندھار شریف ہی ہے۔

قندھار کو اگر سرزمین دکن کا مردم خیز خطہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ صدیوں سے باکمال شعرا، علما و محققین اور اولیاء اللہ کا مرجع و مرکز رہا ہے۔ مولانا شاہ رفیع الدین، حضرت امین الدین کثرت، شاہ برہان الدین برہان، معین الدین معین، محمد سالار غیور، قاضی محمد شجاع الدین، سید شاہ بدیع الدین رفاعی، صاحب عالم سید شاہ عنایت اللہ حسینی، منشی شمس الدین محمد امیر حمزہ اور مولوی محمد انوار اللہ خاں فضیلت جنگ جیسی صاحب علم و فضل اور شعر و سخن کا صحیح ذوق رکھنے والی شخصیتیں اسی شہرۂ آفاق اور مردم خیز شہر میں پیدا ہوئیں۔

حضرت صغیر کے جد اعلیٰ تین سو سال قبل دکن آئے تھے اور اسوقت سے ان کے آباء و اجداد مذہبی خدمات جلیلہ سے سرفراز رہے ہیں۔ انکا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرزند اکبر حضرت عبداللہ سے ملتا ہے۔ انکے والد محمد فیاض الدین محمد معین الدین معین کے بیٹے تھے جو عالم و فاضل ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ حیدر آباد کے اکثر امرا ان کے شاگرد تھے۔ چنانچہ نواب منہور الملک (سابق معتمد صرف خاص مبارک) اور حضرت ساجدہ بیگم صاحبہ (صاحبزادی حضرت سکندر جاہ آصفجاہ ثالث) کے صاحبزادہ نے بھی انہی سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔

صغیر کے جد اعلیٰ محمد تاج الدین قاضی و خطیب قندھار کو سلطنت دہلی سے "قاضی القضاۃ لشکر فیروزی" کا خطاب ملا تھا۔

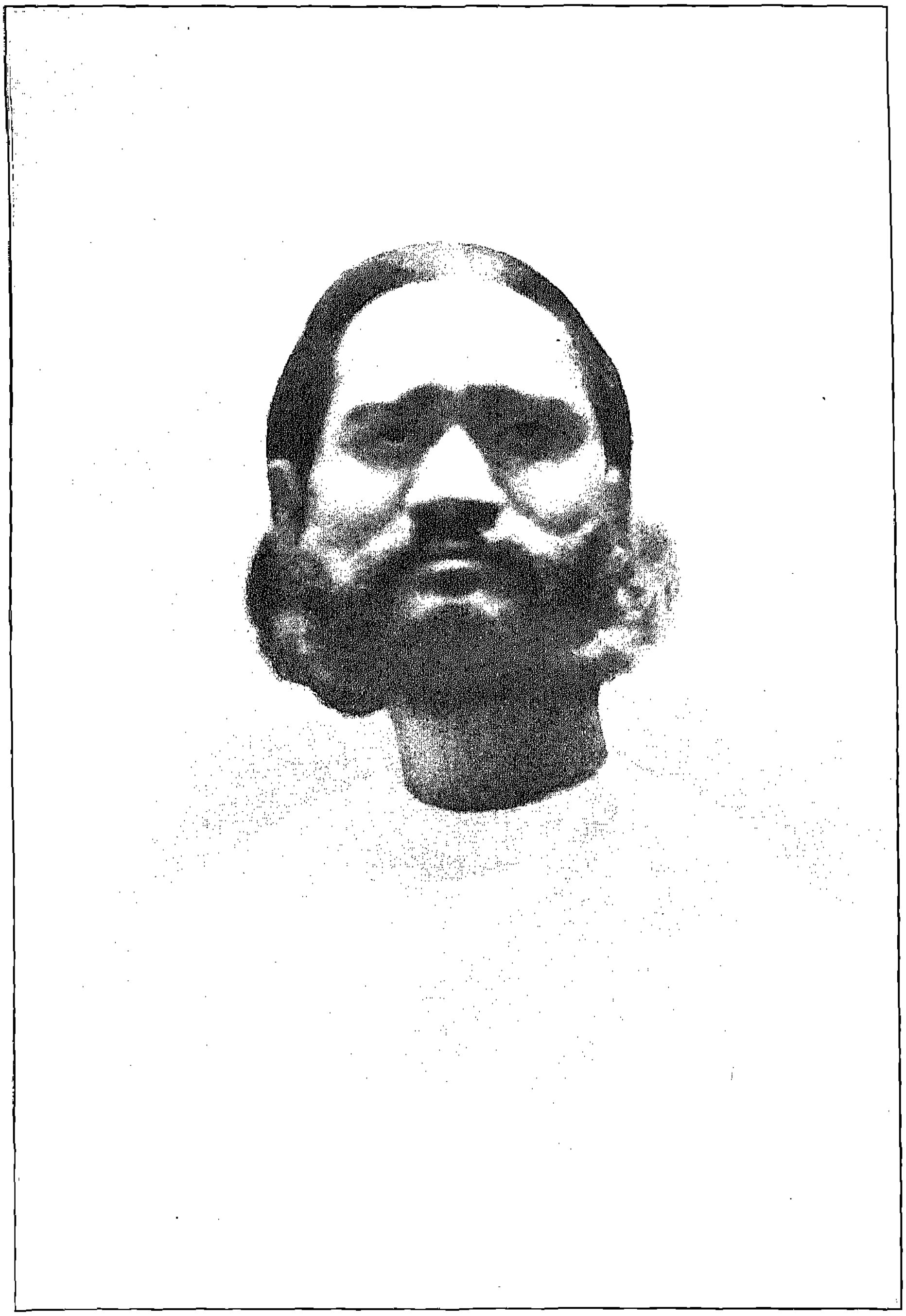
انکا سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات "تاریخ قندھار دکن" (مولفہ منشی محمد امیر حمزہ محتسب قندھار) اور "انوار القندھار" (مولفہ شاہ رفیع الدین) میں تفصیل سے درج ہیں۔ قندھار شریف کے مشہور و معروف صاحب فیض بزرگ مولانا شاہ رفیع الدین (جو خاندان نواب محمد فخر الدین خان شمس الامراء اور مولانا حافظ شاہ شجاع الدین کے مرشد تھے) صغیر کے ہم جد ہوتے ہیں۔ چنانچہ انکا سلسلۂ خاندان مولانا شاہ رفیع الدین اور مولوی حافظ انوار اللہ خاں فضیلت جنگ سے اس طرح ملتا ہے:۔

- محمد تاج الدین (قاضی القضاۃ لشکر فیروزی)
  - محمد شمس الدین
    - مولانا شاہ رفیع الدین
  - محمد سراج الدین
    - محمد جلال الدین
      - محمد معین الدین
        - حافظ محمد قطب الدین
        - محمد فیاض الدین
          - مولوی محمد حبیب الدین صغیر
    - محمد برہان الدین
      - محمد بدر الدین
        - محمد سراج الدین
          - محمد شجاع الدین
            - مولوی محمد انوار اللہ فضیلت جنگ

حضرت صغیر نے مدرسۂ دینیہ (واقع مغلپورہ) میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انکے اساتذہ میں مولوی محمد احمد اللہ، مولوی محمد علی، مولوی غلام محمد پنجابی، مولوی محمد حسین شاہ نوری اور مولوی الٰہی بخش قابل ذکر ہیں۔

جبکہ انکے تایا حافظ محمد قطب الدین خطیب قندھار نے ۱۳۲۲ھ میں لاولد انتقال کیا تو چونکہ صغیر ہی خاندان میں اولاد اکبر تھے اسلئے انہی کو خطابت ملی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان کے چچا اور خسر محمد رحیم الدین مفتی بالم (جنکے اولاد ذکور نہیں تھی) فوت ہوئے تو حضرت صغیر ہی فرمان خسروی کے بموجب بالم کے مفتی بھی ہو گئے۔

انکو بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق ہے اور کیا تعجب ہے کہ یہ انہیں اپنے مشہور و معروف دادا سے ورثہ میں ملا ہو۔



صوفی شمس الدین میکش

الحق

انہوں نے دس سال کی عمر ہی میں حضرت صوفی شمس الحق سجاد علی مسکین تھانوی سے تلمذ حاصل کیا۔ اور آخر تک شفیق و مہربان استاد کی خاص توجہ سے بہرہ مند رہے۔ ابتدا میں حضرت مسکین بعض اوقات ان کی پوری کی پوری غزل کاٹ دیتے اور ہدایت کرتے کہ طبیعت پر زور ڈال کر اچھے سے اچھے شعر لکھا کرو۔ استاد کو اپنے عزیز شاگرد کی اصلاح زبان کا اس قدر خیال تھا کہ ہر غلطی پر جرمانہ مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح صغیر اپنے استاد کی خاص توجہ اور نگرانی سے پوری طرح مستفید ہو سکے۔ اسی طویل سلسلہ تلمذ اور ہمیشہ ساتھ میں رہنے کی وجہ سے انہوں نے حضرت مسکین سے بیعت بھی کر لی تھی کیونکہ وہ ایک اعلیٰ پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک صاحب دل اور باخدا فقیر بھی تھے اور ان کے باطنی کیفیات سے اس عرصہ میں صغیر اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

مسکین کی نظر عنایت اور توجہ خاص کی بنا پر ان کے استاد اور مرشد حضرت میر امداد علی علوی کی صحبتوں میں بھی حضرت صغیر کو اکثر رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت علوی کے مشاعروں میں بھی بارہا شرکت کی اور اپنا کلام سنایا تھا جس کو سن کر حضرت علوی اپنے شاگرد و جانشین یعنے حضرت مسکین سے کہا کرتے کہ "مسکین یہ تیرا شاگرد میرا شاگرد ہے"۔

میر امداد علی علوی دہلی کے قریب تھانہ بھون کے رہنے والے تھے لیکن حیدرآباد آکر یہیں کے ایک صاحب دل اور روشن ضمیر حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قدس سرہ کے اوصاف باطنی سے اتنے متاثر ہوئے کہ بالآخر ان کے معتقد و مرید ہو گئے اور وطن کو بھول کر حیدرآباد ہی کے ہو رہے اور مرشد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔

بعد کو جب علوی اور مسکین دونوں کا انتقال ہو گیا تو صغیر نے حضرت احمد کلیم اللہ خلیفہ حضرت سردار بیگ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ یہ بزرگ حضرت علوی کے پیر بھائی اور بڑے صاحب باطن تھے چنانچہ حضرت صغیر نے ان سے بھی بہت کچھ فیض باطن حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تصوف و عرفان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ان صاحب دل اور روشن ضمیر بزرگوں کے فیضان صحبت کے علاوہ صغیر کو متعدد صاحبان ذوق اور اساتذہ سخن مثلاً عصر حیدرآبادی، داغ دہلوی، حبیب کنتوری، ظہیر دہلوی اور یاس حیدرآبادی وغیرہ سے بھی میل جول کا موقع ملا ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے حیدرآباد میں شاید ہی کوئی بڑا مشاعرہ ہوا ہو جس میں صغیر شریک نہ رہے ہوں۔ آجکل بھی وہ مہاراجہ یمین السلطنت کے خاص مشاعروں میں برابر مدعو ہوتے ہیں اور اکثر شریک ہو کر اپنے خاص طرز سخن کی خوب داد حاصل کرتے ہیں۔

حضرت علوی (متوفی ۱۳۱۹ھ) اور حضرت مسکین (متوفی ۱۳۲۲ھ) کی صحبت کا اثر حضرت صغیر کی طبیعت پر اس قدر گہرا پڑا ہے کہ انہوں نے صوفیانہ اور عارفانہ رنگ کے سوا دوسری طرز میں لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ یہ امر ان کے اساتذہ کی خاص خوشنودی کا باعث ہوا۔ اور انہی کی ہمت افزائی اور توجہ تھی کہ آجتک وہ اپنی طرز پر قائم ہیں اور غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی اسکو نباہ رہے ہیں۔ حضرت مسکین کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک صغیر نے اپنے بے تکلف دوست اور استاد بھائی حضرت کیفی سے بھی اپنے کلام میں مشورہ لیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کیفی بھی اس زمانہ میں صوفیانہ اور عارفانہ رنگ کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

غرض ابتداء ہی سے حضرت صغیر نے ایسے ماحول میں نشو و نما حاصل کی جو مجاز سے زیادہ عشق حقیقی کی طرف رہنمائی کرنے والا تھا۔ ماحول کے علاوہ خاندانی اثر اور پیشۂ خطابت کے فرائض وغیرہ بھی اس رنگ کے استحکام میں ممد و معاون ہوئے۔ لیکن ان امور کی بنا پر وہ ایک نرے مذہبی شاعر ہی بن کر نہیں رہ گئے اور نہ ان کی شاعری منقبت نگاری، نعت گوئی یا مرثیہ نویسی میں محدود ہو گئی۔ اگر ان کی فطرت میں شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق ودیعت نہ ہوتا تو کوئی تعجب نہیں کہ مولویت اور دینداری ان کے قلم سے خشک اور زیادہ تر پیچیدہ اشعار ہی نکلواتی۔ اسکے برخلاف ان کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبیت اور وحدۃ الوجود پرستی کے جوش میں شعریت کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تصوف کے پیچیدہ مسائل اور محیر العقول گتھیاں ان کے کلام کو گنجلک نہیں بنا دیتیں۔ ان کا ہر شعر سلاست کا نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ انکی شاعری جہاں خاص خاص صاحب دل اصحاب کو لطف اندوز کر سکتی ہے اتنی عام فہم بھی ہوتی ہے کہ ہر شخص پر اسکے مطالعہ سے ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت صغیر کے طبعی انکسار اور فطری سعادت مندی و شرافت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی کہا کرتے ہیں ——— "مجھے شعر کہنا علوی اور مسکین ہی کی غلامی کی وجہ سے حاصل ہوا" ان کی تمام غزلوں کے مقطعے بھی اسی جذبہ استاد پرستی کے بہترین مظہر ہیں۔ وہ کبھی ان دونوں کی یاد اپنے دل سے بھلانا نہیں چاہتے۔ ان کے ہر مقطعہ میں ان دونوں کا نام موجود ہوتا ہے خواہ بحر چھوٹی ہو یا بڑی مگر دونوں نام ضرور آئیں گے معلوم ہوتا ہے کہ اس التزام کو انہوں نے اپنے لئے ایک مقدس فرض خیال کر لیا ہے وہ اپنی ہر غزل کو ان کا روحانی فیض تصور کرتے ہیں اور جب کبھی فکر سخن کرتے ہیں تو ان دونوں کا نقشہ ان کی آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری غزل مطلع سے لیکر مقطع تک ایک ہی رنگ میں ہوتی ہے۔ اور بالعموم

ہر شعر دوسرے شعر سے مربوط معلوم ہوتا ہے۔ انکے دو تین مقطع بطور نمونہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں:—

صفیر اشعار میں تیرے عجب کچھ لطف آتا ہے
یہ ہے احسان علوی کا اثر میکش کی صحبت کا

مے صورت پرستی علوی و میکش نے دی ایسی
صفیر اب ہر گھڑی میری نظر رہتی ہے صورت پر

علوی و میکش کا تصور صفیر
راہبر راہِ خدا ہو گیا

حضرت علوی و میکش کا تو میں ذکر کروں
یہ غلط ہے کہ صفیر ان کو مری یاد نہیں

صفیر کے دیوان میں ہر ایک صنف سخن کے نمونے موجود ہیں لیکن ہر صنف میں تصوف ہی کا رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے اس رنگ میں اتنی قادرالکلامی حاصل کرلی ہے کہ قصیدہ ہو یا غزل، رباعی ہو یا قطعہ، یا سہرا ہو یا تاریخ سب میں تصوف ہی تصوف ہوتا ہے۔ ان کے دیوان میں ایک ہزار سے زیادہ غزلیں مندرج ہیں۔ تقریباً تیس قصیدے، اور چند نظمیں بھی ہیں۔ تاریخی قطعات تو بے شمار ہیں۔ انہیں تاریخ گوئی میں کمال حاصل ہے۔ اعلیحضرت آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی ایک سالگرہ کی تقریب میں انہوں نے دو سو شعر کا ایک طویل قصیدہ لکھا تھا جس میں اعلیحضرت کی مذہبی خدمات کے تذکرہ میں ان تمام فرامین کو نہایت خوبی سے نظم کیا ہے جو مذہب سے متعلق نافذ ہوئے تھے۔ اس قصیدہ کا ہر شعر سلیس، سادہ اور نصیحت آمیز ہے۔

کلام صفیر کا مجموعہ افسوس ہے کہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ وہ نمایش اور شہرت سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری ان کا پیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ گنجینۂ معانی طبع ہو کر منظر عام پر آجائے تو اہل ملک کو معلوم ہوگا کہ ہمارے شاعر تصوف و عرفان کے مضامین پر بھی کس درجہ کامیاب اور بلند مرتبہ شعر کہہ سکتے ہیں۔

شعر گوئی کے علاوہ صفیر نے حیدرآباد کے ذوق سخن میں اس طرح سے بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ ہر سال حضرت علوی کی یاد میں ایک شاندار مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کا آغاز حضرت میکش ہی کی زندگی میں ہو چکا تھا۔ اسکے لیے محلہ مغلپورہ میں ساجدہ بیگم صاحبہ کی مسجد میں نہایت وسیع پیمانہ پر انتظامات عمل میں آتے۔ حضرت فیض کے مشاعروں کے بعد حیدرآباد میں اس پایہ کے اور کوئی مشاعرے نہیں تھے۔ ملک و بیرون ملک کے جملہ نامور شعرا اس میں حصہ لیتے اور ہر سال ایک عجیب چہل پہل رہتی۔ مشاعرہ کی یاد تازہ رکھنے کیلئے حضرت صفیر جملہ غزلوں کے انتخابات ایک گلدستہ "بزم رنداں" میں شائع کرتے۔ اس

گلدستہ کو وہ کئی سال تک خاص اہتمام اور محنت و توجہ سے مرتب کرتے اور چھپواتے رہے۔ "گلدستۂ فیض" کی طرح (جو پہلے مشرف جنگ فیاض اور بعد کو نواب عزیز یار جنگ عزیز کی ادارت میں نکلتا تھا) "بزم زنداں" بھی حیدرآباد کے گذشتہ دور شعر و سخن کا ایک مفید اور دلچسپ مظہر ہے اسکے مطالعہ سے اس زمانہ کے شعرائے حیدرآباد کے رنگ اور انکی نسبت معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس نے بھی یہاں کی ادبی فضا کی نشو و نما میں حصّہ لیا ہے۔ اسکی ترتیب و تہذیب میں صغیر اس سلیقہ اور خوش اسلوبی کو ملحوظ رکھتے تھے کہ وہ بہت جلد مقبول ہو جاتا تھا۔

غرض صغیر نے اپنی حدتک حیدرآباد میں اُردو شعر و سخن کے فروغ اور اس میں سنجیدہ عنصر کو برقرار رکھنے میں کافی حصّہ لیا ہے اور اپنے ہمعصروں میں خاص عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ان کے فرزند کی شادی میں حیدرآباد کے اکثر شعرائے باکمال کے علاوہ مہاراجہ سر یمین السلطنت کشن پرشاد بہادر صدر اعظم سرکار عالی بھی تشریف فرما ہوئے تھے اور محفل عقد ایک دلچسپ بزم مشاعرہ بن گئی تھی۔

حضرت صغیر کا کلام عشق حقیقی کے تدریجی منازل کا سچا آئینہ دار ہے۔ سب سے پہلے وہ عشق و محبت کی ضرورت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ انسان کا احساس نا قابلیت ہی اسکو قابل بنا سکتا ہے۔ اور عشق کامل حیاتِ ابدی کا باعث ہے۔ انکی نظر میں عشق کا کمال عاشق کے مساعی سے زیادہ محبوب کی نظر کرم پر بھی منحصر ہے۔ ان کے شعر ہیں :—

جو بگڑتے ہیں وہ بنتے ہیں یہی ہے قاعدہ
لے مری نا قابلیت تو مجھے قابل بنا

عشق کامل ہے حقیقت میں حیاتِ ابدی
اے اجل زندۂ جاوید ہے شیدا اُس کا

ہے تصور کا لطف فرقت میں
وصل ہو جائے تو مزہ کیا ہے

جبیں اپنی جو آئینہ بنی ہے
یہ خوبی اسکے سنگ آستاں کی

پھر وہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ انسان کسی کو چاہنے اور کسی کی ذات میں محو ہو جانے ہی کیلئے پیدا کیا گیا ہے اسکی فطرت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ حسن ازل کے فراق میں نالاں رہے اور قرب حقیقی کے لئے مضطرب ہے

اسکی صورت دیکھنے کے واسطے آنکھیں بنیں
اور اسی سے دل لگانے کے لئے یہ دل بنا

محبت کا ازل سے در حقیقت ہوں میں پروردہ
مری فطرت محبت ہے میں بندہ ہوں محبت کا

قفس ہی میں مری آنکھیں کھلی ہیں — نہ دیکھی میں نے صورت آشیاں کی
مری معدومیت بھی میری ہستی میں ہے پوشیدہ — مری گمنامیاں بھی تو نہاں ہیں میری شہرت میں
سارے عالم سے جدا تھی میری طرز مئےکشی — تھی محبت اس کی صہبا' دل مرا پیمانہ تھا
بندہ پرور مجھ سے کیوں چھپتے ہو کیا واقف نہیں — میں بھی رہتا تھا وہیں رہتے تھے جس منزل میں آپ

اس احساس محبت اور ذوق آگاہی کے بعد جب محبوب کا تصور انتہائی درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو دیکھنے والے کو ہر چیز میں محبوب ہی نظر آتا ہے۔ نہ صرف کائنات کی ہر شئے میں اسکا جلوہ معلوم ہوتا ہے بلکہ اسکی ذات میں عاشق اتنا محو ہوجاتا ہے کہ من و تو کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ حضرت صفیر کے شعر ہیں:—

دل شفاف آئینہ ہوا جب تیری الفت کا — نظر آیا مری صورت میں جلوہ تیری صورت کا
ہمکو کثرت میں نظر آتی ہے شان وحدت — خلوت آرا ہی بنا انجمن آرا اپنا
کس طرح ہم آپ کو خلوت گزیں سمجھیں بھلا — بے حجابانہ نظر آتے ہیں ہر محفل میں آپ
میری نظروں میں ہے تصویر خیالی اسکی — اور آئینہ دل میں بھی ہے نقشہ اسکا
مری صورت پرستی درحقیقت حق پرستی ہے — نظر آتا ہے ہر صورت میں نقشہ تیری صورت کا
تیرے سوا کچھ نظر آتا نہیں — تو مری آنکھوں کی ضیا ہو گیا
ہے ہر اک شکل میں ظاہر رخ زیبا اسکا — ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے جلوہ اس کا
کعبہ و بتخانہ میں جلوہ تمہارا دیکھ کر — کوئی کافر ہو گیا کوئی مسلماں ہو گیا

اس درجہ پر پہنچنے کے بعد چاہنے والے کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے اس ذرا سے دل کی وسعت اور فضیلت پر نازاں ہوجاتا ہے۔ وہ کہنے لگتا ہے کہ ؎

سب سے اول میرے ہی دل کی بنا ڈالی گئی — دونوں عالم کا خلاصہ ایک میرا دل بنا
جلوہ کون و مکاں ہے مری آنکھوں میں نہاں — دونوں عالم کی ہے پوشیدہ حقیقت دل میں

نہ سمجھو خاک کا پتلا مجھے میں اور ہی کچھ ہوں　　حقیقت میں میں اک آئینہ ہوں اسکی حقیقت کا

کون تیرا والہ و شیدا نزا دیوانہ تھا　　کون تیری شمع بزم حسن کا پروانہ تھا

لیکن اس خودداری و خود پرستی کے باوجود وہ یہ نہیں بھولتا کہ یہ ساری کرامت خود حسن حقیقی ہی کی ہے۔ اُس کا شوقِ خودنمائی دراصل ساری کائنات کی تخلیق کا باعث ہے جو شطرنج کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

تیری شہرت تیرے شوق خودنمائی سے ہوئی　　تیرے لفظ کن میں تیرا ہی نہاں افسانہ تھا

ترا خود حسن ہی ہے طالب دیدار کا طالب　　ترے شوق خود آرائی سے ہے سارا جہاں پیدا

یہ کیسا بے خودی میں خودنمائی کا خیال آیا　　یہ کیسی بزم آرائی کی سوجھی تجھ کو خلوت میں

اسی سلسلہ میں چند غزلوں کے منتخب اشعار بھی یہاں نقل کر دئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت صغیر نے اپنی شاعری کو کیسے بلند پایہ خیالات اور پاکیزہ احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ایسا ہی کلام ثابت کرتا ہے کہ اردو شاعری محض مصنوعی عشق عاشقی اور فرضی خیالات کی آئینہ دار نہیں ہے:—

کھل گئی اسکے مظالم کی حقیقت مجھ پر　　وہ ستم پیشہ نہیں وہ ستم ایجاد نہیں

بند ہے جنکی زباں انکی بھی وہ سنتا ہے　　یاد کرنے کا طریقہ ہی نہیں یاد نہیں

—

ہے غبار کوئے ہستی روئے پر تنویر پر　　ہے حجاب جسم خاکی نور کی تصویر پہ

دیکھتے ہیں مجھکو اسکے دیکھنے والے ضرور　　پہلے پڑتی ہے نظر آئینہ تصویر پہ

دید ہی میں نقص ہے یا وہ نظر آتی نہیں　　میری آنکھوں پر ہے پردہ یا تری تصویر پر

محو حیرت کر دیا مجھکو شبیہ یار نے　　بن گیا تصویر پڑتے ہی نظر تصویر پر

—

خود بخود کنج عدم کا بھید ہستی میں کھلا　　ہم وہاں کیا سمجھے ہوئے واقف یہاں آنے کے بعد

کون موسیٰ کے سوا تھا اور کوہ طور پر　　ہوش گم ہونے سے پہلے ہوش میں آنے کے بعد

دم کا عاشق ہو نواے دل تن پرستی چھوڑ دے　　تن میں کچھ رہنا نہیں ہے دم نکل جانے کے بعد

دل لگائے نہ کسی چیز سے انساں اپنا — بعد مرنے کے نہ گھر اپنا نہ ساماں اپنا
گھر سے بے فکر ہوئے خانہ بدوشی سے چھٹے — ہوگیا جب سے ٹھکانہ درِ جاناں اپنا
ہم خیال اپنا بنانے کے لئے یوسف کو — کرلیا چاک زلیخا نے گریباں اپنا

جہاں میں کوئی کسی شان میں بہر صورت — ترا نظیر نہیں ہے، مرا جواب نہیں
ہمارا عکس بھی رہتا ہے آئینہ میں نہاں — ہماری شکل بھی خود ہم سے بے حجاب نہیں
نظر ملا کے کہا مجھ سے میرے ساقی نے — حرام کہتے ہیں جس کو یہ وہ شراب نہیں

میری تنہائی میں پوشیدہ ہیں ہم آرائیاں — انجمن کا لطف دیتی ہے مری خلوت مجھے
یار کی صورت مجھے کس طرح آئیگی نظر — ہائے میری ہی نظر آتی نہیں صورت مجھے
تم کو اے موسیٰ سوال غیرت بے عشق کیا — کاش یہ کہتے کہ دکھلادے مری صورت مجھے

ہے تصور کا لطف فرقت میں — وصل ہو جائے تو مزہ کیا ہے
تیری شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ — دیکھنا کیا ہے ڈھونڈتا کیا ہے
تو اگر ہے نہاں تو پھر یہ عیاں — ذرہ ذرہ سے اے خدا کیا ہے

صفیر کا اصلی اور فطری رنگ پیش کرنے کے بعد ان کے ابتدائی دیوان میں سے بھی چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ ان کے عنفوان شباب کا کلام ہے۔ اپنے ماحول کے تقاضہ اور عام رجحان کی بنا پر انہوں نے اسی قسم کے کلام سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا مگر جیسا کہ بیان کیا گیا ان کے اساتذہ مسکین اور علوی کے باطنی فیضان نے انہیں بہت جلد تصوف وعرفان کی طرف پلٹا دیا۔ حضرت صفیر اپنے ابتدائی دیوان کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ یہ اشعار بھی بار بار کے تقاضہ اور خاص کوشش سے حاصل کئے گئے ہیں۔ انکے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ صفیر نے پچیس سال کی عمر تک کس طرز کی شاعری کی:—

تقدیر کا مٹے گا نہ ہرگز لکھا ہوا — رکتا نہیں ہے تیر کماں سے چلا ہوا
زاہد نے خوب لطف اڑایا شباب میں — آئے جو دن قریب تو اب پارسا ہوا

کون ایسا ہے جو آپ کا کلمہ نہیں پڑھتا — کون ایسا ہے جو آپ پہ شیدا نہیں ہوتا

بیگانہ کا کیا ذکر وہ بیگانہ ہی ٹھہرا | افسوس یگانہ بھی تو اپنا نہیں ہوتا

مرا رونا ہنسی ہوئی اُن کی | حال فرقت مرا فسانہ ہوا | آمد و رفت ہے عدم کی عجب | اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

وہ یہ کہتے ہیں ہمیں دیکھیں تو یہ آنکھیں کور ہوں | دل یہ کہتا ہے کہ مجھکو شوق ہے دیدار کا

بے سروساماں پس دیوار مجھکو دیکھ کر | میرا ہمسایہ بنا سایہ تری دیوار کا

عشق کر کے چھوڑ دیں کچھ دل لگی ہی کھیل ہے | دیکھیے دل پھیر پھیر لیں سودا ہے کیا بازار کا

ہیں گدا لیکن دماغ اپنا ہے شاہانہ صغیر | جھونپڑے میں دیکھتے ہیں ٹھاٹ ہم دربار کا

ہے زباں پر ہر کس و ناکس کی افسانہ مرا | میری باتیں سنکے ہے ہر شخص دیوانہ مرا

سخت جانی پر مری کہتے ہیں خنجر پھینک کر | خاک میں ڈالو اسے شل ہو گیا شانہ مرا

شمع کہتی ہے کہ شب بھر اسلئے روتی ہوں میں | آگ میں جلتا ہے میری' ہائے پروانہ مرا

وہ یہ کہتے ہیں ہمیں کچھ ملگیا | میں یہ کہتا ہوں کہ میرا دل گیا | راہ میں ہم سر ٹپکتے رہ گئے | قافلہ سب بر سر منزل گیا

ہو گیا جل جل کے ٹھنڈا داغ دل | وہ چراغ رونق محفل گیا | سخت جانی کا برا ہو اے صغیر | چھوڑ کر بسمل مجھے قاتل گیا

اپنے وعدہ کیا جو آنے کا | یہ بھی اک ڈھنگ ہے ستانے کا | کیسی کایا پلٹ ہوئی یارب | رنگ وہ اب نہیں زمانے کا

شکر ہے اب ہم بھی بام یار تک جانے لگے | خود تصور یار کا ہی نردباں ہونے لگا

اس سمجھ سے اپنی بے سمجھی ہی اچھی تھی صغیر | ہر گھڑی اندیشۂ سود و زیاں ہونے لگا

ہو جائیگا جب ذکر ترا ورد زباں اور | کھل جائے گا عالم میں مرا راز نہاں اور

ہے دیر و حرم سے بھی سوا انکا مکاں اور | رہتے ہیں کہیں اور بتاتے ہیں نشاں اور

جب دل میں بھڑکتی ہے مرے آتش سوزاں | ہوتی ہے مری آہ و فغاں شعلہ فشاں اور

کیا کم ہے مرا بار گنہ قبر میں مجھکو | کیوں رکھتے ہیں سینہ پہ مرے سنگ گراں اور

میں اور شرابی ہوں مری اور ہے مستی | میخانہ مرا اور مرا پیر مغاں اور

اے قافلہ سالار تعقب میں ہیں رہزن
ہو تیز ذرا قافلۂ عمر رواں اور

عجب تسخیر کا جادو ہے اسکی چشم فتاں میں
ملا کر آنکھ اس نے کرلیا قبضہ مرے دل پر

کرینگے نقش ہائے رفتگاں خود رہبری میری
خدا چاہا تو اک دن میں پہنچ جاؤنگا منزل پر

وہ کیوں رک رک کے بار آستیں اپنی چڑھاتے ہیں
بلا کی ناامیدی چھا رہی ہے روئے بسمل پر

ہوتا ہے راز عشق بھی اے دل نہاں کہیں
روکے سے رک سکا بھی ہے نادان دھواں کہیں

صیاد کا بھلا ہو کہ دیکھا جہاں کہیں
رہنے دیا نہ اس نے مرا آشیاں کہیں

مجھ ناتواں کو دیکھ کے یہ کہہ رہی ہے موت
چلئے صغیر کیجئے نقل مکاں کہیں

اتنی طاقت تو ہو یارب ناخن تدبیر میں
ڈالدے رخنے لباس شوخی تقدیر میں

اک گرہ مشکل سے کھلتی ہے تو سو پڑتی ہیں پھر
ایسی الجھن پڑگئی ہے رشتۂ تقدیر میں

سلسلہ ملتا نہیں مطلب کہیں کھلتا نہیں
ایسی بے ربطی ہے مضمون خط تقدیر میں

غیر کے طعنے تمھاری جھڑکیاں سنتے تو ہیں
اور کیا سننا ہے آگے دیکھئے تقدیر میں

تری تصویر خیالی اے یار
پھرتی ہے صبح و مسا آنکھوں میں
آپ جائیں تو راحت ملجائے
دل کو ٹھنڈک ہو ضیا آنکھوں میں
موت کو پیش نظر رکھتا ہوں
پھرتی ہے روز قضا آنکھوں میں

صحرا میں نہ چین ہے نہ گھر میں
سودا ترے عشق کا ہے سر میں
کیونکر میں دکھاؤں کس سے بولوں
جو درد ہے دل میں اور جگر میں
اڑنے کا تو شوق ہے بہت کچھ
طاقت نہیں ہائے بال و پر میں
ہے نور سب اس ہی شمع رو کا
خورشید میں برق میں شرر میں

یہی پردہ نشینی ہے یہی کیا پردہ داری ہے
اشارے کر رہے ہیں اور بیٹھے ہیں وہ چلمن میں

لیجاؤں کس طرف دل وحشت اثر کو میں
صحرا کو دیکھتا ہوں کبھی اپنے گھر کو میں

یقیں ہے حشر میں دھل جائیں گے سب آب رحمت سے
سیہ کاری کے دھبے جس قدر ہیں میرے دامن پر

آخر میں اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ کے جشن سیمیں سے متعلق انہوں نے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اسکو

پیش کرکے یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت صغیر کی حمد طویل نظمیں اور قصیدے ایسی ہی سلیس اور صاف و شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں

میر عثمان علی خاں خسرو ملکِ دکن — فخرِ شاہانِ جہاں ہر بات میں ہیں واقعی
انکی ہے ہر آرزو میں خدمتِ خلقِ خدا — ان کے ہر مقصد میں پنہاں ہے رعایا پروری
ان کو بہبودیٔ اہل ملک کا ہر دم خیال — فکر ہمدردیٔ خلق انکو ہمیشہ ہر گھڑی
انکے عہدِ میمنت کے ہو گئے پچیس سال — ملک کی کیا کیا ترقی انکے ہاتھوں سے ہوی
جشن سلور جوبلی ہے انکا اب شوال میں — عید کے دن سے منائی جائیگی اسکی خوشی
ہے دعا دورِ حکومت دائم و قائم رہے — عہد صد سالہ کی انکے ہو خدایا جوبلی

جوبلی ہی کی زباں سے کہہ سن ہجری صغیر
"ہے مبارک آصفِ ہفتم کی سلور جوبلی"
۱۳۵۴

سیّد احمد حسین امجد

از

خواجہ حمید الدّین صاحب

معتمد انجمن معاون طلبہ

مرقع سخن



سید احمد حسین امجد

سید احمد حسین امجد

حضرت امجد موجودہ زمانہ کے بلند پایہ اور حقیقت نگار شاعروں میں سے ہیں۔ انکی شاعری کا محور اخلاق اور روحانی تعلیم ہے تمام ہندوستان میں انکی شاعری کی ساحری مشہور ہے۔ اگر شاعری کو ایک ایسے سمندر سے تشبیہ دیجائے جس میں طوفان تلاطم برپا ہو تو امجد اس سمندر کے ایسے شناور ہیں جن کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ موجودہ زمانہ میں وہ اپنے پاکیزہ اور حکیمانہ کلام کی وجہ سے آسمان شاعری کے مہر درخشاں کہلانے کے مستحق ہیں ان کے کلام کا غائر مطالعہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ان کی شاعری [illegible]

مولوی سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین نے معارف (فروری ۱۹۳۲ء) کے شذرات میں لکھا تھا کہ "معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو منھ لگائے لیکن حضرت امجد کی نو بہ نو حکمت آموز شاعری نے اسکو اعتراف فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے واقعہ کا اظہار کیا۔"

یہ تو بہ حیثیت مجموعی ان کے کلام کی خوبیوں کا اعتراف تھا لیکن ان کی اردو رباعیاں ایسی بلند پایہ ہیں کہ اردو ادب میں شاید ہی ان کا جواب مل سکے البتہ فارسی ادب میں عمر خیام، سلطان ابوسعید ابوالخیر، سحابی نجفی اور سرمد نے رباعی گو شعراء کی حیثیت سے اپنا کمال دکھایا ہے۔ انکے بعد فارسی ادب میں بھی کسی کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن خدائے تعالیٰ کو اپنی لا انتہا قدرت کا ثبوت دینا منظور تھا اسلئے اسنے سرزمین دکن میں ایک ایسا شاعر پیدا کیا جس نے صنف رباعی کو چار چاند لگادئے۔

امجد سب سے پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی انکی رباعیوں میں سرمد کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسلئے ان کو زندہ سرمد کہنا چاہئے بقول علامہ نادرگی وہ "جواب سرمد" ہیں

امجد برباعی است فرد امجد   کلک امجد کلید گنج سرمد   گفتم کہ بود جواب سرمد ہر دور   در دم سرود گفت امجد امجد

ان کی لاثانی اور لافانی رباعیوں کے متعلق متعدد لائق اور اہل ذوق اصحاب نے اظہار خیال کیا ہے جن میں سے چند کے خیالات کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سر اقبال "ہر رباعی قابل داد ہے ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے"

مولوی عبداللہ عمادی "معراج سخن میں شاہد معنی کو ہر صفت دیکھنا ہو تو رباعیات امجد کو دیکھئے"

حیدر یار جنگ نظم طباطبائی "رباعیات امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے"

مولوی الیاس برنی "ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ شاعری جزولیت از پیغمبری"

مولانا مناظر احسن "حضرت امجد ہندوستان کے ان شعراء میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے"

عظمت اللہ خاں عظمت "رباعیات امجد زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہیں"

پروفیسر سلیم نے تو ان کے متعلق ایک بسیط مضمون "دکن میں ایک رباعی گو شاعر" کے عنوان سے لکھا جو "افادات سلیم" میں بھی شائع ہوا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"امجد شعر گوئی کے وقت خیال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں انکے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہل بصیرت کیلئے ہوشربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے پھر وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے اور اسکو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعری کی یہی پہچان ہے ان کی منتخب رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کیجائیں گی۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی عجیب مستانہ ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو خیالات وہ بیان کر رہے ہیں وہ انکے دل کی آواز ہیں۔"

چند ماہ قبل مولوی سید سلیمان ندوی حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ نظام کالج کی بزم ادب کے افتتاحیہ جلسہ میں انہوں نے "جدید اردو ادب" کے عنوان سے ایک تقریر کی جس میں شاعری پر بحث کرتے ہوئے چند منتخب شعراء کے نام گنوائے اور اس سلسلہ میں کہا کہ "حضرت امجد کی ہستی نہ صرف سرزمین دکن کے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے باعث فخر ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کر لی ہے۔

کلام امجد کے نمونے پیش کرنے سے قبل ضروری تھا ہے کہ مختصر طور پر ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی جائے۔ ان کے والد

صوفی سید رحیم علی ابن سید کریم حسین ایک باخدا بزرگ تھے۔ ان کی والدہ کا نام صوفیہ تھا جو اسم بامسمیٰ تھیں۔ امجد کو اپنی والدہ محترمہ سے بے حد محبت تھی۔ بچپن ہی میں والد ماجد کے انتقال کی وجہ سے بیوہ ماں کے زیر سایہ پرورش پائی۔ والدہ ماجدہ نے اپنے اکلوتے لڑکے کی تعلیم و تربیت نہایت ہی بہتر طریقہ پر کی۔ چنانچہ ایک روز حضرت امجد سے فرمایا کہ "اگر دنیا میں جینا ہے تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ" ۱۳۲۶ھ میں رود موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی نے والدہ، بیوی اور دختر کو غریق امواج رحمت کر دیا اور صرف ذات امجد تن تنہا باقی رہ گئی۔

امجد کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی پھر مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں تخمیناً ۶ سال تک مصروف تعلیم رہے۔ ثناء الملک آغا شوستری سے شافیہ و نفحۃ الیمن پڑھیں۔ پنجاب کے امتحان منشی فاضل میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ علامہ سید نادر الدین سے فلسفہ و منطق کی تکمیل کی۔ انہوں نے حضرت امجد میں نہ معلوم کیا جوہر دیکھے کہ اپنی لائق بیٹی جمال سلمیٰ کا ان سے عقد کر دیا اور اپنی لڑکی سے یہ فرمایا کہ "میں نے تمہارے لئے جس شوہر کا انتخاب کیا ہے اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا" واقعی دونوں خوش نصیب تھے۔ ان دونوں کی صحبتوں نے ایک طرف جمال سلمیٰ کے معلومات میں اضافہ کیا تو دوسری طرف حضرت امجد کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا۔ ۱۳۴۷ھ میں حج بیت اللہ اور زیارت نبویؐ سے مشرف ہو کر جمال سلمیٰ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور حضرت شاہ خاموش کے شہر خموشاں میں دفن ہوئیں۔ اسوقت حضرت امجد کی عمر تقریباً ۵۰ سال ہوگی۔ شعر گوئی کا شعور پندرہ سولہ سال کی عمر سے پیدا ہوا۔ پہلے پہل دیوان ناسخ کا مطالعہ کیا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے جو شعر موزوں کیا، وہ یہ ہے ؎

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا — مگر یارب نہ ہو نامہرباں وہ مہرباں اپنا

چند ابتدائی غزلیں حبیب کنتوری کو دکھائیں لیکن یہ مشقیہ کلام اب باقی نہیں ہے۔ عزیزوں کے ساتھ یہ بھی رود موسیٰ کی طغیانی میں غرق ہو گیا۔ ۱۳۲۳ھ میں ان کی سو رباعیاں شائع ہوئیں جن کو حالی، شبلی اور مولوی عزیز مرزا نے بے حد پسند کیا۔ ایک زمانہ تک انکا کلام رسالہ مخزن اور نظام المشائخ میں شائع ہوتا رہا۔ بعد ازاں حضرت امجدؔ نے اپنے کلام کو کتابی صورت میں پیش کرنا شروع کیا اسوقت تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ رباعیات امجد دو حصوں میں۔ ۲۔ ریاض امجد دو حصوں میں۔ ۳۔ خرقہ امجد سی پیوند۔ ۴۔ نذر امجد

ان کے علاوہ کئی کتابیں نثر میں بھی ہیں۔ مثلاً ۱۔ جمال امجد ۲۔ حکایات امجد ۳۔ میاں بیوی کی کہانی ۴۔ گلستان امجد (ترجمہ گلستان سعدی) جو زیر طبع ہے۔

امجد فطرت نگار شاعر ہیں وہ اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتے جب تک کسی چیز کا ان کے دل پر اثر نہیں ہوتا۔ خود نہیں کہتے بلکہ ایک قوت ان کو لکھواتی ہے اور یہی وجہ ہے جو ان کے کلام میں اتنا اثر پیدا ہو گیا ہے کہ سننے کے ساتھ فوراً دل میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک قطعہ کہیے یا کلام ایسا اکثر سنا ہو گا تم نے — سنا آج اور کل اتر دل میں اترا — کہو شعر ایسا کہ ہو تیز خنجر — ادھر منہ سے نکلا ادھر دل میں اترا

ان کا کلام نہایت سلیس اور عام فہم ہوتا ہے اور اسکے ساتھ ساتھ بدائع لفظی اور معنوی بھی بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ سادگی اس بلا کی ہوتی ہے کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے جو کمال شاعری ہے۔ نازک خیالی تشبیہات اور استعاروں سے ان کا کلام مملو ہے لیکن یہ قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں تصوف کا رنگ، کہیں درد و غم کا سوز ہے تو کہیں پند و نصائح کا بیان۔ عام شعراء کی طرح امجد محض شاعر نہیں بلکہ ایک تبلیغی شاعر ہیں حقیقت میں ان کی شاعری کا معیار وہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمایا ہے۔

مشہور ہے کہ آنحضرت نے امرء القیس کی نسبت فرمایا ہے کہ "اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" وجہ یہ تھی کہ اسکی شاعری میں مخرب اخلاق، لغو اور لاحاصل اشعار ہوتے تھے۔ لیکن آپ نے ایک مرتبہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کے اس شعر کی تعریف فرمائی اور بہت محظوظ ہوئے ؎

ولقد ابیت علی الطویٰ واظلّہ — حتیٰ انال بہ کریم المأکل

یعنی "میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں کل حلال کے قابل ہو سکوں" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ "اس شعر نے میرے دل میں اس کے لکھنے والے کے شوق ملاقات کو پیدا کیا۔ امجد کے کلام کا مطالعہ کریں تو ان کی شاعری اسی طرح کی نظر آئے گی۔

امجد اعلیٰ پایہ شاعر اور نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک خدا رس اور صاحب باطن صوفی بھی ہیں لیکن ایسے صوفی نہیں کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھیں۔ ذیل کے قطعہ میں ذکر صوفیاں در حدیث دیگراں عجیب طریقے سے ہے ؎

آیا ہے زمانۂ ترقی   گندہ بندہ خدا ہوا ہے
ایمان کو دل سے صاف کرکے   امجد رفیق بنا ہوا ہے

ان کا طریق زندگی بالکل سیدھا سادا ہے وہ خود اپنا کام آپ کر لیتے ہیں۔ تکلف اور تصنع ان کی فطرت کے خلاف ہیں خودنمائی، آرائش اور فخر و غرور نے تو ان کو چھوا تک نہیں۔ نام و نمود، دنیوی خواہشات اور حرص و ہوس کو ذلت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک قطعہ میں اسکی اس طرح بیخ کنی کی ہے ؎

دین و دنیا سے کھو دیا مجھ کو   ہوس خام تو کہیں گر ہی بھی
نام نے کام ہی تباہ کیا   شاخ کے ساتھ کھنچ گئی جڑ بھی

اخلاق، منکسر المزاجی، سادگی، صفائی اور عبادت ان کے خاص اوصاف ہیں۔ اور یہ مقولہ کہ "شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے" امجد پر لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے۔ ان کا کلام حسب ذیل اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ نظم، تضمین، غزل، رباعی، قطعہ۔ ذیل میں ان کے کلام کا کچھ نمونہ بمصداق "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کیا جائیگا۔ جسکے مطالعہ سے ان کے کلام کی متذکرہ بالا خصوصیات کی وضاحت ہوگی۔ اور وہ لوگ جو امجد سے شخصی طور پر واقف ہیں اسکو زیادہ بہتر طرح سے سمجھیں گے

نظم۔ "مدینہ کی جوگن" ان کی ایک نظم ہے جس نے اس قدر مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ بچہ بچہ کے ورد زبان ہے۔ اس میں انہوں نے بلبل، پپیہے اور پروانہ سے خطاب کرنے کے بعد اپنی حالت کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً۔

پپیہے سے!

بے چین ہے پپیہے کس کے لئے تو اتنا   یہ حال کس کے غم میں ہے ہے ہوا ہے تیرا؟
یہ کالی کالی راتیں۔ یہ وقت راحت افزا   دنیا تو سو رہی ہے۔ تو جاگتا ہے۔ یہ کیا؟
سچ ہے تجھے بھی غم نے برباد کر دیا ہے   تیری زباں پہ پی پی لب پہ مرے پیا ہے

پروانہ سے!

او کشتۂ محبت! غم سے نہ ڈرنے والے   او ننھے کیڑے! سر کی پروا نہ کرنے والے
او شمع محفل غم! جل جل کے مرنے والے   او جان دینے والے! جی سے گزرنے والے
شیدا میں نور کی ہوں تو نار پر فدا ہے   منزل تو ایک ہی ہے رستہ جدا جدا ہے

طغیانی رود موسیٰ پر انہوں نے ایک مسدس "قیامت صغرا" کے نام سے لکھا ہے جس کے پڑھنے یا سننے کے بعد

سنگدل سے سنگدل انسان بھی بغیر چشم تر کئے نہیں رہ سکتا۔

میں موردِ حرمان و گرفتار بلا ہوں　　ماں باپ سے بچھڑا ہوں میں بچوں سے جدا ہوں
گہہ محو فغاں ہوں کبھی مصروف بکا ہوں　　معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں
بے ہوش کبھی ہوں کبھی ہو جاتا ہے سکتا　　وہ عالم حیرت ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
وہ رات کا سناٹا وہ گھنگور گھٹائیں　　بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں　　وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی　　پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی
مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پرنم　　بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم　　کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیّرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے　　وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

جب طغیانی کے گم شدہ عزیزوں کا پتہ نہیں چلتا ہے تو شاعر عالم محویت میں بے جان چیزوں سے استفسار کرتا ہے:

کس واسطے خاموش تو اے برق تپاں ہے　　آخر ترے منہ میں بھی تو اے رعد زباں ہے
اے مہر جہاں تاب مرا چاند کہاں ہے　　کس چاہ میں وہ یوسفِ گم گشتہ نہاں ہے
اے قافلۂ ریگ رواں تو ہی بتادے　　کس جا ہے مری مادرِ مرحومہ پتا دے

"میرا رام کہاں ہے" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

رات جب لوگ سوتے تھے سارے　　جب کھڑی تھی میں گنگا کنارے　　چاند پانی میں تھا عکس افگن　　مائی گنگا کا پرنور جوبن
دیکھ کر ایسا دلکش نظارا　　شدت غم سے میں نے پکارا　　روح بسمل ہے جاں نیم جاں ہے　　میں یہاں رام میرا کہاں ہے
کوئی بیکس کا ہمدم نہیں ہے　　مہرباں کوئی مجھ پر نہیں ہے　　یاس کی اوس برسی جو دل پر　　دی صدا رعد نے یہ گرج کر
دیکھ ہے پرمیشر مجھ میں تجھ میں　　رام تجھ میں ہے۔ ہے رام مجھ میں　　رام ہے جان میں رام تن میں　　رام گلشن میں ہے رام بن میں

رام کا ذکر ہر نام میں ہے　　رام سب میں ہے سب رام میں ہے
دل کے ہمراہ دلا رام بھی ہے　　تو جہاں ہے وہاں رام بھی ہے
کس لئے پھر یہ شور و فغاں ہے　　میں یہاں رام میرا کہاں ہے

حضرت امجد کی اور دو نظمیں (۱) گزار دے (۲) میگزرد۔ اس بلند پایہ کی ہیں کہ ان کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں طرح طرح سے مایوس اور ناامید دلوں کو ڈھارس دلائی جاتی ہے۔

راہ خدا میں زندگی مستعار دے　　چھننے سے پہلے جامۂ ہستی اتار دے
بہر رفاہِ خستہ دلاں اشتہار دے　　غم دیدہ دل کے کان میں امید پکار دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

مانا کہ غم میں حد سے سوا مبتلا ہے تو　　بیکس ہے تو فقیر ہے تو بے نوا ہے تو
کیوں جان مستعار سے اے دل خفا ہے تو　　اے رونے والے موت کو بھولا ہوا ہے تو
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

یہ قدر راست بار مصائب سے خم سہی　　آفت پہ آفت اور ستم پر ستم سہی
پاؤں میں چھالے دل میں خلش لب پہ دم سہی　　اے چلنے والے اور ذرا دو قدم سہی
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے　　دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گر امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے　　بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے
از ہوسہا بگزر یا بگزر میگزرد

خاک میں کاخ نشیں خاک نشیں یکساں ہے　　بند کی آنکھ تو پھر زشت و حسیں یکساں ہے
پیٹ میں لقمۂ تر نان جویں یکساں ہے　　آگئی نیند تو پھر فرش و زمیں یکساں ہے
از ہوسہا بگزر یا بگزر میگزرد

"تو پی کہے سو کون" کے چند بند پڑھنے کے قابل ہیں۔

پپیہے او پپیہے! تو یہ کیوں آنسو بہاتا ہے   زباں پر تیری پی پی کس لیئے رہ رہ کے آتا ہے
صدائے دردِ غم کیوں دردمندوں کو سناتا ہے   جو خود ہی جل رہا ہو اور کیوں اسکو جلاتا ہے
کاٹوں توری چونچ پپیہے ڈاروں واں پر نون   میں پی کی اور پی میرا تو پی کہے سو کون

جو بے آرام ہو اور اسکو بے آرام کرتا ہے   رموز خاص عشق و عاشقی کیوں عام کرتا ہے
سرِ بازار نام یار کیوں بدنام کرتا ہے   کسی دلدار کیوں کمبخت طشت از بام کرتا ہے
کاٹوں توری چونچ پپیہے ڈاروں واں پر نون   میں پی کی اور پی مورا تو پی کہے سو کون

تجھے جز آہ و نالہ دوسرا کوئی نہ کام آیا   خدا کو مان ظالم اب تو چپ ہو وقت شام آیا
تری آواز کیا آئی اجل کا اک پیام آیا   خبردار اب اگر تیری زباں پر پی کا نام آیا
کاٹوں توری چونچ پپیہے ڈاروں واں پر نون   میں پیا کی اور پی مورا تو پی کہے سو کون

تضمین: استاد الاساتذہ حضرت فیض حیدرآبادی کی غزل پر تضمین کی ہے جس میں تصوف کے پہلو کو ظاہر کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ ہم عبث خدا کو کعبہ و دیر میں تلاش کرتے رہے لیکن ایک مدت بعد معلوم ہوا کہ وہ خدا ہمارے دل ہی میں ہے۔ مثلاً

جنھیں ڈھونڈا کیا دیر و حرم میں دل نشیں تھے وہ   سمجھتے تھے جنھیں ہم دور تر ہم سے قریں تھے وہ
جہاں کی خاک چھانی عشق میں جنکے کہیں تھے وہ   ہوا اے فیض معلوم ایک مدت بعد یہیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جن کے نام کی دن رات مالا ہم

حافظ شیرازی کی ایک غزل پر تضمین کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ عشق ایک ایسا راز ہے جو چھپایا نہیں جا سکتا ایک نہ ایک دن کسی طرح ظاہر ہو جاتا ہے

چھپایا لاکھ مگر چھپ سکا نہ عشق کا راز   تمام حالت دل تاڑ ہی گئے دمساز
تری خطا نہ مرا جرم اے بت طناز   ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
دگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

"کوئلہ بھی نہ راکھ" پر بھی تضمین کی ہے اور نہایت ہی بہتر طریقہ پر مضمون کو سمجھایا گیا ہے۔

فنائے تیرگیٔ شب سے ہو نور سحر پیدا　　فروغ صبح مٹ جائے تو ہوں انوار خور پیدا
بدل جائے اگر قطرہ کی حالت ہو گہر پیدا　　ملے جب خاک میں دانہ تو ہو برگ و ثمر پیدا
لکڑی جل کوئلہ بھئے اور کوئلہ جل بھئے راکھ　　میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

"حاجت بسیار نیست" کے عنوان سے ایک تضمین ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے ؎

لیمپ برقی چاہیئے نازوں کے پالے کیلئے　　بیکسوں کو چاندنی بس ہے اجالے کیلئے
کملی والو! مر رہے ہو کیوں دوشالے کیلئے　　ہے جو کچھ بھی وہ بہت ہے مرنے والے کیلئے
درفضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست　　آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

سعدی شیرازی کے اشعار پر تضمین کرکے انسانوں کو خواب غفلت سے جگایا ہے۔

کیا زیست کا گھمنڈ کہ ہے مستعار عمر　　ملتی نہیں کسی کو بھی بار بار عمر
کر لے جو ہو سکے کہ ہے بے اعتبار عمر　　خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

غزل ۔ جہاں حضرت امجد کی رباعیوں میں حقیقت، صداقت اور معرفت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلیں بھی ان ہی مضامین سے آراستہ ہیں۔ مبالغہ نام کو نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ؎

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا　　کوئی تم سا نظر نہیں آتا　　ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں　　وہ تماشا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے　　جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

غالب کی غزل "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں" کی زمین میں ایک غزل کہی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں

نالۂ جان خستہ جاں عرش بریں پہ جائے کیوں　　میرے لئے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں

دیکھے جو تجھ کو اک نظر ہوش میں پھر وہ آئے کیوں
جس کو ترے قدم ملیں سجدہ سے سر اٹھائے کیوں

زخم کو کھاؤ کیوں بناؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤ
نسبت ہو کو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب کی طرح پر متعدد غزلیں لکھی ہیں جن میں سے دو کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں ۔

(۱)

کام کب جب مدعا نہ ہوا
اسکے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

سبب معرفت ہوں نیکوں کا
میں برا ہو کے بھی برا نہ ہوا

بندگی میں یہ کبریائی ہے
خیر گذری کہ میں خدا نہ ہوا

غیر کی کیا شکایت اے امجد
آہ جب میرا دل مرا نہ ہوا

(۲)

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا
جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا

تیرے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے
اپنے آپ کو میں نے تجھ سے کب جدا پایا

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہے
بارہا اسے کھویا اور بارہا پایا

ہم تو صاف کہہ دینگے مل گیا خدا اسکو
جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا

جستجو ہی اے امجد راز کامیابی ہے
جس نے جا بجا ڈھونڈا اسنے جا بجا پایا

حال ہی میں جے پور میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں تقریباً تمام ہندوستان کے شعراء جمع تھے۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے حضرت امجد سے غزل کہنے کی فرمائش کی تھی۔ "آئے نہ لے نقاب وہ میرے خیال میں" طرحی مصرع تھا جس پر حضرت امجد نے طبع آزمائی کی ہے ؎

آفت ہے آئے دن طلب ملک و مال میں
راحت دو جہان کی ترک سوال میں

کہتے ہیں "وہ بلند ہے وہم و خیال سے"
یہ بھی ہے اک خیال ہمارے خیال میں

دیکھو خدا کی شان وہ آئے ہیں میرے گھر
جو آج تک نہ آئے کسی کے خیال میں

جب تک رہا فراق رہی انکی جستجو
اب ہے کہ خود کو ڈھونڈ رہے ہیں وصال میں

وہ آنے والے ہجر کے جھگڑوں سے بچ گیا
جس زندہ دل نے جان ہی دی دیدِ وصال میں

جھکتا نہیں ہے بدر کبھی مثل ماہ نو
کیا شان ہے کمال کی اہل کمال میں

دیکھو نہ کم نگاہی سے امجد فقیر کو　　آب حیات ہے اسی جام سفال میں

ایک اور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جس میں تصوف کی خاص جھلک نظر آتی ہے ؎

بندے کی میت میں مولا نظر آتا ہے　　قطرے کی حقیقت میں دریا نظر آتا ہے
اے دیر و حرم والو! دیکھو مری آنکھوں سے　　دل کافر و مومن کا کعبا نظر آتا ہے
کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد　　ہر پردہ کے بعد، اور اک پردا نظر آتا ہے

حضرت امجد کی ایک مشہور نعتیہ غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں　　دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جام سفال اس کا تاج شہنشہی ہو　　آجائے جو بھکاری، داتا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں　　بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لیے ہیں　　مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں

قطعہ - حضرت امجد نے کئی قطعے بھی لکھے ہیں لیکن عموماً چھوٹے چھوٹے - ایجاز نگاری میں ان کا قلم معجزے دکھاتا ہے، یہاں چند قطعے پیش کیے جاتے ہیں۔

غم کے ہاتھوں ہے روز بربادی　　عمر بھر بے شمار موتیں ہیں
موت میں ایک بار مرنا ہے　　زندگی میں ہزار موتیں ہیں

اس قطعہ میں یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ انسان کے دل میں کسی نہ کسی کا خوف ضرور ہونا چاہیئے۔ ورنہ اسکی زندگی بڑی خوفناک ہو جائیگی - اور اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ انسان اپنی اصلی فطرت کو ہرگز ہرگز نہیں بدل سکتا ؎

انساں کے دل میں خوف کسی کا ضرور ہے　　بے خوف زندگی تو بڑی خوفناک ہے
ممکن نہیں کہ فطرت اصلی بدل سکے　　امجد ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے

ایک اور واقعہ ہے جس میں امید و بیم کا نقشہ کھینچ کر دنیا کی ہستی و نیستی کا منظر بتلایا گیا ہے ؎

ہر ایک ذرہ کبھی ہے امید کا مرکز　ذرا سی دیر میں پھر خوفناک ہوتا ہے　بلند ہو کے یہی خاک کاخ بنتی ہے　زمیں پہ گر کے یہی کاخ خاک ہوتا ہے

تمام دنیا والے اپنی ہستی پر فخر و ناز کرتے ہیں لیکن حضرت امجد اپنی نیستی پر مر رہے ہیں ؎

جہاں کو ناز ہے ہستی پہ اپنی　میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں　ملا ہے جب سے لطف خاکساری　تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

چونکہ دنیا فانی ہے اسلئے دنیوی زندگی بھی فنا ہونے والی ہے لیکن اسکے باوجود دنیا والے جینے پر مرے جا رہے ہیں

اسی مضمون کو ایک قطعہ میں بیان کیا ہے ؎

میں اس دریائے موج زن میں　مانند حباب بھر رہا ہوں　ہر سانس میں ہے پھانس کی کھٹک　پھر بھی جینے پہ مر رہا ہوں

اس قطعہ میں تقدیر کو تدبیر پر مقدم ثابت کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ رہے نہ کہ بندوں کے ؎

لاکھ اپنی طرف سے تم تدبیر کئے جاؤ　آخر وہی ہونا ہے جو اسکی مشیت ہے
تم ساتھ رہو اسکے جو ساتھ تمھارے ہے　غیروں کی معیت تو میت کی معیت ہے

رباعیات ۔ اب حضرت امجد کے کلام میں سے اس صنف کو پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو زندہ و سرمد کہا جاتا ہے

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جب تک خوشی یا رنگ کی محفل ہو انسان خوش و خرم رہتا ہے مگر جب وہ ختم ہو جاتی ہے تو اسکا ردعمل اس طرح ہوتا ہے کہ انسان وہاں سے نہایت ہی افسردہ و مکدر ہو کر نکلتا ہے ۔ دنیا کو وہ پائدار سمجھتا ہے لیکن موت اسکی حقیقت واضح کر دیتی ہے

اسی مضمون کو رباعی میں پیش کیا ہے ؎

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا　ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا　منزل ہی نہیں یہاں مسافر کیلئے　سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

اس رباعی میں ہمدردی کا سبق سکھلایا گیا ہے ؎

ہر لطف و کرم حسن عمل ملتا ہے　احسان سے باب لطف حق کھلتا ہے　ہمدردی غیر میں ہے اپنا بھی بھلا　کیا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

دل خانۂ خدا ہے اسلئے دل توڑنا گویا خدا کے گھر کو ڈھانا ہے اسی لئے کسی کے دل کو خوش رکھنا تمام عبادتوں سے زیادہ افضل ہے

مغموم کے قلب مضمحل کو توڑا　یا منزل قیس منفعل کو توڑا
کعبہ ڈھانا تو پھر بنا بھی لیجئے　افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

ذیل کی رباعی میں "ھو الذی انزل الغیث من بعد ما قنطوا" کی تفسیر کی ہے ؎

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

پابند کیا قید نفس میں رکھ کر
بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں رکھ کر
صیاد کی صید پروری تو دیکھو
گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر

اس رباعی میں ظاہر و باطن کے فرق کو نہایت مدلل اور سلیس طریقہ پر واضح کیا ہے ؎

باتیں تو بہت ہوئیں ہنر بھی دیکھو
تقریر تو سن چکے اثر بھی دیکھو
ہوتا نہیں ظاہر پہ قیاس باطن
دلق اطلس کا آستر بھی دیکھو

اس رباعی میں وحدت وجود کے مسلک کو کس خوبی سے سمجھایا ہے ؎

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

کچھ عرصہ قبل "رسالہ معارف" میں "فلسفۂ نماز" کے عنوان سے حضرت امجد کی چند رباعیاں شائع ہوئی تھیں جس کا انتخاب درج ذیل ہے

دامان گناہ چاک ہو جاتا ہے
نفس سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مومن کے لئے عجیب نعمت ہے نماز
سر خاک پہ رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

پا یا نہ حیات کا ثمر اک دن بھی
ہم کو نہ ہوا خدا کا ڈر اک دن بھی
کیا حق ہے زمیں پہ پاؤں رکھنے کا ہمیں
رکھا نہیں جب سجدہ میں سر اک دن بھی

فطرت ہر چیز کی طرف مڑتی ہے
ٹوٹی ہوئی شاخ آ کے پھر جڑتی ہے
ہوتا ہے نماز میں ہجوم خطرات
گھر جھاڑتے وقت خاک بھی اڑتی ہے

ذیل کی رباعی کا مضمون نیا نہیں ہے۔ لیکن حضرت امجد نے اسکے اظہار کیلئے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ حسن بیان کا معراج کمال کہلا سکتا ہے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے

ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

اس رباعی کا حکیمانہ استدلال غور کرنے کے قابل ہے ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے

افلاس نے سخت موت آساں کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

حضرت امجد کی قادر الکلامی کا پتہ ذیل کی رباعی سے چلتا ہے ؎

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو
رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو

اظہار کمال میں ہر اک کامل ہے
سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

اس رباعی میں حضرت امجد ناکام دلوں کو تسلی دیتے ہیں کہ دنیا قدر دانی کی جگہ نہیں اور اپنی بے قدری پر آنسو بہانا بے سمجھی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ دنیوی قدر کو ذلت سمجھتے ہیں ؎

کیا فکر ہے کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو
جھوٹی دنیا میں عز و شاں ہو کہ نہ ہو

اللہ مسرت حقیقی دے دے
ہم زندہ رہیں نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

"وتعز من تشاء وتذل من تشاء" کی تفسیر ملاحظہ ہو ؎

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے

اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

حسن طلب کا یہ انداز حضرت امجد ہی کا حصہ ہے ؎

ضائع فرمانہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری

آیا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور
دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

"حسبنا اللہ نعم الوکیل" کی تشریح حضرت امجد کی زبان فیض ترجمان سے سننے کے قابل چیز ہے ؎

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

اولوالعزمی کا کیا اچھا سبق سکھایا ہے ؎

اے قطرۂ آب بحیل دریا ہو جا
اے طائرِ روح مرغ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر
اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

جب کوئی ہونے والی چیز ہو جاتی ہے تو انسان فضول اسکے اسباب و روجوہات کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی نادمِ مرگ اسکو کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا۔ شاید مرنے کے بعد اسکا انکشاف ہو تو ہو ؎

اسباب و علل کا دور کرتے رہیے
اپنی فطرت پہ جور کرتے رہیے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا رک نہ سکا
اب کیوں ہوا اس پہ غور کرتے رہیے

ناداں، دانا نہیں ہو سکتا، اس نکتہ کو سمجھانے کا کیا نیا انداز نکالا ہے ؎

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

حضرت امجد کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی صورت سے بھی امیر نہیں بن سکتے لیکن اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں فقیر بھی نہ ہو سکے ؎

آزاد کہاں! اسیر بھی تو نہ ہوئے
غلبر نہ سہی عبیر بھی تو نہ ہوئے
امجد صاحب امیر تو کیا ہوتے
لیکن سچ مچ فقیر بھی تو نہ ہوئے

"ایک کے ہو کر دیکھو" کے عنوان کی رباعی بھی پڑھنے کے قابل ہے ؎

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو
جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اسمیں کیا لذت ہے
اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

ذیل کی رباعی میں حضرت امجدؔ نے دنیا کو ایک پیغام دیا ہے ۔ یہ پیغام کیا ہے حقیقت میں آیتِ امن ہے ؎

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے　　ہر چیز کو اچھا کہو تمجید یہ ہے
مخلوقِ خدا ہے سب کی مخلوق　　سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

ایک رباعی میں "کَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا" کی تشریح کی گئی ہے ؎

او دامنِ مدعا کے بھرنے والے　　قرآں کی طرح دل میں اترنے والے
دل سے مرے دور کر دے باطل خطرات　　کعبے کو بتوں سے پاک کرنے والے

میر تراب علیخاں تراب یار جنگ سعید

از

مرزا سرفراز علی صاحب

سابق مدیر المومنی و مجلۂ عثمانیہ



نواب تراب یار جنگ بہادر سعید

میر تراب علیخاں تراب یار جنگ سعید

نواب تراب یار جنگ بہادر سعید نواب میر داور علی خاں، بہرام الدولہ کے بڑے صاحبزادے ہیں ١٣٠٢ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ نواب بہرام الدولہ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی تھی اور ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان بھی گئے تھے وہ اپنے ذاتی اوصاف، علمی مذاق اور کھیل کود سے دلچسپی کے باعث ہر دلعزیز تھے، ان کا بیاہ نواب مختار الملک کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوا تھا۔

اُن کے مورث اعلیٰ سید عاقل خاں بہادر فرخ سیر بادشاہ دہلی کے ملازمین خاص میں سے تھے۔ جب مغلیہ سلطنت کا وار انتشار ہوگیا اور بادشاہ نام کے رہ گئے تو انہوں نے دلی کو خیرباد کہا اور سات سو سواروں کے ہمراہ حیدرآباد چلے آئے اُس وقت نواب آصفجاہ اول سریر آرائے سلطنت تھے۔ سید عاقل خاں مرحوم نے آخر عمر تک دربار دکن ہی کو اپنا ملجا و ماوا قرار دیا اور انتہائی وضعداری کے ساتھ اپنی زندگی گذاردی۔

اِن کے صاحبزادے میر امام علیخاں، آصفجاہ ثانی کے دربار میں باریاب ہوئے اور برہان الدولہ نواب بہرام یار جنگ کا خطاب، پنج ہزاری منصب، تین ہزار سوار، ایلچ پور کی صوبہ داری اور بیس گاؤں صوبہ برار کا سیر حاصل قطعہ جاگیر کے طور پر عطا ہوا۔

غرض کہ سید عاقل خاں سے لے کر آج تک یہ خاندان خانوادہ آصفی کی روایتی نوازشوں اور عزت فزائیوں سے بہرہ ور ہوتا چلا آیا ہے خود سعید دفتر مالگذاری سرکار عالی کے شعبۂ ترقیات عامہ کی خدمت مددگاری پر فائز ہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ انسان کے افعال و کردار، ارث اور ماحول کے اثرات سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے وہ جس خاندان میں پیدا ہوتا اور جس ماحول میں پرورش پاتا ہے وہی اُسکی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کی ضامن ہوتی ہیں۔

اعلیٰ اخلاق اور منکسر مزاجی اس خاندان میں میراث کے طور پر چلی آتی ہے اور یہی وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر انسان آدمیت کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا، دل آزاری، بداخلاقی، بد دماغی اور کینہ پروری جیسی مذموم عادتیں کم ظرفوں کی

زندگی کے لوازم میں تو ضرور ہوتی ہیں، لیکن اچھے آدمی انہیں اپنی پرچھائیں تک بھی پہنچنے نہیں دیتے۔

سعید نے اپنے کلام میں جابجا اس مسلک کی تلقین فرمائی ہے، ایک مرتبہ وہ اپنے چند احباب سے شعر و سخن پر تبادلہ خیال فرما رہے تھے، کسی نے ایک غیر معروف شاعر کا حسب ذیل مصرعہ اُن کے سامنے پڑھا اور خواہش کی کہ اس پر گرہ لگائی جائے

ع نرم دل رکھتا ہوں لوہے کا جگر رکھتا ہوں — ظاہر ہے کہ یہ مصرعہ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے بھی صاحبانِ ذوق کی توجہ اپنے آپ میں جذب نہیں کر سکتا، لیکن نواب سعید نے اس پر گرہ لگانے کے بعد الفاظ کے اس بے معنی مجموعہ میں حقیقی کچھ جان ڈال دی ہے، وہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے —

غم دشمن کا ہے غم، اس کی جفا کا ہے نہ خوف
نرم دل رکھتا ہوں لوہے کا جگر رکھتا ہوں

شریف آدمی یہ ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ اُنکا دشمن مصیبت میں گرفتار رہے اور وہ آرام اور آسایش کی زندگی بسر کریں۔ بنی نوع انسان کی دل آزاری اُن کے مذہب میں ایک نہایت سنگین اخلاقی جرم سمجھی جاتی ہے،

سعید اس پاک جذبے کی ترجمانی اِن الفاظ میں فرماتے ہیں —

مصیبت ٹوٹتے جب دیکھتا ہوں اپنے دشمن پر
خدا کا شکر ہے آنسو ٹپک پڑتے ہیں آنکھوں سے

بیسویں صدی عہدِ متمدن کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس دور میں تجارت اور صنعت زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما نظر آتے ہیں مغربی ممالک نے اس جدید تمدن کی تاسیس کی ہے اور ہمیں یہ پروان چڑھ رہا ہے، آدمی حد سے زیادہ مغرب زدہ یا روشن خیال ہو جائے تو خیر ورنہ ذرا سے غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ہم نہایت آسانی کے ساتھ اس حقیقت تک پہنچ سکیں گے کہ وہاں کے اخلاق، تہذیب اور شائستگی کا معیار بھی تجارتی اصول ہی پر متعین کیا جاتا ہے۔ محسن کُشی اس زمانہ میں عام ہو چلی ہے لیکن اخلاقی لزوم اور اخلاقی قوانین پر انسانوں کے اس طرز عمل کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑ سکتا چنانچہ اہلِ ہوش کی خود داری اور پاسِ وضع ملاحظہ ہو —

کسی معشوق کی تیغ ادا سے بھی گراں تر ہے
اٹھا لینا کسی کا بارِ احساں اپنی گردن پر

نواب تراب یار جنگ زیادہ تر غزل ہی کہتے ہیں اور غزل ہی میں ان کی شاعری کا رنگ پورے طور پر نکھرتا ہے مضامین عام طور پر عاشقانہ ہوتے ہیں لیکن انکے کلام میں کہیں کہیں پند و موعظت کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔ زبان نہایت سادہ

پرلطف اور دلنشین ہوتی ہے، الفاظ کے انتخاب اور جذبات نگاری میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

بعض لوگ جو نئی نئی اصناف شاعری کو اردو میں رواج دینا چاہتے ہیں اور غیر مانوس اوزان و تراکیب کے شیدا ہیں غزل کی زبان، بحر اور مضامین کو بالکل ہی ناکارہ اور عبث قرار دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔

زبان کی وسعت اور اسکے پھیلاؤ کی خاطر ہمیں تنگ نظری اور ذاتی اجتہاد سے کام نہ لینا چاہئے، لیکن حد سے زیادہ روشن خیالی بجا طور بھی ترقی زبان کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اس اندھا دھند تقلید سے ہماری شاعری اور ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے، اور یہ نیا اسلوب بیان ٹیگور کے تراجم کا مصداق بنکر رہ جائے۔

افراتفری زندگی کے ہر شعبہ میں ابتری اور بے اطمینانی پھیلا دیتی ہے، جدید رنگ کی پیروی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل ہی بے نیاز ہوجائیں اور بے وجہ ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ہندوستان میں، مغربی علوم و فنون کی ترقی نے ہمیں دنیا کے مختلف اقطاع کے ادب سے روشناس کر دیا ہے، ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور جاپانی ادب سے، وہاں کی اصلی تصانیف یا تراجم کے ذریعے کافی طور پر واقف ہوچکا ہے، اسکے علاوہ نئی نئی معاشی اور سیاسی تحریکیں دیس کے ہر گوشہ میں آزادی اور عمل کی روح پھونک رہی ہیں۔ ان حالات کے تحت نئی اور اچھوتی بندشیں، تراکیب اور خیالات لازمی طور پر ہمارے ادب اور زبان میں داخل ہونگے۔ لیکن انکا بیجا عمل دخل جو اکثر و بیشتر نومشق انشاپردازوں اور شاعروں کی مشخیت مآبی کا نتیجہ ہوتا ہے ہندوستانی زبان اور ہندوستانی قومیت کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہوگا عام رجحان کے مطابق غزل گو شعراء کو سرے سے نکما ہی قرار دیدینا خود اپنی کور ذوقی کی روشن دلیل ہے، اچھا غزل گو، اپنے ایک ایک شعر میں بسا اوقات اس غضب کا مضمون باندھ جاتا ہے کہ ایک مسلسل نظم میں بھی اس کا سرانجام نہیں ہوسکتا۔ ذیل میں ہم چند مثالوں کے ذریعہ اپنے اس بیان کی دلائل پیش کرتے ہیں۔

الفت

حقیقی عشق کی منزلوں میں انسان جتنا بے باک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اسکے اطمینان قلب میں اضافہ اور جذب پر گھمنڈ ہونے لگتا ہے، قفس کی نازک تیلیوں میں بند رہنے کے باوجود وہ اپنے دل کی کارفرمائیوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی

منحرف نہیں ہوتا وہ اُسے کائنات کا برحق حکمران اور جائز فرماں روا تصور کرتا ہے، اسکے سکوں میں ذراسی تبدیلی اور اسکی طبعی حالت کا ذرا سا اختلال اسکی دانست میں نظامِ عناصر کو درہم و برہم کرسکتا ہے ۔

بڑھا ہے اضطرابِ دل قفس میں گریں گی بجلیاں اب آسماں سے

سعید نے ان دھیمے اور خاموش الفاظ میں جو نفسیاتی استدلال پیش کیا ہے، اس کا لطف تو کچھ اہلِ ذوق ہی اٹھا سکتے ہیں۔ انکے کلام میں اس قسم کی بیسیوں لطیف مثالیں موجود ہیں، ہم نے ابتک تو یہی سنا ہے کہ محبوب وفا نہیں کرتے اور عاشق کا دل ان کے ستم و جور کو اپنے آپ میں جذب کرنے کے علاوہ کسی اور کام کا نہیں رہتا ۔

غالب نے اس مرحلہ میں تھوڑی بہت جسارت سے کام لیتے ہوئے دعا کی ہے کہ میں اُسے بلاتا تو ضرور ہوں لیکن اے جذبۂ دل اسکو تو کچھ اس طرح سے میری درخواست کے قبول کرنے پر مجبور کردینا کہ بن آئے نہ بنے ۔

اس قسم کی بے اعتمادی، سعید کے خیال میں حقیقی عشق کے نمایاں نشان نہیں، چنانچہ کس فخریہ انداز میں ایک پشیمان محبت سے تخاطب کیا ہے ۔ سمجھے تھے کیا سعید کے دل کو دلِ رقیب وعدہ کے بعد آپ کا آنا ضرور تھا

ذیل میں اس نوع کی چند اور مثالیں درج کیجاتی ہیں ۔ تری تیغِ ادا کے اے ستمگر کھلے جوہر ہمارے امتحاں سے

عاشق کے وجود کے بغیر محبوب کی رعنائیاں بے نمود ہو جاتی ہیں ۔ نہ تاب یک دمکی کی اغیار لائے ابھی آپ پر بیٹھے فدا ہونے والے!!

طنزیہ مضامین میں اس شعر کو خاص درجہ حاصل ہے ۔ ہوا ہے اب تو قائل باغباں بھی سعید کے بعد سعید اپنے نشیمن ہی سے کچھ رونق ہے گلشن پر

جلوے کمالِ ذوقِ فنا کے چمک اٹھے جو ذرہ میری خاک کا تھا ارتکِ طور تھا میری وفاکشی نے طریقے بتا دئے ورنہ جفاکشی کا تجھے کب شعور تھا

اوپر کے تین شعروں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ عاشق اپنے وجود کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ کائنات کی چہل پہل اور دھوم دھام انکی ذات پر منحصر ہوتی ہے سچے عاشق کا دلی منشا یہی ہوتا ہے کہ اُس کا محبوب اُس پر طرح طرح کے ظلم کرے اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی درد اور فریاد کی لذت سے محروم نہ رہے مرزا غالب دوست کے ظلم و ستم پر پھولے نہیں سماتے اور اس ڈر سے کہ اُن کا دل ایک ایک دن اس کھیل سے اکتا جائیگا انکی طبیعت پژمردہ ہو جاتی ہے، وہ تمنا کرتے ہیں کہ انھیں لیبار و زیادہ دیکھنا نصیب ہو۔ سعید نے عجیب لطف کے ساتھ "اس قدر اُن نے جفا" کا شکوہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں لذتِ درد نہیں لذتِ فریاد نہیں اب وہ پہلی سی جفا ئے ستم ایجاد نہیں!! کلام کی دلکشی اور زیبائی کے اس کا راس ایجاد ہوا کرتی ہے غالب نے

ایک شعر میں محبوب کی خوبی گفتار کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں ۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا نے ایک اہم مسئلہ کا حل نہایت دلخوش کن اور تشفی بخش طریقہ پر تلاش کر لیا تھا۔ ایک بہترین شعر خوشگوار ترین راگ نفیس ترین صنعت، اور چہرہ مہرہ سے بنے ہوئے آدمی پر نظر ڈالنے کے بعد ہماری طبیعت اتنی مسرور ہو جاتی ہے کہ ہم اسکے صنعت گر کے کمال پر نظر کئے بغیر صرف اُسی کی پرستش میں غرق ہو جاتے ہیں ۔ سعید نے اپنے اکثر اشعار میں ایسی ہی مضطرب کن کیفیتیں پیش کی ہیں، محبوب، ظاہر ہے کہ اپنے پرستار سے کیوں یگانگی بڑھانے چلا۔ وہ اُس سے ہمیشہ کھنچا کھنچا اور الگ تھلگ ہی رہا کرتا ہے۔ شاعروں کے تخیل کے مطابق وہ کمسن ہوتا ہے اور طبیعت کا الھڑ کسی نے اُسے ذرا بھی چھیڑا اور وہ بگڑ گیا لیکن ایسے آدمیوں کو ستانے اور اُن سے بے تکلفی بڑھانے کی کوشش میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے جسے ہم محسوس تو کرتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے ۔ سعید کے حسب ذیل شعر کی تشریح آپ خود فرما لیجئے ۔ جو یہ چاہتے تھے دل کو قابو میں رکھتے لو تم ہو ذرا میں خفا ہونے والے

عشق کی ابتدائی منزلوں میں آدمی پر ایک خاص اضطرابی کیفیت طاری رہتی ہے لیکن اسکی نبرد آزمائیاں آگے چلکر طبیعت میں ایک قسم کا سکون اور یکسوئی پیدا کر دیتی ہیں ۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے دل بیقرار ہے اب سکون ہے کہ طبیعت بہ بار ہے ۔۔۔ نہیں آہ کرنے کی تمنا ملیں وہ لذتیں ضبط فغاں سے

نواب تراب یار جنگ بہادر مسلمانوں کے امامیہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں حیدرآباد میں ائمہ اطہار کی شان میں قصیدہ خوانی کے جلسے اور مسالمہ کی محفلیں سال میں کئی مرتبہ خوش عقیدہ حضرات کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتی ہیں ہم نے اپنے ہوش سنبھالنے کے وقت سے لیکر اب تک ان محفلوں میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کی ہے اور اس فن کے نامور اساتذہ کی طبع آزمائیوں سے جی بھر کر لطف اٹھایا ہے ۔ فاضل، اجلال، عابد، تصور، شہید، سید محمد خاں کنتوری اور سعید ان محفلوں کی روح رواں ہیں نواب تراب یار جنگ قصیدہ تو نہیں کہتے لیکن سلام میں بہت کم لوگ انکا جواب کہتے ہیں۔ انکے سلام کے ایک ایک شعر پر لوگ گھنٹوں سر دھنتے ہیں اور محفل میں سناٹا سا ہو جاتا ہے ۔ ذیل میں دو سلام نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:۔

روضۂ شہ جلوہ گاہ نور ایماں ہو گیا   ذرہ ذرہ کربلا کا مہر تاباں ہو گیا
اور بھی کچھ اضطراب دل کا ساماں ہو گیا   میہمان کربلا کا حر جو مہماں ہو گیا!!
شہ کا سر نوک سناں پر کچھ کہتی تھی خلق   حق تو یہ ہے یہ عروج شان قرآں ہو گیا
دے چکے جب نذر اصغر کو شہ کرب و بلا   مطمئن ایسے تھے جیسے درد درماں ہو گیا
آ گیا حیدر زباں پر یا علی مشکل کشا   مرحلہ کیا منزل آخر کا آساں ہو گیا!
یوں گھٹا اہل حرم کے دل لئے لاشہ اٹھا کر جو   اور بھی تاریک وہ تاریک زنداں ہو گیا!
شہ کے سینے پر سکینہ مدتوں سوتی رہی   ایک دن آیا کہ سب خواب پریشاں ہو گیا

فکر آخر کس لئے ناکامی تدبیر میں   ہو نظر تو دیکھ لو آئینۂ تقدیر میں
داغ دل بڑھتے رہیں عشق غم دلگیر میں   یہ چراغ اکدن جلائیں روضۂ شبیر میں
ناتوانی عابد مضطر کی اور منزل کڑی   کس قیامت کی تھی حسرت دیدۂ زنجیر میں
خامۂ قدرت نے کی تھی آیۂ نصرت رقم   کب تھے جوہر حیدر کرار کی شمشیر میں
ایک پیاسے کی لڑائی نے یہ ظاہر کر دیا   کس شجاعت کا اثر تھا فاطمہ کے شیر میں
جا لگیگی کشتی امید ساحل پر سعید   دل اگر ڈوبا رہا بحر غم شبیر میں

اب ہم نواب سعید کے کلام سے چند غزلیں مثال کے طور پر نقل کر کے اس مختصر سے مضمون کو جو صرف تعارف کے طور پر ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے، ختم کرتے ہیں ۔

لذتِ درد نہیں لذتِ فریاد نہیں　　اب وہ پہلی سی جفا ستم ایجاد نہیں　　آئے تھے لیکے اسیری کی تمنا دل میں　　ہائے تقدیر کہ گلزار میں صیاد نہیں
مر بھی جاؤں جو تڑپ کر تو نہ نکلیگی کبھی　　قلبِ مضطر کی تمنا ہے یہ فریاد نہیں　　ناتوانی نے اثر نالۂ دل کا کھویا　　ہائے وہ درد میں ڈوبی ہوئی فریاد نہیں
اب تو یہ حال ہے آجائے نہیں تک نالے　　کس طرح ضبط فغاں کرتے رہیں یاد نہیں　　مرنے جینے کا مزہ بس اسی حاصل سعید ہے　　قید و بندِ غمِ الفت سے جو آزاد نہیں

رہے خود بے خبر ہم آشیاں سے　　شکایت اب کریں کیا باغباں سے　　مری تقدیر کے جھگڑے ستم تھے　　ملے کچھ آپ سے کچھ آسماں سے
قفس میں کس طرح ہم نے گذاری　　نہ کہنا ہم صفیر و باغباں سے　　سعید اُس سے سمجھ کر بات کرنا　　وہ بدظن ہو نہ اندازِ بیاں سے

ذرا دیکھ لے اے خفا ہونے والے　　تڑپتے ہیں کیوں کر فدا ہونے والے　　وہ جانباز جو جان دیدے وفا پر　　نہیں ہوتے وہ بے وفا ہونے والے
نگاہیں پھرا لو گے کیا میرے دل سے　　یہ پیکاں نہیں ہیں جدا ہونے والے　　سمجھتے ہیں ہم سب بناوٹ کی باتیں　　یہ وعدے نہیں ہیں وفا ہونے والے
سعید ان کے تیور یہ بتلا رہے ہیں　　ستم آج ہیں ناروا ہونے والے

کہو کیا فصلِ گل میں جب نظر پڑتی ہو گلشن پر　　دل پژمردہ کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں دامن پر　　اڑادی میری بیتابی نے قسمت تیرِ قاتل کی　　تجھا ور کرہا ہو دیکھ کر کیا تیری چتون پر
ہر اک نقشِ قدم ہے یادگارِ دشت پیمائی　　مرے جوشِ جنوں کے ہیں نشاں صحرا کے دامن پر　　کٹائی عمر بھر کی بس یہی چار تنکے ہیں　　تڑپ جاتا ہوں جب بجلی چمکتی ہے نشیمن پر
کسی محرومِ الفت کی لحد جب دیکھ پاتا ہوں　　گلِ داغِ دلِ مضطر چڑھا دیتا ہوں مدفن پر　　کبھی برہم ہوا آیا کبھی لہرائی بجلی　　ہے اک عالم امید و بیم کا اپنے نشیمن پر

پرتو سے تیرے آئینہ تصویرِ نور تھا　　تیرا غرورِ حسن بھی حسنِ غرور تھا　　جس دم نگاہِ ساقی اُٹھی ہوش سے گئی　　آنکھوں میں نور تھا مرے دل میں سرور تھا
جب ہو نہ اضطراب تو کیا لطفِ زندگی　　وہ دن بھی تھے کہ درد کا دل میں وفور تھا　　بے تابیوں نے میرے دلِ بیقرار کی　　برقِ نگہ کو تیری تعلق ضرور تھا
آئے یہاں عدم سے عدم ہی کو جا بسے　　طے انتہا کا مرحلہ کرنا ضرور تھا　　بے اعتنائیوں سے سمجھتا ہی شبِ وصال　　جتنا قریب تھا میں اتنا ہی دور تھا
دیکھا کیا نہ آپ سے یہ اور بات ہے　　بسمل کا حال دید کے قابل ضرور تھا

جوشِ وحشت ہے تو صحرا ہی کو اب منزل بنا　　ذرہ ذرہ کو بیاباں کے اپنا دل بنا　　آزمانا ہے اگر تیغِ ادا کو آزما　　کچھ نہ کچھ کو بھی آ کے اس طرح بسمل بنا
میں مسافر راہ دشوار اور شب تاریک تار　　خیریت گذری کہ دل شمعِ رہِ منزل بنا　　اہلِ دل گر یوں ہی احسان ہر نظر کا لے　　بڑھ کے خرمن کو تو اپنی کشت کا حاصل بنا
جادۂ راہِ وفا آساں نہیں اکتا ہے　　اپنے ہر نقشِ قدم کو آخری منزل بنا　　دردِ دل جتنا بڑھے بڑھتا ہی جائے　　ہوسکے تو دردِ دل کو زیست کا حاصل بنا
راز میری کامیابی کا تھی ناکامی مری　　حسرتیں لاکھوں مٹیں اک تو میرا دل بنا　　شکر ہے پوری ہوئی کی تمنا اے سعید　　جس کی تیغِ ناز کے گھائل تھے وہ قاتل بنا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے دل بیقرار ہے　　اب وہ سکون ہے کہ طبیعت پہ بار ہے　　تکلیف میں بھی آئے نہ لب پر کوئی گلہ　　سمجھو یہی مشیت پروردگار ہے
وہ تو کہو کہ جذبِ محبت کا ہے اثر　　ورنہ تمہارے وعدوں کا کیا اعتبار ہے　　موقوف کب بہار پہ ہے انبساطِ دل　　جس باغ میں تم ہو وہیں فصلِ بہار ہے
دامن چھٹے نہ ہائے تمنا کا ہاتھ سے　　یہ لے سعید اہلِ وفا کا شعار ہے

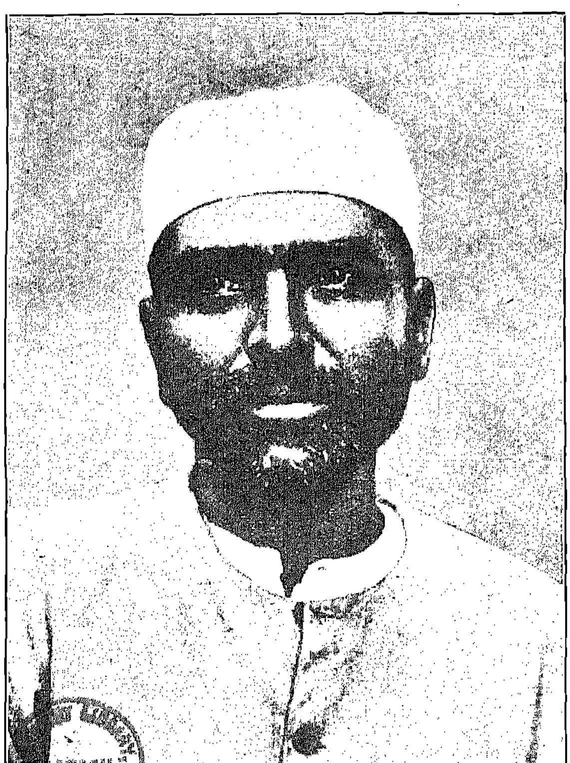
محمد محبوب علی صفی اورنگ آبادی

از

صاحبزادہ میر اشرف الدین علیخاں صاحب

خازن بزمِ اردو

مرقع سخن



محمد بہبود علی صفی اورنگ آبادی

محمد بہبود علی صفی اورنگ آبادی

نام محمد بہاءالدین مشہور بہبود علی تخلص صفی اورنگ آباد دکن میں ۲۶ رجب ۱۳۱۰ھ کو جونہ بازار میں پیدا ہوئے۔ مذہبًا حنفی اور نسبًا صدیقی ہیں۔ بہبود علی انکا خود اختیار کردہ نام ہے۔ ان کے اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے اجداد سپاہی تھے یا تجارت پیشہ جو شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ اورنگ آباد آئے تھے۔ ان کے والد حکیم محمد منیرالدین قادری اپنے اوائل شباب میں دہلی چلے گئے۔ جہاں انہوں نے حکیم اکبر علی خاں سے جو محلہ حبشی قبر میں رہتے تھے طبابت سیکھی اور ساری عمر اسی مشغلہ میں گزار دی۔ صفی کو حکیم اس لئے کہتے ہیں کہ ایک تو ان کے والد حکیم تھے اور دوسرے انہوں نے خود بھی طب کی تعلیم پائی ہے گر باضابطہ سند حاصل نہیں کی۔ جب یہ سات سال کے تھے اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آئے اور دو چار سال گھریلو تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ واقع شبلی گنج میں عربی و فارسی کی تعلیم پائی۔

یہ ایک آزادہ رو اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ خودداری صداقت اور ایثار اُن کی طبیعت ثانیہ ہے۔ حالی کا یہ شعر بالکل ان کے حسب حال ہے۔

خاکساروں سے خاکساری تھی ‏ ‏ ‏ ‏ سربلندوں سے انکسار نہ تھا

ہیں تو بڑے ہی یار باش لیکن صرف اسی حد تک کہ دوست ان کو دوست سمجھے کیا مجال جو کسی کے دل میں انکی طرف سے میل آجائے اور یہ بندۂ خدا بھول کر بھی اسکی طرف دیکھے۔ محلہ مغلپورہ میں رہتے ہیں مکان پر دن بھر دوستوں اور شاگردوں کا ہجوم رہتا ہے۔ محلہ والے ان کو "حضرت" پکارتے ہیں۔ لباس نہایت سادہ ہوتا ہے۔ صرف قمیص نما کرتہ اور سارون (تہمد) باندھتے ہیں۔ دو فردی رومال ایڑی تک لٹکتا ہوا کندھے پر پڑا ہوتا ہے۔ سر پر اکثر کپڑے کا تاج ہوتا ہے جی میں آیا تو ترکی ٹوپی بھی پہن لیتے ہیں اور شیروانی بھی۔ شعر بھی شوق سے بھی۔ کسی سے ملتے ہیں تو نہایت خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ گفتگو جلد جلد کرتے ہیں اور بات کو فورًا ختم کرنا چاہتے ہیں۔

حصولِ معاش کی خاطر جو جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان سب سے انہوں نے بھی کام لیا۔ لیکن طبیعت آزاد پسند واقع ہوئی ہے۔ اسلئے کہیں ٹک کر نہ رہ سکے۔ محکمہ جات نظم جمعیت سرکار عالی اسپیشل مجسٹریٹی اضلاع دیوانی بلدہ۔ عدالت العالیہ نیز اپنی سپاہی فوج اور آرائش بلدہ میں بدفعات ملازمت کی۔ لیکن جلد چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ رہے۔ اب وہ ہیں اور فقر و آزادی کے مزے!!

ابتداءً شاعری کے مراحل جیسے کچھ طے ہوئے، ہوئے۔ لیکن جب زمانے نے اپنا اثر ڈالا اور رسم و رواج کی ہوا لگی تو اپنے کہے ہوئے پر کسی نہ کسی کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک غزل ضیاء گورگانی کو دکھلائی۔ اسکے بعد دو غزلیں حکیم ظہور احمد دہلوی کو، پانچ سات غزلیں عبدالولی فروغ کو اور چند غزلیں کیفی کو دکھائیں۔

یہ ان کے آخری شاگرد ہیں۔ جب حضرت کیفی نے ۱۳۲۸ھ میں انتقال کیا تو فروغ نے اپنے قابلِ فخر استاد بھائی کی یادگار میں ایک مشاعرہ کیا۔ جو خانقاہ چشتیہ مسجد ساجدہ بیگم مغل پورہ میں (جو کیفی کا مستقر تھا) ہوا۔ طرح تھی۔

"بھائی کیفی کا ان آنکھوں سے الم دیکھتے ہیں"

حاصلِ مشاعرہ صفی و ریاض کی غزلیں تھیں۔ ریاض بھی صفی کے استاد بھائی ہیں۔ صفی کی غزل کا مقطع تھا۔

اٹھ گئی ہائے عجب فرد زمانے سے صفی　　　آدمی حضرت کیفی سے بھی کم دیکھتے ہیں

ان کو اپنے استاد کی صحبت و خدمت کے کم حاصل ہونیکا افسوس ہے اس عہد و سالہ کی کیفیت کو صفی ہی کی زبانی سننے میں لطف آتا ہے۔ یہ اپنے سب استادوں کی نسبت حضرت کیفی کی اصلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفی کی انتہائی خودداری اور قناعت پسندی نے اس قدر شدت اختیار کرلی ہے کہ انہوں نے کسی ماہنامہ کو غزل یا نظم اشاعت کیلئے نہیں دی۔ حالانکہ متعدد رسائل نے انکا کلام شائع کرنا چاہا لیکن یا تو اکثر احباب نے خلاف منشا کلام بھیج دیا یا کسی خاص دوست نے اسکی اجازت لے لی۔ ثانی الذکر خصوص میں صرف حیدرآباد کے دو چار رسائل ہی میں انکا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ خود ان کا یہ نظریہ ہے کہ وہ شہرت و نام آوری یا اسی قبیل کے کسی اور مقصد کیلئے شعر نہیں کہتے بلکہ ان کی شاعری بربنائے ذوقِ طبعی ہے۔

دیوان۔ ان کا دیوان جو اس وقت پیشِ نظر ہے اور انہوں نے میری طلب پر بھیجے دیا ہے قریباً مکمل و مرتب ہے۔

اس کا نام "پراگندہ" کتاب کے پشتے پر سنہری حروف میں منبت ہے۔ خدا کرے یہ سرمایہ جلد چھپ جائے اور ملک کیلئے ایک ادبی اضافہ کا کام دے۔ حضرت صفی نے اپنی شاعری کو غزل گوئی تک محدود رکھا ہے۔ چند قصیدے اور رباعیاں اور نظمیں ضرور کہیں ہیں جو زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ ان کا اصلی میدان تغزل ہے۔

ان کا کلام باوجود اکثر احباب کی کوشش کے ان کی بے پروائی کی تحت ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اسی بنا پر ہندوستان بخوبی واقف نہیں۔ لیکن جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق ہے بھلا وہ کون شخص حیدرآباد میں ہوگا جو ان سے واقف نہ ہو۔ اگر ہندوستان کے اچھے شاعروں کی ایک فہرست تیار کیجائیگی تو اس میں صفی کا نام بھی ضرور شریک رہے گا۔ یہ نہایت پرگو شاعر ہیں۔ اور موزونی طبع کا یہ عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے اور جب شریک ہوتے ہیں تو ایسی سیر غزل پڑھتے ہیں کہ مشاعرے بھر میں وہ اپنی آپ نظیر ہوتی ہے اور پھر اس میں ہر قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ تاکہ ہر شخص لطف اٹھائے اسی لئے وہ قبول عام کی سند رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں محفل سماع ہو یا بزم نشاط ہر جگہ گائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی طرح حضرت کیفی کا یہ مصرع تھا:۔ "نہیں ہیں حضرت کیفی تو کیا ثاقب ہے برتر ہے"

اس مشاعرہ میں انہوں نے ترسٹھ[٦٣] اشعار پڑھے۔ اس دوغزلے میں مشکل سے مشکل قوافی نہایت برجستگی اور صفائی سے باندھے گئے ہیں۔ کبوتر یا پیچر جیسے قافیے بھی اس خوبصورتی سے نظم کئے کہ گویا نگینے جڑ دئے ہیں۔

جہاں اُس کی اماں ہو لا کہہ دشمن ہو تو کیا پڑوا — وہاں جالے کو مکڑی اور انڈوں کو کبوتر ہے

اسی پر موقوف نہیں جس غزل کو دیکھیں بیس پچیس شعر سے کم نہ ملیں گے۔ انکا اور ایک سہ غزلہ ہے۔

ادا بیداد نظر سے شان رخ سے آن تیور سے — ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لئے ترسے

اس میں بھی قافیہ بندی کا وہی کمال موجود ہے اور سلاست وصفائی و روانی کا وہی عالم۔ چھپر کے قافیہ والا شعر ملاحظہ ہو

وہ چھپر پھاڑ کے دیتا ہے "سنتے ہیں" وہ کب دیگا — جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید چھپر سے

کلام کی خصوصیات ۔ زبان کی شستگی۔ خیالات کی ہمواری اور روانی کلام صفی کے وہ جوہر ہیں جو سرمایۂ زندگی ہیں

نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے پورے کلام میں بھی مشکلات نہیں دکھائی دیں گے۔ روزمرے اور محاورات کا استعمال اُن کی شاعری کی جان ہے۔ اگر مشکل اور اہم مضامین کا بھی ادا کرنا مقصود ہوتا ہے تو ایسے سلیس و صاف الفاظ سے کام لیتے ہیں کہ بات کی بات رہ جائے اور کام رکنے نہ پائے۔

اکثر شعرا کا کلام سمجھنے میں بعض جگہ ایسی دقتیں پیش آتی ہیں کہ جب تک چند چیزیں فرض نہ کر لی جائیں مطلب صاف نہیں ہوتا۔ لیکن صفؔی کا کلام اس سے بالکل پاک ہے۔ نہ الفاظ کے الٹ پھیر کی ضرورت ہے نہ کوئی چیز فرض کرنی پڑتی ہے۔ تعقید بھی صفؔی کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔ اُن کے شعر اس قدر برجستہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں کہ ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سلاست کا یہ عالم ہے کہ اگر شعر کی نثر کرنا چاہیں تو ممکن نہیں۔ شعر میں اس صفت کا پیدا ہو جانا نہایت مشکل امر ہے۔ اور جس شاعر کے یہاں یہ خوبی پیدا ہو جائے اس کا کلام سننے والوں کے دلوں میں محفوظ رہتا ہے۔ سعدی اور حافؔظ کے کلام کی یہی خصوصیت ہے جس نے انکو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اردو شعرا میں داغؔ اس حیثیت سے اول درجہ رکھتے ہیں۔ خوشگی اور سلاست ان کے یہاں پائی جاتی ہے بے نظیر ہے۔ صفؔی داغؔ کے رنگ میں ایک کامیاب شاعر ہیں ذیل کے اشعار سے ثابت ہو جائیگا کہ انہوں نے اس جوہر کو کس خوبصورتی کے ساتھ اوجاگر کر کے دکھایا ہے۔

مجھے احباب سے کیا کام بننے کا یقیں ہوتا
یہ بانونی ہیں ان کے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا

الٰہی مجھ کو دل دینے میں آخر مصلحت کیا تھی
اگر یہ چار انگل گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوتا

دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی
دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا
جفا آئی۔ غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا

صفؔی کی جان بچ جائے تو بس اسکے کوچے میں
وہاں سے زندہ آیا تو سمجھ لو کامیاب آیا

ہم اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں ساقی!
بھکاری بھیک میں ڈھونڈیں مزا کیا

وہ کونسا صدمہ ہے جو ہم پر نہیں ہوتا
لیکن نہیں ہوتا انہیں باور نہیں ہوتا

وہ تم نے کیا ہے جو عدو بھی نہیں کرتے
وہ ہم پہ ہوا ہے جو کسی پر نہیں ہوتا

آفتیں ڈھائیں غضب برپا کیا　　خیر تم نے جو کیا اچھا کیا

یہی آنکھیں یہی دل ہے تو بس اللہ حافظ ہے　　نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے　　غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

روزمرہ ومحاورہ بندی ۔ زبان کی صفائی، شستگی اور سلاست کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ کا برمحل استعمال شعر کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ صفی کے یہاں یہ چیز اس کثرت اور خوبی سے پائی جاتی ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت کم شاعروں کے یہاں ملے گی۔ اُن کی شاید ہی کوئی غزل اس خصوصیت سے خالی نظر آئے جہاں بھی انہوں نے محاورہ باندھا یا روزمرہ کا استعمال کیا ہے، نگینہ جڑ دیا ہے ۔　اب تمھاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام　　جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا

عاشق ہیں تو جیاں جئیں کیا　　مرنا ہے تو اگر مگر کیا

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس پڑے　　خدا کی قسم ہے مزا آ گیا　　سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو　　یہ دل ہے جدھر آ گیا آ گیا

حسن کو دیکھے کوئی کتنوں کی اسنے جان لی　　عشق سے پوچھے کوئی کتنے کلیجے کھا گیا

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے　　کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

گریۂ اشک سے یاں رخصت بینائی ہے　　اور وہ پوچھتے ہیں "آنکھ تری آئی ہے"؟

ملنے کو کھنچ کے ملتے عدو سے بھی ہم مگر　　اخلاق سے بعید مروت سے دور ہے

یہ تکیہ اور بستر ٹھاٹھ ہیں سب اہل دنیا کے　　جنہیں اُس پر ہے تکیہ ان کو تکیہ ہے نہ بستر ہے

حسن بیان ۔ مضمون اور خیالات عموماً وہی ہوتے ہیں جن کو ہر شاعر متواتر باندھتا چلا آتا ہے مگر شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ ہر مضمون کو ایک نئے انداز میں بیان کرے۔ کتنا ہی پامال مضمون اور کیسا ہی فرسودہ خیال ہو لیکن طرز ادا اور انداز بیان کا جامہ اسکے حسن کو کچھ اس طرح نکھار دیتا ہے کہ بالکل ایک نئی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعری نے اتنے پلٹے کھائے کہ اب نئے مضمون کا ملنا محال معلوم ہوتا ہے۔ تاہم استادانِ فن قابل تعریف ہیں کہ ان مشکلات کے باوجود کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا ہی کر لیتے ہیں۔ صفی کی طبیعت میں زبان کی سلاست کے ساتھ مضمون آفرینی کا جوہر بھی موجود ہے

ان کے شعر ہیں:- نشتر کے بدلے تیشے سے لی کوہکن کی فصد اللہ رے جنون جو سر پہ سوار تھا

جب سے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا　　زبان پر نہیں صورت پر اعتبار کیا
نہ دیکھے وہ تو اپنا گریہ کیجیے نہ پوچھے وہ تو اپنا مدعا کیا　　صفی جیسا اگر ہے شاعری جھوٹ تو پھر اس جھوٹ کی آخر سزا کیا
کسی کی حسرتوں کا خون جیتا ہے اے قاتل　　تو سرخی دوڑ جاتی ہے ترے رخسار پر کیا کیا
کیا ہی ہے شرم تیرے بھولے پن میں نثار　　منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لینے سے پیدا ہو گیا
وہ دور اور دور کی اپنی نظر خراب　　اے طالبان دید رہے عمر بھر خراب
ہر ایک کو نہ دیکھ محبت کی آنکھ سے　　بے اعتنائی کرتے ہیں اپنی نظر خراب
تیری مژگاں کے تصور نے جگایا رات بھر　　ہم تو سنتے تھے کہ کانٹوں پر بھی آجاتی ہے نیند
معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا　　لوگوں کو برا کام بھی کرنا نہیں آتا
دوستی عاشقی نہیں ہوتی　　عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

خیالات ۔ صفی کے کلام میں انکے ذاتی حالات و خیالات بھی جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ کہیں کہیں اخلاقی مضامین بھی جھلکتے ہیں اور بے نیازی اور استغنا جو اُن کے خاص جوہر ہیں ان کے اشعار میں خاص طور پر نظر آتے ہیں۔

دل خانۂ خدا ہے نگہداشت اس کی کر　　اچھا نہیں رہے گا ہوا یہ اگر خراب
بندوں پہ رحم چاہیے بندۂ خدا تجھے　　ہوتا ہے ایک آن میں ظالم کا گھر خراب
میں اس بندہ نواز و بندہ پرور کے تصدق ہوں　　جو بھولوں بھی تو یاد آتا ہے مصیبت میں
کیوں ناامید ہے دل امیدوار وصل　　کیا جانے آئے غیب سے نکل کیا ظہور میں
خدا سے دولت دنیا صفی میں کیا مانگوں　　نصیب ہوا جو اکام بے دعا نہ ہوا
اب یہ فغاں نہ آنکھ میں آنسو نہ دل میں درد　　ہم کیا کہیں زمانہ اگر قدرداں ہے اب
اپنے در سے وہ کیوں اٹھاتے ہیں　　اے صفی حرص تخت و تاج نہیں

دل خانۂ خدا ہے تو پھر اس میں اے صفیؔ ‏ حسرت نہ ہو، امید نہ ہو، مدعا نہ ہو

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہلِ دولت سے ملے ‏ پاؤ ٹکڑا، لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

نہ کسی سے کوئی مطلب نہ شناسائی ہے ‏ یعنے دنیا مجھے اک گوشۂ تنہائی ہے

سادگی ۔ یوں تو سارا کلام سادگی سے بھرا پڑا ہے لیکن بعض جگہ جب وہ خود سادگی پر زور دیتے ہیں تو سادگی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور شعر سہل ممتنع ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار اسکے شاہد عادل ہیں۔

یا مری سن لیجئے یا قتل ہی کر ڈالئے ‏ یا مجھے آرام ہو یا آپ کو آرام ہو

یہ مانا آسماں سو ظالموں کا ایک ظالم ہے ‏ مگر میں کیا کروں جب ہو عقیدہ آپ پر میرا

اسی کو تو دلاسا دے تسلی دے۔ تشفی دے ‏ عدو کا دل تو دل ہے؟ اور اے بیداد گر میرا!

اپنا دل بیمار دوا کا نہ دعا کا ‏ احسان کسی کا نہیں احسان خدا کا

ساری دنیا بھی مجھے دیوانہ اب کہنے لگی ‏ آپ کا لکھا نوشتہ بن گیا تقدیر کا

میں تو ہر صورت میں اسیرِ چاہِ دنیا ہوں صفیؔ ‏ وہ سمجھتے ہیں یہ عاشق ہی مری تصویر کا

روئیے اس کی بدنصیبی کو ‏ ڈھونڈھنے پر جسے خدا نہ ملا

چھپایا آپ نے خط کیوں۔ یہی نا؟ ‏ کوئی کاتب کوئی مکتوب ہوگا

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے ‏ شب کو اک آواز آتی ہے "الٰہی کیا کروں"؟

تشبیہ و استعارہ ۔ تشبیہ و استعارہ شاعری کی جان ہیں اور سچ بھی یہی ہے کہ جب تک شعر میں اسکی چاشنی نہ ہو اسکا مزہ دوبالا نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر شعرا اس خصوص میں بھدی اور ناقص تشبیہوں سے اور بعید عن القیاس استعاروں سے کام لیا کرتے ہیں۔ اس سے شعر دلفریب و دلکش ہونے کے بدلے معمہ و چیستاں بن جاتا ہے۔ حضرت صفیؔ کے شعر ہیں۔

تیرا خیال کیا ادھر آیا ادھر گیا ‏ جیسا ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار تھا

آپ نے بخشا دلِ سوزاں مجھے ‏ یا کسی کافر کو جہنم دیا ‏ عشق میں نشاش بہت کم رہے ‏ سُئے نے ہمیں کیف بہت کم دیا

ناروا ناحق یہ ٹڈی دل مرا سر کھا گیا — دل گیا میرا تو اس میں دوستوں کا کیا گیا
عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا — قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا
گویا ہیں یہ حسین بھی چینی کی مورتیں — ملتا نہیں ہے ان سے کسی بات کا جواب
داغوں نے گل کھلائے نگینے سے جڑ دئے — عاشق کا دل نہیں۔ یہ تمھارا مکاں ہے اب
اس طرح سنی عشق میں ناصح کی اک نہ بات — پرہیز کیا کرتے ہیں جس طرح دوا پر
کھلتے نہیں ہیں اب دلِ بے حس پہ بھی داغ — گویا کسی نے پھول رکھے ہیں مزار پر
میں ایسے بادشاہ کے در کا فقیر ہوں — ہے وہم دستِ غیب مری پشتِ خار پر
کیسی کیسی خواہشیں سینے میں ہیں — سینکڑوں بچھو مرے سینے میں ہیں

ان اشعار میں خیال کو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ دلِ سوزاں کو جہنم، عشق کو مٹی۔ ناصح دوستوں کو ٹڈی دل۔ وہم و سودا کو قطرہ و دریا، خاموش حسینوں کو چینی کی مورتیں، عاشق کے دل پر داغ کو معشوق کا مرصع مکان، عشق میں ناصح کی باتوں کو دوا کا پرہیز، دلِ بے حس کے داغوں کو کسی کے مزار کے پھول، پشتِ خار کو دستِ غیب، خواہشوں کو بچھو، تعبیر اتنا ایسی دشوار گزار منزل کو آسانی سے طے کرنا اور اپنی خاص طرز میں زبان و بیان کے لحاظ سے اثر و سادگی۔ اہلیت و جوش کو ہاتھ سے نہ جانے دینا حضرت صفی جیسے نازک خیال شاعر کا حصہ ہے۔

نظمیں صفی نے دو چار نظمیں اور دو ایک قصیدے بھی کہے ہیں ان میں سے تین نظمیں "اتحاد باہمی" کے متعلق ہیں اور ایک نظم ناصح اور کچھ فلسفیانہ انداز میں شاعری کی نسبت ہے۔ اتحاد باہمی کی پہلی نظم کا آغاز اس طرح کیا ہے۔

جتنے جی بھی ہوتے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب — کیا بتاؤں ان کی گنتی کیا کروں ان کا حساب
ایک ان میں قرض۔ وہ بھی قرض سودی کی بلا — جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اس کا گھر کا گھر خراب
جیسے پر، تنخواہ پر، جائداد پر قرضہ ملا — وہ بھی جس کی ذہن میں گنتی نہ تیرہ میں حساب
سو میں ستر یا نوے آئے تو بڑی دولت ملی — کم ہو گیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب

ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی　　　　دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب

یہ ساری نظم اس طرح زبان و بیان کی سادگی سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری نظم کو اس نئے انداز سے شروع کیا ہے :۔

قابلِ حیرت ہے اپنے دین و دولت کا زوال　　　　مل نہیں سکتی ہے دنیا میں کہیں جسکی مثال
دین کا جو حال ہے وہ واعظوں سے پوچھئے　　　　اور دولت کے لئے کیجے امیروں سے سوال
مشترک دونوں زبانوں پر فقط اک حرف ہے　　　　یعنی "لا" بس جو سمجھئے اب سمجھ کا ہے کمال

اس "لا" کو جو عربی اور اردو کا متحد اللفظ و مختلف المعنی حرف ہے کس خوبصورتی سے استعمال کرکے کمال شاعری دکھایا ہے اور جو کنایہ اس میں رکھا ہے اسکو ماہرانِ علم و ادب ہی جانتے ہیں۔ غالب کا "لا" ——— کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اور ایک عربی کا شعر :۔ رایتُ صبیٍ علی قصبیرٍ یخجل البدر والھلالَ　　فقلتُ ما اسمك فقال لولو فقلت لی لی فقال لالا

لیکن صفی کے شعر میں تفرید نہ تجنیس اشتیاق، صرف اختلاف لسانین سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اختیار دیدیا گیا ہے کہ .... جو سمجھئے اب سمجھ کا ہے کمال۔ اسکا ذکر آچکا ہے کہ جہاں جگہ پاتے ہیں محاورے کے باندھنے سے چوکتے نہیں چنانچہ یہاں یہ شعر بھی ان کی محاورہ بندی پر دال ہے۔

ساہوؤں کی ایسی خود غرضی کہ اللہ کی پناہ　　　　جس کو دیکھو کھینچتا ہے اپنی ہی روٹی پہ دال

اسی قرضہ سودی کے متعلق بقید قافیہ ایک نظم اور بھی لکھی ہے جو پہلی دو نظموں کی طرح چھپ چکی ہے اسکا نام "پندِ بے سود" رکھا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :۔　اگر ہو پند میں تاثیر مفقود　　تو ایسی پند ہوگی "پندِ بے سود"

ان ستر اشعار میں داؤد، ہود، نمرود سے لے کر ——— عود، مردود، امرود، بارود، عنبر و عود تک کے قافیے نظم ہیں۔ لیکن ایسے محدود و معدود قوافی میں بھی انکا مقصود کم زور نہیں ہوتے پایا چند شعر یہ ہیں۔

نہ عبرت اس حکایت سے ہی لیجا　　نہ لذت اس شکایت میں ہے موجود　　نہ یہ حالِ کلیم اللہ و فرعون　　نہ یہ ذکرِ خلیل اللہ و نمرود
نہ تعریفِ عصا و دستِ موسیٰ　　نہ توصیفِ ادائے لحنِ داؤد　　کہاں میں اور کہاں جلسے کہاں نظم　　کہاں میں اور کہاں قرضے کہاں سود
نہ یہ ہے داستانِ قیس و لیلیٰ　　نہ یہ وصفِ ایاز و مدحِ محمود　　لب و دنداں نہیں ہیں لعل و گوہر　　دل سوزاں نہیں ہے مجمرِ عود

اشارے میں لکھو کیا حرفِ مقصد — کنایہ میں کروں کیا شرحِ مقصود — نہ میری نظم میں گل ہے نہ بلبل — نہ اس میں کوئی شاہد ہے نہ مشہود
یہ ہے شمشیر لیکن زنگ خوردہ — یہ آئینہ ہے لیکن گرد آلود — یہ ایک بڑھے گرا ہے سننے والو — اگر اس انجمن سے کچھ ہے مقصود
نہ دیکھو کچھ صفی کی نظم دیکھو — ہوا کرتا ہے بیمار اس سے سود

رباعیات۔ صفی کی رباعیات بھی کوئی سو کے قریب قریب اور ہر قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اخلاقی ہوں یا مشاہدات و تجربات سے متعلق مزاح رہے یا نصیحت۔ شوخی ہو یا متانت ہر جگہ ان کا وہ خاص جوہر یعنی زبان کی سادگی محاورات کی بندش، بیان کی خوش اسلوبی موجود ہے۔ اور ہر رباعی کا چوتھا مصرع ائمہ فن کی تعریف کے مطابق اپنی متوز تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ انکی غزل کے اشعار کی طرح ان کی رباعیاں بھی فوراً ازبر اور دل نشین ہو جاتی ہیں چنانچہ۔

اچھوں کیلئے خراب ہونے والا — اک روز ہے کام آنے والا — بے کار نہیں خدمتِ اہلِ چمن — باقی اک دن گلاب ہونے والا

کچھ دن تو حسینوں میں وفا کو ڈھونڈا — کچھ روز تو دوست آشنا کو ڈھونڈا — بے ہودہ صفی نے عمر کھوئی اپنی — جب کچھ نہ ملا تو پھر خدا کو ڈھونڈا

اک دوست سے اک دوست نے پوچھا اے دوست — اچھا ہوتا ہے بھائی اپنا یا دوست — اس دوست نے (سوچ کر کہا) اے بھائی — بھائی بھی وہ اچھا ہے جو ہو اپنا دوست

ظاہر کو نہ دیکھ اور دیکھنا دانا سنبھل — اکثر یہ قیاس کرنہ اعلیٰ اسفل — حسنِ صورت پہ جان دینے والے — "سونا سونا ہے اور پیتل پیتل"

اللہ یہ زاہدوں کی باتیں کیا ہیں — معلوم نہیں سمجھا ہیں یا بے جا ہیں — با اہلِ نفاس ہے مگر موت کا ڈر — دنیا میں ہیں اور تارکِ دنیا ہیں

ہوتا نہیں دوست تو کسی کا دشمن — معلوم نہیں دوست ہے وہ یا دشمن — ہر دوست کا دوست دوست ہوتا ہے مگر — جو دوست ہے اُن کا وہ ہمارا دشمن

لوگوں سے ہر ایک ڈھب سے مل جل کے رہو — اتنک رہے تو اپنے مل جل کے رہو — دنیا میں اگرچہ نیک و بد ہیں سب صفی — رہنا ہے یہاں تو سب سے مل جل کے رہو

کہنے دو برا بروں کے منہ پر نہ چڑھو — اچھے ہو صفی اچھوں کی حد سے نہ بڑھو — توبہ کرو انسان کو اتنا غصہ — پاگل ہو؟ شیطان پہ لاحول پڑھو

سو بار ہوئی ہے عذر خواہی توبہ — میں اور خیال بے گناہی توبہ — عاصی۔ عاصی۔ میرے مالک! عاصی — توبہ۔ توبہ ہے یا الٰہی! توبہ

سنتے تھے جو لوگوں کی زبانی سچ ہے — ہر قصہ صحیح۔ ہر کہانی سچ ہے — ہم؟ اور یہ سوال؟ الٰہی توبہ! — "عشق میں ہزار بدگمانی سچ ہے"

اقرارِ محبت بھی اسی منہ سے کرے؟ — اظہارِ مصیبت بھی اسی منہ سے کرے — اس منہ سے صفی نے حسن کی قدر تو کی — پھر اسکی شکایت بھی اسی منہ سے کرے؟

یا ہجر میں جی کھول کے مجھ کو رونے دے — یا وصل سے دل شاد کبھی ہونے دے — او نیند کے ماتے! آرام کی چیز — تجھ اور نہیں تو مجھ کو ذرا سونے دے

آرام کی صورت تو نکل آئے گی | وہ آئیں گے یا میری اجل آئیگی
نیند اڑ گئی کچھ نیند کی چڑیا تو نہ تھی | جو آج نہیں آئی تو کل آئے گی

خاموشی میں زباں کی راحت ہے | عصیاں سے بچو تو جان کی راحت ہے
قلتِ اسباب کی ہے راحت دل کی | دل کی راحت جہاں کی راحت ہے

یا حال کا رنگِ زندگانی کہئے | یا دورِ گذشتہ کی کہانی کہئے
کیسی ہے صفیؔ آج یہ چپ سی تم کو | کہئے کچھ تو نئی پرانی کہئے

حضرت صفیؔ کی زندگی (عام ہو یا شاعرانہ) کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں بہتر تو یہی ہوگا کہ یا تو یہ اپنے حالات و واقعات خود لکھ ڈالیں یا ان کے خاص اور بے تکلف دوستوں کی ایک منتخب جماعت اس کام کو انجام دے۔

ہمارے نزدیک انکی عام زندگی کی مختلف شاخیں ہیں اور ہر ایک کا ایک خاص رنگ، ہر رنگ کے مختلف دوست اور یہی انکے قبول عام کی دلیل ہے۔ انکا مخالف بھی اسی وقت تک مخالف ہے جبتک کہ انسے ملاقات میسر نہ آئے اور جہاں ایک بار ان سے کوئی ملا انکا دوست ہوگیا۔ خوش گو ہیں مقرر نہیں باتیں ایسی مزے کی اور دلکش کرتے ہیں اور بیان ایسا سلجھا ہوا ہوتا ہے کہ سماعت پر بار نہیں گزرتا فنون لطیفہ میں بھی کچھ نہ کچھ دخل رکھتے ہیں گفتگو میں بعض وقت ایسا کنایہ کہہ جاتے ہیں کہ بس سمجھنے والا ہی سمجھے اور جو نہ سمجھے اسکو اپنی کمی ادراک سے خفیف ہونا پڑے۔ ہر معاملے میں مدافعت مدنظر رہتی ہے اگرچہ اکثر اوقات اس سے سخت نقصان پہنچے، لوگ بدخلق سمجھے مگر انہوں نے اپنی عادت کو نہیں بدلا، جو دل میں ہے وہی زبان پر! ذرا بھی خلاف طبع بات کی برداشت نہیں۔ حکیم ہیں مگر اس مرض کا علاج "زمانہ سازی" سے کرنا نہیں چاہتے عسرت میں عشرت کے مزے لوٹتے ہیں اور قناعت کو طرۂ امتیاز جانتے ہیں۔ انکی شاعرانہ زندگی دس گیارہ برس کی عمر سے شروع ہوتی ہے کسی نے کسی مشاعرے کیلئے مجبور کیا یا کبھی خود اپنے دل سے مجبور ہوئے تو طرحی غزل کہی اور مشاعرے میں بھی شریک ہوگئے یوں تو دل گھڑی بھر کیلئے بھی انکو بغیر شاعری چین نہیں لینے دیتا۔ انکی طبعی بے چینی اور ذوق سخن کے متعلق یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکے کلام ہی سے انکے دل کو ٹٹولا جائے۔ چنانچہ ذیل کی غزل ایسی مل گئی کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اس سے انکی شاعرانہ زندگی انہی کے الفاظ میں (ایک حد تک) ظاہر ہو جاتی ہے۔

نہ اسکی دوستی کچھ ہے نہ یاروں دشمنی کچھ ہے | کبھی تولہ کبھی ماشہ کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
تصدق کچھ لڑکپن ہے کچھ قسمت جوانی کا | یہ کیا شوخی پرانی کچھ ہے باقی ہی نئی کچھ ہے

مجھے دنیا سے کیا کام اور دنیا کا بھروسہ کیا | یہ دیکھا ہے میری دنیا تو ابھی کچھ تھا ابھی کچھ ہے
بڑی تعریف سنتے تھے نمائش گاہ عالم کی | یہاں تو کوئی چیز ایسی نہیں ہاں آدمی کچھ ہے

ادائیں ان کی الفت میں جفائیں ان کی دکھاتی ہیں | دو عملی میں بھٹکا ہوں سدا دو کچھ ہے دوستی کچھ ہے
نہ دل اپنا نہ جاں اپنی حسیناں کی نشانی ہیں | کہ اپنا کچھ نہیں ہے اور کہنے کو سبھی کچھ ہے

غضب ہیں تیرے دیوانے کوئی کیا انکو پہچانے　کسی کا مشغلہ کچھ ہے کسی کی دُگی کچھ ہے
کبھی ہم آپ اپنی رائے قائم کر نہیں سکتے　کہ خود کچھ ہے ادا کچھ ہے نظر کچھ ہے ہنسی کچھ ہے
صفیؔ ان دوستوں سے کیا کہوں ایسا جو کہتے ہیں　کہ تیری زندگی کچھ اور تیری شاعری کچھ ہے

کلام پر رائے ۔ کسی کے کلام پر اظہار رائے آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ آسان اسلئے ہے کہ جانبداری میں کوئی مشکل ہی پیش نہیں آتی اور مشکل اسلئے ہے کہ احتیاط و دیانت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لسان الغیب، بلبل شیراز، طوطی ہند، خلاق المعانی، رئیس المتغزلین، حسان الہند، خاقانی ہند، بلبل ہندوستان، لسان العصر، ترجمان حقیقت وغیرہم جیسے القاب اپنے اپنے زمانہ کی تنقیدی آراء کا خلاصہ و مسلم الثبوت کا وثیقہ ہیں۔ حضرت صفیؔ ایسے ظاہری اداء القاب سے طبعًا بیزار ہیں۔ رسالہ "تجلی" (مسجد چوک حیدرآباد دکن) میں ایک دفعہ انکو لسان الارض لکھا گیا تھا۔ انہوں نے ایڈیٹر رسالہ سے نہیں معلوم کیا منت و عاجزی کی کہ پھر یہ لقب نام کے ساتھ لکھا نہیں گیا۔ انکی طبیعت کی افتاد عجیب و غریب ہے۔ جانشین استاد کے الفاظ بھی انکے نزدیک رعونت میں داخل ہیں۔ سادہ لباس سادی زندگی نہ نمائش کے دلدادہ ہیں نہ شہرت کے طالب! باوجود اسکے ممالک محروسہ سرکار عالی کی حد تک (بلا قید مذہب مقام) انکی شاعری نے کافی اور خوب شہرت حاصل کرلی ہے وہ کہتے ہیں ؎

صفیؔ کو شاعری سے ملکی شہر لعزیزی بھی　ورود خ مسلمت آمیز بھی ہے کیا ہنر دیکھو!

بیرون ملک بھی مثلاً اجمیر شریف میں عرس کے موقعہ پر پیشہ ور گانے والے انکا کلام گایا کرتے ہیں۔ حضرت صفیؔ واقف فن اور پختہ مشق شاعر ہیں اور اپنے رنگ میں اپنا آپ جواب ہیں۔ غزل گو ہیں اور غزل کی خصوصیات یعنی زبان کی گھلاوٹ۔ بیان کی سادگی۔ ادا کی ندرت۔ بندش کی خوبی۔ واقعات کی دلکشی مثل اور محاورے کا برمحل استعمال انکے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اسکا جوش یہاں تک ہے کہ انکے نظم، قطعہ۔ رباعی، قصیدہ جیسے دشوار گزار اصناف سخن بھی اس دولت سے مالا مال ہیں۔ چنانچہ جدید اردو شاعری کے مولف (پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب) کی رائے انکی شاعری کے متعلق یہ ہے۔

"صفیؔ اورنگ آبادی رضی الدین حسن کیفی کے مشہور شاگرد ہیں۔ یہ صرف غزل کہتے ہیں۔ داغ کا رنگ گویا ان کے پاس پہنچ کر پہنچا ہے۔ اس سے بہت لطیف اور نازک تر ہوگیا ہے۔ بلند پروازی سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں اور روزمرہ کی بول چال میں ایسے نفیس شعر کہتے ہیں کہ شاید ہی کسی سے ہوسکے۔ انکا بیشتر کلام سہل ممتنع ہے۔" صفحہ ۲۹۱

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ریڈر و فیسر جامعہ عثمانیہ نے "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں انکی نسبت یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

"صفی اورنگ آبادی کے کلام کی ابھی پوری طرح اشاعت نہیں ہوئی لیکن اخبار و رسائل میں جو غزلیں چھپی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے استاد کیفی مرحوم کے حقیقی جانشین ہیں اور مخصوص رندمزاجی اور آزادہ روی کی وجہ سے انکی غزلوں میں استاد سے زیادہ بے ساختگی اور اصلیت نمایاں ہے۔ انکا ہر شعر دل سے نکلتا ہے اور دل تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اسقدر خاموش اور تنہائی پسند ہیں کہ سوائے سخت اصرار کے کسی مشاعرے میں بھی نہیں جاتے اور نہ کوئی ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے متعدد اہل ذوق ان کی شاگردی کے مشتاق ہیں وہ اکثر اس سے گریز کرتے ہیں۔ اسکے باوجود ان کے متعدد شاگرد ہیں۔ ص ۲۹

اردو ادب کے ان دو نقادوں کی آراء کے بعد صفی کی شاعری مزید تعارف کی محتاج نہیں رہی۔ مضمون آفرینی کے شوق میں لطفِ تاثر کو کھو دینا۔ طرزِ بیان میں پیچیدگی پیدا کرنا۔ عربی فارسی کی نئی نئی ترکیبیں۔ اضافات کا تواتر۔ صاف بات کو سیدھے طریقے سے ادا نہ کرنا شعرائے طرزِ جدید کا وتیرہ ہے اگرچہ صفی عصرِ حاضر کے شاعر ہیں لیکن بھاری بھرکم الفاظ سے رعب جمانا یا دھوکہ دینا یا خود دھوکے میں رہنا نہیں جانتے انکی طبیعت مضامین کے حد تک جدت پسند اور اسلوب بیان کے حد تک قدامت پسند واقع ہوئی ہے اور یہی تغزل کا اصلی معیار بھی ہے ذیل میں انکی مختلف غزلوں سے چند شعر مثالاً نقل کئے جاتے ہیں۔

خیال بھی دلِ بیمار کا ذرا نہ ہوا — خوش آمدید کہاں تھے بہت زمانہ ہوا
ہم انکے سامنے مجبور ہو کے رو دیئے — اگر زبان سے اک حرف بھی ادا نہ ہوا

ہر طرح اپنے دل پہ جسے اختیار تھا — وہ بھی تو میں ہی تھا مرے پروردگار
دشمن کو انکے ساتھ ہی لیکن جگہ تو دی — اب کیا خدائی کرنے کا امیدوار تھا

ہونے ہیں جا ہنسنے کی ادائیں بھی جا بجا — ہیں اب یہ صدقے مجھ پہ زمانہ نثار تھا
وہ آئے اور ہو گئی تسکین اے صفی — اتنی سی بات کیلئے دل بیقرار تھا

دل جو دیا دل کے لئے غم دیا — زخم دیا زخم کا مرہم دیا
جانتے ہیں وہ کہ میں آزاد ہوں — پھر مجھے جو کچھ بھی دیا کم دیا
اب وہی پونچھے مرے آنسو تو خیر — جس نے مجھے دیدۂ پرنم دیا
شکر ہے دل اسنے دیا اے صفی — اور نہایت خوش و خرم دیا

اگر ہے ابتدائے عشق "مرنا"؟ — تو پھر اس ابتدا کی انتہا کیا
جہاں ہو سرفروشی خود فروشی — وہاں ہم کیا ہماری التجا کیا

مرا معشوق ہو یا انکا عاشق تو ستائے بھی — مجھے آتا ہی غصہ چرخِ ناہنجار پر کیا کیا
ہوس کو عشق سمجھا ہے مجھے افسوس ہوتا ہے — تری کٹ حجتی پر بحث پہ تکرار پر کیا کیا
تجھے یہ صاف گوئی اے صفی بدنام کر دیگی — لگائی جائیں گی رائیں ترے اشعار پر کیا کیا

یہ ہے مری آہ میں اثر کیا — سب دیکھتے ہیں ادھر ادھر کیا
سمجھاؤ نہ مجھ کو ہم نشینو! — اے بے خبرو تمہیں خبر کیا

جو کچھ گزری کہیں گے سب سے　جب منہ میں زباں ہے تو ذکر کیا　رہتا نہیں ایک سا زمانہ　اب بھی ملتے ہیں وہ مگر کیا

پھر دل نکلا کہ گھر سے نکلے　ہم سوچ رہے تھے رات بھر کیا　کیوں یاد رہیں صفی کے اشعار　مفلس کے کلام میں اثر کیا

منظور آپ کو جو مرا امتحان ہے آپ　آنکھوں میں پیار دل میں محبت کہاں ہے آپ　رونے میں کچھ اثر ہے نہ ہنسنے میں کچھ مزا　غم ناگہاں ہے اب نہ خوشی ناگہاں ہے آپ

سو بار ترک عشق پہ وعدہ خلاف ہوں　گویا مری زبان تمھاری زبان ہے آپ

تل بھر جگہ نہیں ہے دل داغ دار پر　حیران ہوں ترے کرم بے شمار پر　صیاد بھی تو خوش نہیں کچھ بد نصیب سے　لٹتے ہزار عیب ہیں جتنے ہزار پر

پروانہ کیا جلے گا محبت کی آگ میں　اک جانور غریب ملا اسکی چار پر　مر کر بھی بار دوش نہ ہو خدا گواہ صفی　گویا میں ایک لاش ہوں بیچاری ہزار پر

خیر ہے! کیا یہی پوشاک ہے معشوق کی　آپ تو ایسے نہ بیٹھے تھے کبھی یا بیچاں　فتنے اٹھیں گے نہ اٹھو لیے اللہ بچیں　ہوں تو در پر ہی مگر آپکا پردا کیا

میں اس بندہ نواز و بندہ پرور کے تصدق ہوں　تو بھولو عیش میں یاد آتا ہے مصیبت میں　کبھی اس نجمن آرا کو بھلا کر دیکھ لے کوئی　تو پھر کھل جائے وحدت یوں ہو اکرتی ہے کثرت میں

صفی دنیا میں جینے کا مزا ہم نے نہیں پایا　کہ اپنی عمر کچھ غفلت میں گزری کچھ ندامت میں

ہم سے تو اسکے واسطے بھی بددعا نہ ہو　دشمن برا سہی مگر اسکا برا نہ ہو　دنیا بشر کے واسطے جنت سے کم نہیں　یہ لے سمجھ کسی پہ اگر مبتلا نہ ہو

دل خانۂ خدا ہے تو پھر اس میں اے صفی　حسرت نہ ہو امید نہ ہو مدعا نہ ہو

نہ پابندی سلیقے کی نہ آزادی قرینے کی　ضرورت کچھ نہیں معلوم ہوتی آئینے کی　یہی آنکھیں یہی ابرو یہی زلفیں بس اللہ حافظ ہے　نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

جسے خالق نے دی ہے آنکھ برہم کر کو دیکھے　یہاں کی رتی رتی ہے سلیقے کی قرینے کی　ہوا ہو جب ہے مفلس بیچ انسو پیتا ہو　گزر کیا ہے صفی عادت بری ہوتی ہے پینے کی

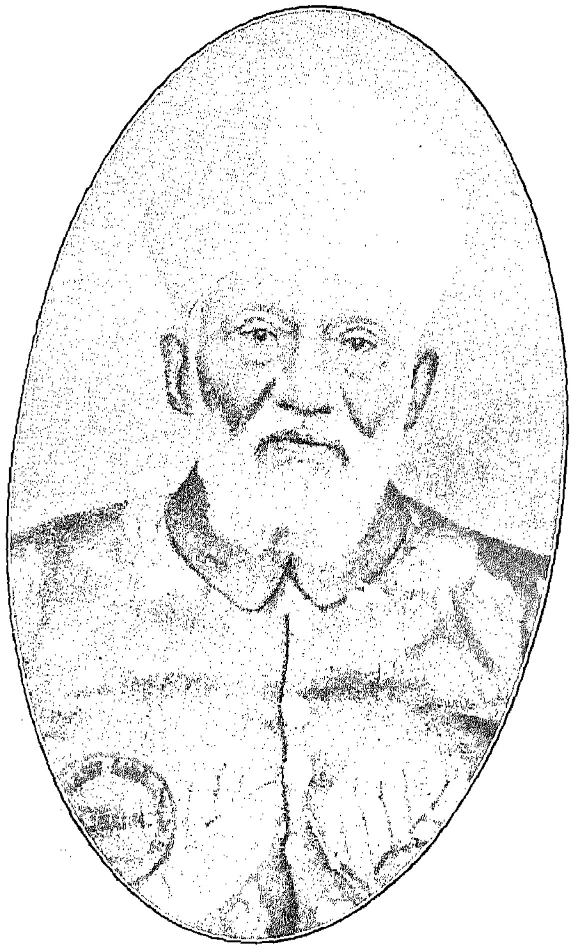
جب وہ گرم عتاب ہوتا ہے　چہرہ اور آفتاب ہوتا ہے　دیکھئے دوستوں کی بے حسی　جب مجھے اضطراب ہوتا ہے

حسینوں سے دو عملی میں ہماری زندگانی ہے　زباں پر شکر دل میں شکوہ نا قدردانی ہے

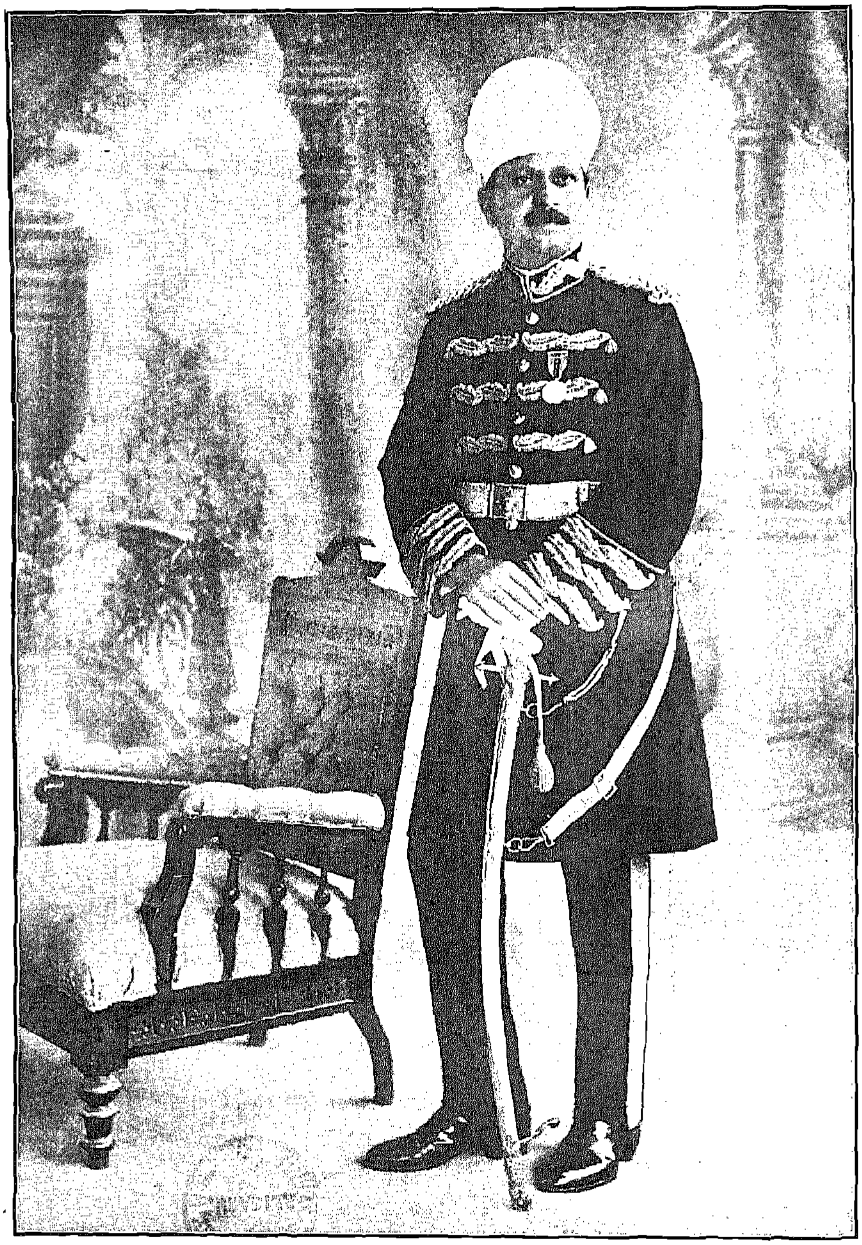
مجھے مٹی کا پتلا لوگ کچھ یوں ہی نہیں کہتے　بہت دن تک ترے کوچہ کی آخر خاک چھانی ہے

بڑی چیز آنکھ ہے انسان پہلے آنکھ پہچانے　نظر کا تاڑ جانا بھی تو آدھی غیب دانی ہے

صفی بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا　اسے لوگوں سے جینے جی امید قدردانی ہے



نواب حسام الملک خانخانان نظام یار جنگ آصفی



NAWAB MOHAMMAD MOIN-UD-DIN KHAN, EYANATH JUNG,
MOIN-UD-DOWLA BAHADUR.



بہادر علی صفی



نواب شہید یار جنگ شہید



سید محمد حسین آزاد



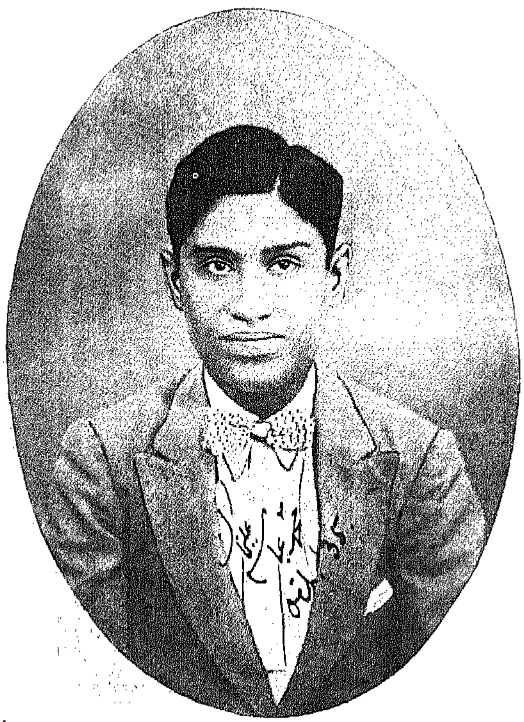
غلام مصطفیٰ ذہین



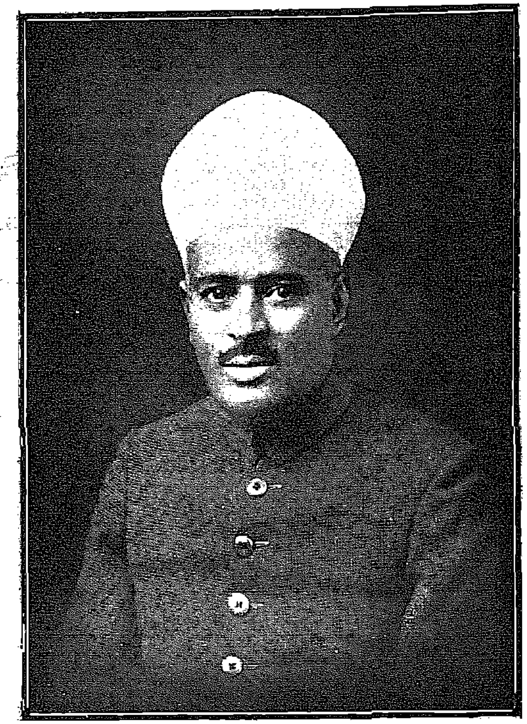
محمد حسین فاضل



ضمیر حسین سدره



ڈاکٹر محمد عباس علیخان لمعہ



محمد عبدالرزاق صاحب راشد



قاضی زین العابدین صاحب عابد



سید نصیرالدین اصغر



راگھویندر راؤ جذب

اشاریہ

اس کی ترتیب میں عزیزی محمد اکبرالدین صاحب صدیقی (سابق مدیر مجلہ الموسی) نے سلسلہ کی قابل قدر مدد کی ہے۔

مدیر عمومی

اشاریہ

الف ممدودہ

الف مقصورہ

ب

پ

ت

(ن)

مرقع سخن

عہد آصفیہ کی اُردو شاعری جاتی کو اُن کی خصوصیات اور زبان و خیال کے رجحانات کے اعتبار سے پانچ جداگانہ ادوار میں تقسیم ہوتی ہے۔ پانچ ادوار کو ملحوظ رکھ کر اس مرقع کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں ہر دور ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے جس میں اس زمانے کے تمام شاعری کی خصوصیات اور مشہور شاعروں کی تاریخ وار فہرست درج ہے۔ حیدرآبادی شعراء کے علاوہ ان شعراء کے نام بھی لکھے گئے ہیں جو اس عہد میں باہر سے حیدرآباد آئے تھے۔ ہر دور کے آخر میں شمالی ہند کے اُن مشہور اساتذہ سخن کی فہرستیں بھی شامل کی گئی ہیں جو اس دور کے شعرائے حیدرآباد کے



ہمعصر تھے۔ اس طرح سے اس مرقع کے مطالعہ کرنے والوں کو اُردو کے ان تمام شاعروں کے متعلق تاریخ وار علم حاصل ہوگا جنہوں نے گذشتہ سو ادو سالوں میں اپنی مسلسل خدمات اور گراں بہا کارناموں کی وجہ سے زبان اردو کو دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پایہ بنا دیا۔